سہ ماہی ذہن جدید

ذہن جدید



سعادت حسن منٹو

پیدائش ۰ ۱۱ر مئی ۱۹۱۲ء —— وفات ۰ ۱۸ر جنوری ۱۹۵۵ء

یہ بھی ہوسکتا ہے کہ سعادت حسن مرجائے اور منٹو نہ مرے

اس سہ ماہی کے دلچسپ کارٹون



بہ شکریہ ٹائمز آف انڈیا



یوم خواتین

بہ شکریہ ہندو

مخدوم محی الدین اور سلیمان اریب کی یاد میں

بڑی زبان کا زندہ رسالہ

ادب ۰ آرٹس ۰ کلچر کا ترجمان

سہ ماہی

ذہنِ جدید

مدیر جمشید جہاں

ترتیب زبیر رضوی

ZEHNE JADID
Urdu Quarterly

Mar–May 1992

POST BOX No. 7042
NEW DELHI-110 002
Price Rs. 20/-

جلد • ۲
شمارہ • ۷
ساتویں سہ ماہی
مارچ تا مئی ۱۹۹۲

قیمت •
فی پرچہ بیس روپے
لائبریری ایڈیشن • پچاس روپے
سالانہ • سو روپے
(بشمول ڈاک خرچ وغیرہ)
لائبریریوں سے • دو سو روپے
بیرونی ممالک سے
فی پرچہ تین ڈالر
سالانہ بارہ ڈالر
پاکستان میں • تیس روپے
خوشنویس اعجاز احمد

تقسیم کار •
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دلی ۲۵،
شاخیں •
• مکتبہ جامعہ، اردو بازار جامع مسجد دلی ۶،
• مکتبہ جامعہ، پرنس بلڈنگ بمبئی ۲،
• مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونیورسٹی مارکٹ علی گڑھ ۲،

پتہ:
ذہن جدید پوسٹ بکس ۷۰۴۲
نئی دلی ۱۱۰۰۰۲

جمشید جہاں۔ ایڈیٹر پبلشر نے جے کے آفسٹ پریس۔ ۳۱۵ گلی گڑھیا۔ مٹیا محل دلی میں چھپوا کر شائع کیا۔

فہرست

الف

یہ شمارہ منٹو کے نام ہے

اردو فکشن پر تنقید کی بحث چھیڑتے ہوئے ہم فکشن کے نقادوں کے ردِ عمل سے زیادہ خود فکشن لکھنے والوں کے تاثر اور ردِ عمل جاننے کے خواہشمند تھے کیونکہ ہمارے سامنے یہ بات بڑی واضح تھی کہ کبھی کوئی ادیب، تنقید اور اس کے تقاضوں اور اس کے مروجہ رویّوں سے اپنی تحریر کو ہم آہنگ رکھنے کی خاطر نہیں لکھتا۔ اس کے برخلاف لکھنے والا اپنی تخلیق کے ذریعے حال یا مستقبل کے نقاد کو معیار اور اعتبار کی بنیاد اور پیمانے فراہم کرتا ہے۔ منٹو، بیدی، عصمت، قرۃ العین حیدر کا لکھا ہوا فکشن اپنے عہد کے مروجہ تنقیدی رویّوں سے بے نیاز ہو کے لکھا گیا فکشن ہے۔ ان لکھنے والوں نے اپنے پورے تخلیقی SPAN میں نقاد کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ اُس سے دَبے لفظوں میں بھی یہ شکایت نہیں کی کہ وہ ان کے لکھے ہوئے کو اپنی میزانِ نقد میں تولے اور آنکے۔ اس سب کو اگر کوئی نام دیا جا سکتا ہے تو وہ ہے اپنی تخلیقی URGE سے دیوانگی کی حد تک کمٹ منٹ اور اپنے لکھے ہوئے پر اعتماد، نتیجہ ہمارے سامنے ہے ان کا لکھا ہوا ایک ایک لفظ ادب کا حصہ بننے کے عمل سے گذر رہا ہے۔

جو لوگ تخلیقی سرگرمی کو کارِ جنوں کے طور پر نہیں اپنا تے۔ جو اپنے ہی تجربے، احساس اور مشاہدے کی سانسوں میں نہیں جیتے وہ بہت جلد مر جاتے ہیں لیکن یہ جانتے ہوئے بھی وہ مردہ ہو چکے ہیں وہ قلم ہاتھ سے نہیں رکھتے اور ادب کو۔ خود کو قاری کو اِس فریب میں رکھنے کے جتن کرتے رہتے ہیں کہ وہ بھی دوڑ میں ہیں THEY ARE IN THE RACE

ہمارے شعری حصے کو پڑھکر قارئین کو ایک طرح کی ناآسودگی کا احساس ہو رہا ہے ان کے خیال میں اردو کے موجودہ ادبی منظر نامے میں شاعری کے رنگ، بیانیہ کے مقابلے میں پھیکے پڑتے جا رہے ہیں۔ تو کیا یہ افسانے کا دور ہے؟ یہ احساس ہمیں بھی ہو رہا ہے۔ اس بار ہمیشہ کی طرح افسانوں کا حصہ پڑھنے والوں کو خود سے بے حد قریب لانے والا ہے۔ ایک اور بات اِن افسانوں میں لاٹھی اور گولی سے زخمی ہونے والے بے خطا انسان کی آہ زیادہ سنائی دیتی ہے۔

کمار گندھرو کی موت نہ جانے کب تک ہندوستانی سنگیت کو سوگوار رکھے گی ان کے بارے میں ایک گفتگو شریکِ اشاعت ہے

راہی معصوم رضا کی جدائی ہم سب کے لئے رنج کا باعث ہے اِس وقت اُن کی تخلیقی صلاحیتیں پورے عروج پر تھیں۔ وہ بلاشبہ فلم کے ایسے مکالمہ نگار تھے جس نے اس میڈیم کو بے حد قریب سے جانا تھا۔ ذہن جدید ۳ میں راہی نے فلم میں مکالمہ نگاری پر سیر حاصل گفتگو کی تھی۔



• یہ کس نے میرا شہر سپاہیوں کو دیدیا •

ذہن جدید

منٹو کے کرداروں کے نام

محمد علوی

کُتّے نے آنکھیں کھولیں
لمبی زبان سے
سارے بدن کو پیار کیا
اِک اِک زخم شمار کیا
کان مروڑے
دُم پھٹکاری
کروٹ بدلی
اِک بے حال سی عورت کو
پہلو میں سوتے دیکھا
اِدھر اُدھر سے سونگھا
پھر سونگھا
پھر ٹانگ اُٹھائی اور موتا
پھر گھاٹ سے کودا
اور کھولی سے بھاگ گیا!

زبیر رضوی

وہ کون ہے
جو بدن کی منڈی میں میری بولی لگا رہا ہے
مَیں پھول، بادل، ہوا، ندی تھی
یہ کس نے
میری اُڑان کے پر کتر دیئے ہیں
یہ کس نے
بارش کے اُجلے پانی کو
گندی مٹی میں گوندھ ڈالا
یہ کس نے
سارے عذاب میرے ہی نام لکھے
گناہ کے صبح و شام لکھے
وہ کون ہے
جو بدن کی منڈی میں میری بولی لگا رہا ہے
وہ تم ہو شاید
وہ تم ہو شاید!!

ٹوبہ ٹیک سنگھ

وارث علوی

سعادت حسن منٹو کا افسانہ "ٹوبہ ٹیک سنگھ" چھپتے ہی مشہور ہوگیا۔ ممتاز شیریں اسے منٹو کی بہترین تحریروں میں شمار کرتی ہیں۔ جب بھی اور جہاں بھی ٹوبہ ٹیک سنگھ کا ذکر ہوتا ہے تعریف کے ساتھ ہوتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ گنے چنے تعریفی کلمات کے علاوہ ٹوبہ ٹیک سنگھ پر ایک پیراگراف نظر سے ایسا نہیں گزرا جو افسانہ کے متعلق ناقدانہ بصیرت کا حامل ہوتا۔ ممکن ہے نقادوں کو یہ گمان ہو کہ افسانہ کی رِس اور معنویت واضح ہے اور اس پر عبارت آرائی کی ضرورت نہیں۔ لیکن فی الحقیقت ایسا نہیں ہے۔ افسانہ کافی تہہ دار اور پیچیدہ ہے اور اس پر ناقدانہ گفتگو کی ضرورت ہے۔

تقسیم اور اُس کے ساتھ ظہور پذیر ہونے والے خوں ریز فسادات پر ہمارے یہاں وافر ادب تخلیق ہوا۔ ایک ہی موضوع پر جب بہت سے لوگ لکھنے لگتے ہیں تو فطری طور پر چند سکہ بند رویئے سامنے آتے ہیں جن سے کہانی کا ایک عمومی ڈھانچہ تیار ہو جاتا ہے جو فن کی ادنیٰ سطح پر فارمولا کہانیوں کو جنم دیتا ہے۔ منٹو کا امتیازی وصف یہ رہا ہے کہ وہ خود کو دہراتا نہیں۔ اس کے تخیل کی نادرہ کاری اظہار کے نئے پیرایوں کی تلاش میں رہتی ہے۔ موضوع چاہے طوائف ہو، جنس ہو یا فسادات اس کی پیش کش میں تکنیک، تجربہ اور معنویت کی رنگارنگی ہوتی ہے۔ کسی ایک کہانی میں بھی تکنیکی جذباتی یا نفسیاتی تجربہ دوسرے کے مماثل نہیں ہوتا۔ اسی لئے منٹو کی ہر کہانی تازگی، ندرت، ایجاد اور اجتہاد کا احساس دلاتی ہے۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ بھی ایسی ہی کہانی ہے۔

تقسیم ملک کے وقت تاریخ کی خونریزی دیکھ کر بطور ایک انسان کے منٹو ہڑبڑا اٹھتا ہے لیکن بطور فنکار کے اس کا ذہن شانت سبھاؤ سے سوچتا رہتا ہے کہ ان واقعات پر لکھنے کا وہ کون سا طرز اختیار کرے جس سے ایک طرف تو فن کی تکمیل ہو اور دوسری طرف موضوع پر ایک نئے زاویئے سے روشنی پڑے تاکہ ان اَلم ناک واقعات میں پنہاں چند معنی خیز انسانی تجربات اور ان کی نفسیاتی گہرائیاں منکشف ہوں۔ گمان گزرتا ہے کہ منٹو کو خیال آیا ہوگا کہ تقسیم کے ساتھ جب سیانے لوگوں کی بستیاں ہجرت کر گئیں تو کیوں نہ نقلِ مکانی کے اس تجربہ کو ایک پاگل کے ذریعہ بیان کیا جائے۔ ممکن ہے ایک پاگل کے مطالعہ کے ذریعہ انسانی فطرت کے کچھ ایسے رموز منکشف ہوں، انسان اور زمین کے رشتہ کے کچھ ایسے ڈائمنشن سامنے آئیں جو نارمل لوگوں کے مطالعہ کے ذریعہ ظاہر نہیں ہوتے۔ منٹو کا جو تخلیقی رَوّیہ بظاہر نرالا، سنسنی خیز اور چونکا دینے والا نظر آتا ہے اس کے پیچھے کچھ ایسے ہی فکری اور نفسیاتی مقاصد کارفرما ہوتے ہیں۔ بہرحال کچھ ایسے ہی جذبہ کے تحت ٹوبہ ٹیک سنگھ وجود میں آیا جس کی کہانی کا آغاز اس طرح ہوتا ہے کہ ملک کے تقسیم کے بعد جہاں بے شمار دوسری چیزوں کا بٹوارا کیا جاتا ہے وہاں یہ بھی فیصلہ ہوتا ہے کہ پاگل خانہ کے پاگلوں کا بٹوارا بھی ہو۔ یعنی ہندو پاگلوں کو ہندوستان بھیجا جائے اور مسلمان پاگلوں کو پاکستان۔

تاریخی اتھل پتھل کے زمانے میں آدمی آدمی نہیں رہتا ایک بے ہیجان، ایک اشتعال، ایک اضطراب بن جاتا ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ بے جان چیزوں کی جس طرح ہیرا پھیری کی جاسکتی ہے اسی طرح انسانوں کو بھی ایک

جگہ سے دوسری جگہ اور ایک ملک سے دوسرے ملک آسانی سے منتقل کیا جاسکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تقسیم کے نتیجہ میں دونوں مملکتوں کے عوام کی روح پر کیا جبر کئے گئے۔ ذہنی سکون کیسے تباہ ہوا اور ایک زمین سے اکھڑے ہوئے پودوں نے دوسری زمین میں اپنی جڑیں پیدا کرنے کے لئے کیا کھویا اور کیا پایا اس کا حساب تو تاریخ نے رکھا ہی نہیں کیونکہ تاریخ زندگی کی رائیگانی کا حساب نہیں رکھتی ان فضولیات کا حساب رکھنے کے لئے انسان کے پاس شعر و ادب ہے جو اس کا شوقِ فضول ہے۔ ادب حیاتِ رائیگاں کا قصۂ رائگاں اس وقت تک سناتا رہتا ہے جب تک شوق فضول رہتا ہے اور تاریخ بن کر تاریخی کام نہیں کرتا۔ تاریخ کے صفحات پر ہجرت کرتے ہوئے قافلوں کی پرچھائیوں کا عکس ہوتا ہے۔ ادب کا سروکار پرچھائیں سے نہیں زندہ انسان سے ہوتا ہے۔ ادب ایک فرد کی بپتا نہیں پوری تاریخ کا کرب سمو دیتا ہے۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ میں منٹو ایک پاگل سکھ کے کردار کے ذریعہ یہ دیکھنا اور دکھانا چاہتا ہے کہ وہ آدمی جو خارجی دنیا سے اپنا رابطہ گنوا بیٹھا ہے اس پر انسانوں اور علاقوں کی ہیرا پھیری کا کیا اثر پڑتا ہے۔ تاریخ کا کرب ہی نہیں بلکہ تاریخ کا المیہ اور طربیہ دونوں اس کردار میں مجسم ہوگئے ہیں۔

وجہ یہ ہے کہ ملک کے تقسیم ہوتے ہی بشن سنگھ جس پاگل خانہ میں تھا اس کے باہر بھی ایک بڑا پاگل خانہ کھل گیا تھا۔ اس پاگل خانہ کی تعمیر ملک کے ہوش مند سیاست دانوں کے ہاتھوں ہوتی تھی۔ رات کی رات جغرافیہ بدل گیا۔ روابط اور وابستگیاں بدل گئیں۔ اور لوگ بہ تمام ہوش مندی ایک ملک سے دوسرے ملک ہجرت کرنے لگے۔ یہ ایک اجتماعی پاگل پن تھا جس کی مضحکہ خیز صورتیں ابھی سامنے آنے بھی نہ پائی تھیں کہ جڑوں سے اکھڑنے کے کرب پر ہولناک فساد ان کی تاریکیاں چھانے لگیں جب انسانوں کے جنگل کے جنگل کاٹ دیئے جائیں تو بے جڑی کا نوحہ بھی بے وقت کی راگنی معلوم ہوتا ہے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ اس دور میں منٹو نے جو کہانیاں لکھیں ان میں حماقت، المیہ طربیہ اور ہولناکی کا ایسا ملغوبہ ہے کہ آدمی ہنستا بھی ہے روتا بھی ہے اور خوفزدہ بھی ہوتا ہے "ٹوبہ ٹیک سنگھ" بھی ایسی ہی کہانی ہے۔ اس میں حماقت ہے، پاگل پن ہے، طربیہ ہے، المیہ ہے اور ہولناکی ہے نہ تو افسانہ کے اندر رہے ہوئے کردار ان حالات کو سمجھ پاتے ہیں جن کا انھیں سامنا ہے نہ افسانہ کا قاری افسانہ میں بیان کردہ واقعات کی طرف کوئی ذہنی رویہ متعین کر پاتا ہے۔ پاگلوں کے لطیفوں پر وہ ہنستا ہے اور بشن سنگھ کی ہیئت کذائی دیکھ کر وہ ڈرتا بھی ہے اور اس کی باتوں پر وہ ہنستا بھی ہے اور اس کی حالت پر اسے ترس بھی آتا ہے۔ اس کی بیٹی کو روتے دیکھ کر اس کی بھی آنکھیں بھیگ جاتی ہیں لیکن اس سے قبل کہ آنسو پلک تک آئیں وہ پاگل پن کی حرکات پر مسکرانے لگتا ہے۔ اور افسانہ کے اخیر میں قاری ایسے شاک میں چلا جاتا ہے جو جنگل میں ایک بڑے درخت کے کٹنے کا تماشا کرتے وقت درخت کے اس پر گرنے اور اس کے بال بال بچ جانے کا نتیجہ ہوتا ہے۔ افسانہ کے اخیر میں جب بشن سنگھ ایک فلک شگاف چیخ مار کر گرتا ہے تو یہی تاثر چھوڑتا ہے لوگ منٹو کی سنسنی خیزی کو یاد رکھتے ہیں لیکن متوازی بہتے ہوئے مختلف جذباتی دھاروں کو بھول جاتے ہیں۔

لاہور کے پاگل خانہ میں بشن سنگھ کے ساتھ دوسرے بھی بہت سے پاگل ہیں۔ ان کے بیان میں لطیفوں اور چٹکلوں کا لطف ہے۔ بادی النظر میں تو یہی لگتا ہے کہ منٹو کے ہاتھ پاگل لگے اور وہ پاگلوں کے لطیفے بیان کرنے کی ترغیب سے بچ جانے۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔

ایک نمونہ ملاحظہ فرمائیں

ایک مسلمان پاگل جو بارہ برس سے ہر روز باقاعدگی کے ساتھ "زمیندار" پڑھتا تھا اس سے جب اس کے ایک دوست نے پوچھا "مولبی ساب! یہ پاکستان کیا ہوتا ہے" تو اس نے بڑے غور و فکر کے بعد جواب دیا" ہندوستان میں ایک ایسی جگہ ہے جہاں استرے بنتے ہیں"۔

ایک اور نمونہ دیکھئے۔ ایک دن نہاتے نہاتے ایک مسلمان پاگل نے "پاکستان زندہ باد" کا نعرہ اس زور سے بلند کیا کہ فرش پر پھسل کر گرا اور بے ہوش ہو گیا۔

یہ واقعات اور یہ پاگل پن کی باتیں ان واقعات سے بہت مختلف نہیں ہیں جو منٹو کے "دیکھ کبیرا رویا" اور "باتیں" قسم کے اس زمانے کے بہت سے مضامین میں بکھرے پڑے ہیں۔ ان مضامین میں معاشرتی زندگی کی جو جھلکیاں سامنے آتی ہیں ان میں اور پاگل خانے کی باتوں میں بہت زیادہ فرق نہیں ہے۔ اسی لئے لاہور کا یہ پاگل خانہ باہر کی دنیا کے پاگل خانے کی علامت نہیں ہے بلکہ اسی کا ایک روپ ہے۔ فرق کیفیت کا نہیں کمیت کا ہے باہر بھی لوگ سڑکوں پر، بازاروں میں گھروں میں دکانوں میں ایسی ہی حرکتیں کرتے ہیں جیسی کہ پاگل خانے میں۔

اب "دیکھ کبیرا رویا" میں سے باہر کے پاگل خانے سے دو نمونے ملاحظہ فرمائیے۔

"ایک اونچی عمارت پر لکشمی کا بہت خوبصورت بُت نصب تھا چند لوگوں نے جب اسے اپنا دفتر بنایا تو اس بت کو ٹاٹ کے ٹکڑوں سے ڈھانپ دیا۔ کبیر نے دیکھا تو اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ دفتر کے آدمیوں نے اسے ڈھارس دی اور کہا ہمارے مذہب میں یہ بت جائز نہیں"۔

کبیر نے ٹاٹ کے ٹکڑوں کی طرف اپنی نمناک آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "خوبصورت چیز کو بدصورت بنا دینا بھی کسی مذہب میں جائز نہیں"

دفتر کے آدمی ہنسنے لگے کبیر دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

دوسرا نمونہ دیکھئے

"صف آرا فوجوں کے سامنے جرنیل نے تقریر کرتے ہوئے کہا: "اناج کم ہے کوئی پروا نہیں۔ فصلیں تباہ ہو گئی ہیں کوئی فکر نہیں۔ ہمارے سپاہی دشمن سے بھوکے ہی لڑیں گے۔

دو لاکھ فوجیوں نے زندہ باد کے نعرے لگانے شروع کر دیئے، کبیر چلا چلا کے رونے لگا۔ جرنیل کو بہت غصہ آیا۔ چنانچہ وہ پکار اٹھا۔ اے شخص بتا سکتا ہے تو کیوں روتا ہے۔ کبیر نے رونی آواز میں کہا۔ اے میرے بہادر جرنیل۔ بھوک سے کون لڑے گا۔

دو لاکھ آدمیوں نے کبیر مردہ باد کے نعرے لگانے شروع کر دیئے۔

حالات ایسے ہیں کہ پاگل خانہ کے اندر اور باہر بہت فرق نظر نہیں آتا۔ اندر ایک آدمی جس کا نام محمد علی ہے خود کو محمد علی جناح کہتا ہے۔ باہر ایک آدمی جوتوں کی دکان کا نام "جناح بوٹ ہاؤس" رکھتا ہے۔ اندر ایک پاگل درخت کے اوپر چڑھ جاتا ہے اور کہتا ہے "میں ہندوستان میں رہنا چاہتا ہوں نہ پاکستان میں میں اس درخت پر ہی رہوں گا"۔ باہر ایک آدمی اپنی دکان میں پنکھے کا رخ قائد اعظم کی تصویر کی طرف کر دیتا ہے تاکہ انھیں ٹھنڈی

ہوا لگتی رہے۔

اندر اور باہر دکھاوا ایک ہے۔ دنیا خود بڑا پاگل خانہ بن گئی ہے۔ حقیقت کیا ہے کوئی نہیں جانتا۔ ویسے بھی آدمی کو اندر سے جاننا بہت مشکل ہے، کیونکہ زندانِ ذات میں کہیں روزن و شگاف نہیں ہوتے۔ پاگلوں کے اندر کیا ہو رہا ہے ہم نہیں جانتے نہ ہی یہ بات سمجھ پاتے ہیں کہ اچھے بھلے لوگ پاگلوں کی سی حرکات کیوں کرنے لگتے ہیں۔ اسی لئے ٹوبہ ٹیک سنگھ میں لاہور کا یہ پاگل خانہ نہ تو خارجی دنیا کی علامت ہے نہ اس کی ضد، نہ اس کا عکس۔ اندر باہر ایک ہی حقیقت ہے جو مختلف روپ اختیار کرتی ہے۔ یہ حقیقت کیا ہے اس پُر انتشار دور میں کوئی نہیں جانتا۔ مثلاً کوئی نہیں جانتا کہ پاکستان کہاں ہے۔ پاگل خانے میں بعض پاگل ایسے بھی تھے جو پاگل نہیں تھے ان میں سے اکثریت ایسے قاتلوں کی تھی جن کے رشتہ داروں نے افسروں کو دے دلا کر پاگل خانے بھجوا دیا تھا کہ پھانسی کے پھندے سے بچ جائیں۔ یہ کچھ کچھ سمجھتے تھے کہ ہندوستان کیوں تقسیم ہوا ہے اور یہ پاکستان کیا ہے۔ لیکن صحیح واقعات سے وہ بھی بے خبر تھے۔ وہ اس مخمصے میں گرفتار تھے کہ وہ پاکستان میں ہیں یا ہندوستان میں۔ اگر ہندوستان میں ہیں تو پاکستان کہاں ہے۔ اگر وہ پاکستان میں ہیں تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ کچھ عرصہ پہلے یہیں رہتے ہوئے بھی ہندوستان میں تھے۔

گویا حقیقت کچھ ایسی سراب آسا تھی، پُر انتشار، سیمیا کی سی بوکھلانے والی کہ تاریخ اور جغرافیہ، زماں اور مکاں سب کچھ ایک بھونچالی کیفیت میں گڈمڈ ہو گئے تھے۔ ایسے میں ایک پاگل بشن سنگھ کا اپنے پیدائشی گاؤں ٹوبہ ٹیک سنگھ کے بارے میں فکرمند ہونا کہ وہ کہاں ہے ہندوستان میں یا پاکستان میں ایک پاگل کے پاگل پن سے زیادہ کیا اہمیت رکھتا ہے۔ لیکن بشن سنگھ کی فکرمندی ایک اندرونی اضطراب میں بدل جاتی ہے۔ وہ سب سے پوچھتا ہے کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے۔ لیکن کوئی ٹھیک سے جواب نہیں دے پاتا۔ وہ لوگ بھی نہیں جو اس کے گاؤں ٹوبہ ٹیک سنگھ سے اس سے ملنے آتے تھے۔ دراصل یہ سوال سن کر وہ بھی چکرا جاتے تھے۔ کہاں ہے کے کیا معنی۔ جہاں تھا وہیں ہے۔ لیکن کیا فی الحقیقت جو چیز جہاں تھی وہیں تھی۔ حالات ایسے تھے کہ کسی کو کسی چیز کے بارے میں کوئی یقین نہیں تھا۔ ایسے حالات میں اگر ایک پاگل کا سوال انھیں چکرا دے تو ظاہر ہے پاگل ہی زیادہ پاگل نظر آئے گا۔ کوئی اپنے عقل و فہم پر شک کرنے سے تو رہا۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ مت سب کی ماری گئی تھی۔ یہ تمام ہوش مندی لوگ اپنے آبائی گھروں کو ترک کر رہے تھے۔ وہ اپنے جنم بھوم، اپنے پشتوں کے وطن کو چھوڑ کر اس طرح جا رہے تھے گویا زمین کے ساتھ ان کا کوئی تعلق ہی نہیں رہا تھا۔ کوئی خیال تھا جو حقیقت بن رہا تھا لیکن اس کی نمود ابھی بھی سیمیا کی سی تھی، ایک ایسی آواز کی سی جس کی کشش پر لوگوں کے قافلے کے قافلے عذاب میں مبتلا روحوں کی مانند کھنچے چلے جا رہے تھے۔ کبھی پورے کنبہ کو ساتھ لے کر کبھی بوڑھے ماں باپ کو پیچھے چھوڑ کر، کبھی منگیتروں، بیویوں اور کنواری بہنوں سے ایسے وعدے کر کے جو کبھی وفا ہونے والے نہیں تھے، ماضی کی یادوں کے خزاں زدہ پتے اور مستقبل کے المیوں کے لہو لہان پھولوں کے گلدستے، سبھی کو چھوڑ کر بھاگ رہے تھے، مخبوط الحواس، ہراساں اور پریشاں، راستے میں لٹتے ہوئے کٹتے ہوئے، خون میں نہاتے ہوئے اور کسی کو اتنی فرصت نہیں تھی کہ پوچھے کہ جو گاؤں انھوں نے چھوڑا اس کا کیا بنے گا اور جس وطن کی طرف وہ جا رہے ہیں وہ کون سی جنتِ ارضی کے خواب اپنے سینہ میں لئے ہوئے ہے۔ ایسے میں بشن سنگھ کا یہ سوال کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے آدمی کو چونکاتا ہے، چکراتا ہے، ایک لمحہ کے لئے سوچتا ہوا کر دیتا ہے۔

ذہن جدید

لیکن اس سوال کا جواب دینے کی کسی پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ کیونکہ بہرحال یہ لاہور کے پاگل خانے کے ایک پاگل سکھ کا سوال ہے۔

تو آئیے ذرا پاگل خانے میں ہی چلیں اور دیکھیں کہ یہ بشن سنگھ کون ہے اور ٹوبہ ٹیک سنگھ کیا بلا ہے۔

اور جب ہم پاگل خانے میں داخل ہوتے ہیں گو وہاں بھی ہم چکرا جاتے ہیں۔ ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ بشن سنگھ ہی ٹوبہ ٹیک سنگھ ہے۔ اب پتہ نہیں منٹو نے خواہ مخواہ کے لئے ناموں کا یہ کھیلا کیوں کھڑا کیا ہوگا۔ اسے یوں سمجھئے کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ ایک جگہ کا، بلکہ ایک گاؤں کا نام ہے یہاں پاگل بشن سنگھ پیدا ہوا تھا لیکن پاگل خانہ کے ملازم اور دوسرے لوگ اسے اس کے گاؤں کے نام سے بھی پکارنے لگے اور اس طرح بشن کا ایک اور نام پڑ گیا ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ ابھی خیرا یہ کچھ اتنا بڑا اکھیلا بھی نہیں۔ اپنے یہاں تو نام کے ساتھ وطن کا نام لگا ہی ہوتا ہے۔ گویا زمین ہماری ذات کا ہی ایک حصہ ہے۔ یا آدمی کہیں بھی جائے اپنا گاؤں اپنے ساتھ ہی لے کر جائیگا۔ یا یوں کہئے کہ وہ گاؤں جہاں اس کا جنم ہوا جہاں اس کا بچپن بیتا اس کے اندر ہی بس جاتا ہے۔ ممکن ہے یہ تمام قوموں اور تمام نسلی گروہوں کی خصوصیت نہ ہو۔ لیکن ان تمدنوں کا وصف یقیناً ہے جو زیادہ ارضی "زیادہ زرعی، زیادہ پائیدار اور اسی سبب سے زیادہ قدامت پرست اور روایت پرست رہے ہیں۔ وہ قومیں جو ان تمدنی فضاؤں میں پروان چڑھتی ہیں ان کے افراد کے لئے اپنے آبائی وطن سے جدائی ایک بڑا نفسیاتی صدمہ ہوتی ہے ـــــ اتنا ہی بڑا اور اتنا ہی شدید جتنا کہ ایک بچے کا اپنی ماں سے جدا ہونے کا صدمہ بشن سنگھ پاگل ہے۔ اسے گرد و پیش کا کوئی ہوش نہیں۔ لیکن اسے یہ صدمہ پہنچنے والا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ پاگل کا ذہن بھلے مختل ہو گیا ہو۔ اس کی فطرت میں وہ جبلتیں جو انسانوں اور حیوانوں میں مشترک ہیں، اپنا کام کرتی رہتی ہیں، چنانچہ چرند، پرند، اور انسان سب کو اپنے آشیانوں اور مکانوں سے انسیت ہوتی ہے ہر پاگل کا بھی اپنا مقام ٹھکانہ ہوتا ہے۔ گاؤں کا کوئی چبوترہ، راستے کا کھنڈر، مسجد کی سیڑھی، گھر کا کوئی کونا کھدرا جہاں وہ اپنے اثاثہ کے ساتھ دنیا و ما فیہا سے بے خبر رہتا ہے۔ اسے وہاں سے ہٹاؤ تو وہ ایک زخمی کتے کی طرح چلانے لگتا ہے۔

دوسرے لوگ تو ابھی حرکت میں ہیں۔ وطن سے بے وطن ہو رہے ہیں۔ انھیں تو اتنی بھی فرصت نہیں ہے کہ سوچیں کہ جلا وطنی، یا غریب الوطنی، یا بے وطنی کا تجربہ ان کے لئے کیا الم ناک سانحہ ثابت ہوگا۔ جب دوسری سرزمینوں میں وہ اپنی جڑیں اگائیں گے تب انھیں پتہ چلے گا کہ اکھڑنے کا تجربہ اپنی قیمت کیسے وصول کرتا ہے۔ ابھی تو یہ لوگ درخت سے ٹوٹے ہوئے پتے ہیں جو تیز و تند ہواؤں پر اڑے جا رہے ہیں۔ جڑوں سے اکھڑنے کی کہانی لکھنے کے لئے ان پتوں پر تکیہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لئے منٹو کو ایک ایسے آدمی کی تلاش تھی جس کی جڑیں زمین میں بہت گہری گئی ہوں، اتنی گہری کہ ان کی گہرائی کا خود اسے علم نہ ہو۔ یہ آدمی منٹو کو ایک سکھ پاگل بشن سنگھ میں نظر آیا۔

دراصل جڑوں کا پورا مسئلہ غیر شعوری ہے۔ شعور کی سطح پر تو آدمی اپنے جنم بھوم اور وطن کے ساتھ محبت اور نفرت کا رشتہ رکھتا ہے۔ اس دن کو کوستا ہے جس دن کو اس نے اس گاؤں یا اس شہر یا اس سرزمین پر جنم لیا۔ خوابوں اور آدرشوں کی سرزمین کوئی اور ہی ہوتی ہے۔ لیکن فطرت اور معاشرہ اپنا کام کرتا رہتا ہے، موسموں کے روپ میں، رسم و رواج، میلوں ٹھیلوں اور تہواروں کے روپ میں، وہ آدمی کو اپنے اندر جذب کرتا رہتا ہے۔ بچپن خوشگوار تجربات کے شیتل جل سے ان جڑوں کی آبیاری کرتا ہے، بالکل غیر شعوری طور پر، ـــــ اور اسی

نئے وطن کی یادیں بچپن کی یادوں کا روپ لیتی ہیں اور نوستالجیا بیتے ہوتے وقت کی روشنی سے ہی نہیں بلکہ چھوڑی ہوئی زمین کی خوشبوؤں سے بھی تخیل کو جگمگاتا اور مہکاتا ہے۔ آدمی کا المیہ ہی یہ ہے کہ وہ نہیں جانتا کہ زمین میں اس کی جڑیں کتنی گہری ہیں۔ وہ اسی خوش فہمی میں ترک وطن اور ہجرت کرتا ہے کہ وہ جہاں بھی جائے گا ADJUST ہو جائے گا، SETTLE ہو جائے گا۔ مصیبت یہ ہے کہ ایسا ہو جانے کے باوجود زندگی اکھڑی اکھڑی رہتی ہے۔ خرد خود فریبیوں سے کام لیتی ہے اور سمجھاتی رہتی ہے کہ سب ٹھیک ہے لیکن بے جڑی، اجنبیت اور جلاوطنی کا زہر ثروت مند زندگی کو بھی اندر سے چاٹتا رہتا ہے۔ منٹو کا کمال یہ ہے کہ وہ انسانی فطرت کا مطالعہ فطرت ہی کے تناظر میں کرتا ہے۔ شعور کی سطح پر تو بشن سنگھ پاگل تھا لیکن لاشعور کی سطح پر، اپنے اندروں اور اپنی فطرت میں وہ ایک ایسے تناور درخت کی مانند پھیلتا گیا تھا جس کی جڑیں زمین میں گہری اترتی گئی ہوں۔

اس افسانہ کی خوبی یہ ہے کہ پورا افسانہ حقیقت نگاری کے طرز میں لکھا گیا ہے۔ علامت کا کیا ذکر استعارے تک کا فریب منٹو نے پیدا نہیں کیا۔ نہ درخت کا استعارہ ہے نہ جڑوں کا ذکر۔ لیکن درخت اور جڑوں کی بات کو آپ نظر انداز کر دیجئے اور افسانہ پاگلوں کے چند لطیفوں اور ایک پاگل کی روداد کے سوا کچھ نہیں رہتا۔

اب آیئے ذرا بشن سنگھ کو قریب سے دیکھیں منٹو لکھتا ہے بشن سنگھ ایک سکھ تھا جس کو پاگل خانے میں داخل ہوئے پندرہ برس ہو چکے تھے۔ ہر وقت اس کی زبان سے یہ عجیب و غریب الفاظ سننے میں آتے تھے۔ "اوپڑ دی گڑگڑ دی اینکس دی بے دھیانا دی، منگ دی دال آف دی لالٹین،، دن کو سوتا تھا نہ رات کو۔ پہرہ داروں کا یہ کہنا تھا کہ پندرہ برس کے طویل عرصے میں وہ ایک پل کے لئے بھی نہیں سویا۔ لیٹتا بھی نہیں تھا البتہ کبھی کبھی کسی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا لیتا تھا۔

اس بیان میں تو استعارے کا شائبہ تک نہیں۔ ایک اور بیان دیکھئے :-

"ہر وقت کھڑا رہنے سے اس کے پاؤں سوج گئے تھے۔ پنڈلیاں بھی پھول گئی تھیں مگر اس جسمانی تکلیف کے باوجود لیٹ کر آرام نہیں کرتا تھا۔ ہندوستان پاکستان اور پاگلوں کے تبادلے کے متعلق جب کبھی پاگل خانے میں گفتگو ہوتی تھی تو وہ غور سے سنتا تھا۔ کوئی اس سے پوچھتا کہ اس کا کیا خیال ہے تو وہ بڑی سنجیدگی سے جواب دیتا۔ "اوپڑ دی گڑگڑ دی بے دھیانا دی منگ دی دال آف دی پاکستان گورنمنٹ"

تو یہ ہیں بشن سنگھ صاحب جو ٹوبہ ٹیک سنگھ بھی کہلاتے ہیں۔ پتہ نہیں منٹو اس کردار سے کیا کام لینا چاہتا ہے۔ ابھی تک تو کوئی سراغ نہیں ملتا۔ چونکہ وہ پاگل ہے اس لئے اس کے اندر کیا کھچڑا پک رہا ہے اس کا علم تو ہمیں ہونے والا نہیں۔ جو کچھ اس کی باتوں اور حرکات و سکنات سے قیاس کر سکتے ہیں وہی غنیمت ہے اور یہ غنیمت بھی اس کے بارے میں ہمیں کچھ نہیں بتاتا۔ اس کی باتیں تو آپ نے سن لیں: اوکس دی گڑگڑ دی اینکس دی بے دھیانا دی.... اب ان باتوں سے آپ قیاسات کے قلعے تعمیر کیجئے۔ جہاں تک حرکات و سکنات کا تعلق ہے تھوڑی بہت تفصیلات ہمیں ملتی ہیں لیکن وہ بھی بہت معاون ثابت نہیں ہوتیں۔ وہ پندرہ سال سے ایک پل بھی نہیں سویا۔ ہر وقت کھڑا رہتا تھا۔ اس کے کیس چھورے ہو کر بہت مختصر رہ گئے تھے۔ چونکہ بہت کم نہاتا تھا اس لئے داڑھی اور سر کے بال آپس میں جم گئے تھے۔ جس کے باعث اس کی شکل بڑی بھیانک ہو گئی تھی۔ مگر آدمی بے ضرر تھا۔ پندرہ برسوں میں اس نے کبھی کسی سے جھگڑا فساد نہیں کیا تھا۔ پاگل خانے کے جو پرانے ملازم تھے وہ اس کے متعلق اتنا جانتے تھے کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ میں اس کی

کئی زمینیں تھیں اچھا کھاتا پیتا زمیندار تھا کہ اچانک دماغ الٹ گیا۔

اب کچھ سراغ ملتا ہے کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کی اسے کیوں اتنی فکر تھی۔ وہاں اس کی کچھ زمینیں تھیں، اور زمین کے ساتھ کسان کا رشتہ بہت گہرا ہوتا ہے۔ وہ پاگل خانہ میں آگیا تب بھی یہ رشتہ ٹوٹا نہیں تھا لیکن اب جبکہ ملک تقسیم ہوا تھا تو یہ سوال اس کے لئے سوہان روح بن گیا تھا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں رہے گا، اور یہ اندیشہ کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ اس طرف رہے اور اسے دوسری طرف جانا پڑے اس کے لئے خلفشار کا باعث بن گیا تھا۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ اس کے سب رشتے ناتے ٹوٹ گئے تھے لیکن زمین سے یہ رشتہ کسی نہ کسی صورت قائم تھا۔ اور اب بیدار ہو کر بہت شدید شکل اختیار کر گیا تھا۔ ایسا کیوں ہوا کیسے ہوا اس کا جواب کسی کے پاس نہیں ہے کیونکہ بہر حال بشن سنگھ ایک پاگل ہے۔ ایک پاگل کے اندر کون سے احساسات جذبات اور جبلتیں جنم لیتی ہیں ہم نہیں جانتے بعض اوقات تو متضاد رویئے متوازی چلتے ہیں۔ کسی بات کا ہوش نہیں ہوتا لیکن کسی چیز کا اتا پتا ایسا بتاتا ہے کہ ہوش مند بھی چکرا جاتے ہیں۔ زمان و مکان کی سدھ بدھ نہیں ہوتی لیکن ایک اندرونی گھڑی ہوتی ہے جو ٹک ٹک کرتی رہتی ہے اور آنے والے دنوں کا پتہ دیتی ہے۔ پاگلوں کی اس چھٹی حس اس اندرونی منطق کا بیان منٹو نے ایسی فنکارانہ بصیرت سے کیا ہے کہ بے ساختہ داد نکل جاتی ہے۔

"اس کو یہ قطعاً معلوم نہیں تھا کہ دن کون سا ہے، مہینہ کون سا ہے یا کتنے سال بیت چکے ہیں۔ لیکن ہر مہینے جب اس کے عزیز و اقارب اس سے ملنے کے لئے آتے تھے تو اسے اپنے آپ پتہ چل جاتا تھا چنانچہ وہ دفعدار سے کہتا کہ اس کی ملاقات آرہی ہے۔ اس دن وہ اچھی طرح نہاتا بدن پر خوب صابن گھستا اور سر پر تیل لگا کر کنگھا کرتا۔ اپنے کپڑے جو وہ کبھی استعمال نہیں کرتا تھا نکلوا کے پہنتا اور یوں سج بن کر ملنے والوں کے پاس جاتا۔ وہ اس سے کچھ پوچھتے تو وہ خاموش رہتا یا کبھی کبھار "اوپڑدی گڑگڑدی اینکس دی بے دھیانا دی منگ دی دال آف دی لالٹین کہہ دیتا۔

دیکھئے اسے وقت کا کوئی احساس نہیں لیکن ملاقات کا وقت یاد رہتا ہے۔ لوگ ملنے آتے ہیں تو تیار ہو کر جاتا ہے لیکن لوگوں کی کوئی سدھ بدھ نہیں۔ اس کی لڑکی اس سے ملنے آتی تھی لیکن بشن سنگھ اسے پہچانتا ہی نہیں تھا۔ وہ بچی تھی تب بھی اپنے باپ کو دیکھ کر روتی تھی جوان ہوئی تب بھی اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ لیکن اسے دیکھ کر بشن سنگھ کو کچھ بھی یاد نہیں آتا تھا۔ گویا سب رشتے ناتے ٹوٹ گئے تھے۔ بیٹی بھی ہندوستان چلی جاتی ہے تو اس پر کچھ اثر نہیں ہوتا۔ وہ تو بس سب سے ایک ہی سوال پوچھتا ہے ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ کی فکر بشن سنگھ کے اندر ایک جنون کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔

جب تبادلہ کا دن آیا تو سب پاگلوں کو لاریوں میں بٹھا کر سرحد پر لے جایا گیا۔ وہاں پاگلوں کو لاریوں سے نکالا جاتا اور انھیں دوسرے افسروں کے حوالے کیا جاتا۔ جب بشن سنگھ کی باری آئی تو اس نے افسر سے پوچھا ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے۔ افسر ہنسا اور کہا پاکستان میں۔

یہ سن کر بشن سنگھ اچھل کر ایک طرف ہٹا اور دوڑ کر اپنے باقی ماندہ ساتھیوں کے پاس پہنچ گیا۔ پاکستانی سپاہیوں نے اسے پکڑ لیا اور دوسری طرف لے جانے لگے مگر اس نے چلنے سے انکار کر دیا۔ "ٹوبہ ٹیک سنگھ یہاں ہے" اور زور زور سے چلانے لگا "اوپڑدی گڑگڑدی اینکس دی بے دھیانا دی منگ دی دال آف ٹوبہ ٹیک سنگھ اینڈ پاکستان"!

تو گویا اس پاگل سکھ کا فیصلہ تھا کہ جہاں ٹوبہ ٹیک سنگھ رہے گا وہیں وہ بھی رہے گا۔ تمام رشتے ناتے اور خارجی دنیا سے تعلق ٹوٹنے کے باوجود اس کے گاؤں سے، اس کی زمین سے اس کا رشتہ برقرار تھا۔ یہ پاگل ان دیوانوں سے بہت مختلف تھا جو اپنے گاؤں اپنی زمین اپنے رشتوں ناتوں سے تعلق توڑ کر ایک اجنبی سرزمین کی طرف جا رہے تھے بشن سنگھ ان پندرہ سالوں میں سویا نہیں تھا۔ کسی سے بات نہیں کرتا تھا کھڑا ہی رہتا تھا گویا نباتاتی حالت میں آگیا تھا۔ وہ ایک پرانے درخت کی مانند تھا جس کی جڑیں اندر ہی اندر زمین میں گہری چلی گئی ہوں۔ وہ محض ایک شئے نہیں تھا جس کی ہیرا پھیری کی جائے۔ اسے دوسری طرف بھیجنے کے لئے یا تو جڑ سے اکھیڑنا پڑتا ہے یا کلہاڑی سے کاٹنا پڑتا ہے۔ "جب بشن سنگھ کو زبردستی دوسری طرف لے جانے کی کوشش کی گئی تو وہ درمیان میں ایک جگہ اس انداز میں اپنی سوجی ہوئی ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا جیسے اب اسے کوئی طاقت وہاں سے نہیں ہلا سکے گی۔

آدمی چونکہ بے ضرر تھا اس لئے اس سے مزید زبردستی نہ کی گئی اس کو وہیں کھڑا رہنے دیا گیا اور تبادلے کا کام ہوتا رہا

سورج نکلنے سے پہلے ساکت و صامت بشن سنگھ کے حلق سے ایک فلک شگاف چیخ نکلی ادھر ادھر سے کئی افسر دوڑے آئے اور دیکھا کہ وہ آدمی جو پندرہ برس تک دن رات اپنی ٹانگوں پر کھڑا رہا تھا، اوندھے منھ لیٹا ہے۔ ادھر خاردار تاروں کے پیچھے ہندوستان تھا — ادھر ویسے ہی تاروں کے پیچھے پاکستان۔ درمیان میں زمین کے اس ٹکڑے پر جس کا کوئی نام نہیں تھا ٹوبہ ٹیک سنگھ پڑا تھا۔

درخت کا استعارہ مکمل ہو گیا۔ بشن سنگھ وہ توانا درخت تھا جس کی جڑیں زمین میں پیوست تھیں۔ وہ فلک شگاف چیخ کے ساتھ ایسا گرتا ہے جیسے کوئی بڑا درخت گرتا ہے اور درخت اسی زمین پر گرتا ہے جس کی کوکھ سے وہ بیج میں سے پھوٹا تھا۔ اور ایک عجیب منطق کے ذریعہ بشن سنگھ جس زمین پر گرتا ہے وہیں ٹوبہ ٹیک سنگھ بھی ہے کہ بشن سنگھ کو لوگ ٹوبہ ٹیک سنگھ بھی کہتے تھے۔ اس سوال کا جواب اسے مر کر ہی ملتا ہے کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے۔ وہ وہیں ہے جہاں بشن سنگھ زندہ یا مردہ ہے۔ کیونکہ آدمی زمین پر ہی زندہ نہیں رہتا بلکہ زمین بھی آدمی کی زندگی کا جزو بن جاتی ہے جیسا کہ بشن سنگھ کے عرفی نام ٹوبہ ٹیک سنگھ سے ظاہر ہے۔

کیا افسانہ کی تھیم یعنی آدمی کا زمین سے رشتہ منٹو کو پہلے سوجھی اور اس نے بعد میں کہانی لکھی اگر ایسا ہے تو تھیم کی افسانوی تجسیم کے لئے اسے پاگل خانہ ہی کا خیال کیوں آیا؟ — زیادہ قرینِ قیاس تو یہی ہے کہ اسے پاگل خانہ کا خیال پہلے آیا کیونکہ اس نے اپنے مزاج کے مطابق سوچا ہو گا کہ دیکھیں بٹوارے کا اثر ایک پاگل پر کیا پڑتا ہے اس دیکھنے میں ہی تھیم ایک کوندے کی طرح اس کے تخلیقی تخیل میں چمک گئی۔ تخلیقی عمل کے متعلق یہ محض ہماری خیال آرائیاں ہیں۔ اس کی تھاہ پانا ہمارے لئے ممکن نہیں۔

ذرا دیکھئے تو افسانہ میں تھیم اور اس کے اظہار کی پوری مشینری — یعنی تقسیم ملک، لوگوں کی ہجرت، پاگلوں کا تبادلہ اور ایک پاگل بشن سنگھ کی روداد ایک دوسرے میں کیسے پیوست ہو چکی ہے کہ اس تھیم کو اسی شدت اور تاثر کے ساتھ بیان کرنے کا کوئی اور پیرایہ نظر نہیں آتا۔ موضوع اور ہیئت کی یہ مکمل یک آہنگی اس کہانی کی فنکارانہ تکمیل کا ثبوت ہے۔

یہ تردد کہ بٹوارے کے بعد میرا گاؤں کہاں رہے گا بھلے چنگے آدمی کے اعصاب پر سوار ہو جائے تو اسے

باقی صفحہ ۱۴۲

منٹو کے فن میں وجودی صورتِ حال

ضمیر علی بدایونی

منٹو کے فن کے بارے میں یوں تو بے شمار تنقیدی جائزے، تجربے، مضامین اور مقالات مختلف رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں لیکن منٹو اردو کا جس قدر بڑا فنکار ہے اس کے مقابلے میں سچ پوچھیے تو کوئی قابل قدر اور تفصیلی تحریر اب تک دیکھنے میں نہیں آئی۔ ممتاز شیریں کے مضمون "منٹو کی فنی تکمیل کو" اس سلسلے میں سب سے بہتر مضمون قرار دیا جاسکتا ہے۔ عسکری صاحب بھی منٹو کی دنیا سے سرسری گزر گئے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی حقیقت نگاری کے روایتی تصور سے آگے نہ بڑھ سکے اس کے علاوہ منٹو کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر تاثراتی مضامین بھی شائع ہوئے ہیں لیکن وہ نہ بھی لکھے جاتے تو کوئی خاص فرق نہ پڑتا۔ ممتاز شیریں کا مضمون اگرچہ کافی مختلف ہے اور منٹو فہمی میں اضافہ کرتا ہے۔ اور یہ بھی درست ہے کہ انہوں نے منٹو کی شخصی زندگی کی بجائے منٹو کے فن کو اپنا موضوع بنایا لیکن وہ منٹو کے تخلیقی وجدان اور اس کے فن کے ذاتی پہلوؤں کا احاطہ کرنے میں کوئی قابل قدر کامیابی حاصل نہ کرسکیں۔ منٹو کے فن کے گہرے نفسیاتی اور جمالیاتی تجربے کی شاید انہیں فرصت ہی نہیں ملی۔

ایک بڑا فنکار سمندر جیسا پھیلاؤ رکھتا ہے۔ اس کے مختلف ساحلوں پر مختلف بستیاں آباد ہوتی ہیں۔ اس کے دامن میں کچھ جزیرے بھی ہوتے ہیں۔ جو ڈوبتے ابھرتے رہتے ہیں۔ اس کی گہرائی میں زندگی سانس لیتی ہے اور سطح آب کا منظر بھی کم دلاویز نہیں ہوتا۔ جہاں زندگی کی کشتی رواں دواں رہتی ہے۔ منٹو کے فن کی دنیا بھی اپنا پھیلاؤ اور گہرائی رکھتی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہر بڑے فنکار کا مخصوص زاویہ نظر ہوتا ہے ایک محور اور ایک وژن ہوتا ہے۔ لیکن ایک مخصوص نقطہ نظر، ایک منفرد فلسفہ حیات کے باوجود وہ بیک وقت کئی رجحانات کا نمایندہ ہوتا ہے۔ اس کے رنگ میں کئی رنگ شامل ہوتے ہیں اس کی مثال جدید اردو میں۔ ن م راشد کی شاعری سے دی جاسکتی ہے۔ راشد کی شاعری ہئیت و موضوع میں نئے تجربات کی شاعری ہے۔ وہ سائنسی، نفسیاتی اور فلسفیانہ علوم سے نئی علامتیں تخلیق کرتا ہے۔ وہ ہیئتے سے بھی متاثر نظر آتا ہے۔ مارکس اور فرائڈ سے بھی اور آخر میں وجودی رجحان کی نمایندگی بھی کرنے لگا اور نثری نظموں کی کشش سے بھی خود کو بچا نہ سکا۔ بڑا فنکار ہمیشہ ایک ایسا آئینہ تخلیق کرتا ہے جس میں ہر قاری اپنا چہرہ دیکھتا ہے۔ خود اس پر اس کی تمنائیں اور مایوسیاں روشن ہوجاتی ہیں اور یہ سلسلہ کبھی نہیں رکتا۔ آئینہ کے خلا سے معانی کا ایک آبشار بہتا رہتا ہے۔ لیکن آئینہ میں خود کوئی معنی نہیں ہوتے اس میں صرف ایک خلا موجود رہتا ہے۔ یہ بات مرزا عبدالقادر بیدل نے بہت پہلے کہی تھی کہ شعر خوب معنی ندارد۔ یہاں بیدل آرٹ کی ایک اہم حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اعلیٰ شعر اگر ایک معنی تک محدود ہوجائے تو اس کا مکالمہ مستقبل سے ممکن نہیں۔ اعلیٰ شعر اور فن پارہ وہ ہے جس میں ہر صورت حال موجود ہوتی ہے وہ کسی مخصوص صورت حال تک محدود نہیں ہوتا۔ یہی بات ایذرا پاؤنڈ نے بھی کہی ہے اس کے نزدیک ہر فن پارے میں حقیقت کا فکری اور احساسی ایمیج ہوتا ہے۔ اور ہر فن پارہ میں UBIQUITY OF APPLICATION ہوتی ہے۔ یعنی جو ہر صورت حال میں اپنا اطلاقی پہلو رکھتا ہے اس کا دائرہ اطلاق بے حد وسیع ہوتا ہے۔ اس حقیقت کی طرف زمانہ حال کے چند ساختیت پسند ذہن جدید

STRUCTURALIST مفکرین نے بھی ہماری توجہ مبذول کرائی ہے۔ ان کے نزدیک کسی فن پارے کے معنی فنکار کے شعوری معنی تک محدود نہیں ہوتے بلکہ وہ جس نظام فکر جس تہذیبی اور جمالیاتی نظام کا حصہ ہوتے ہیں معنی اس نظام سے آزاد نہیں وہ زبان کی سطحی اور گہری ساختوں SURFACE AND DEEPER STRUCTURE سے اپنے فن پارے اور اس کے معانی کو آزاد نہیں کر سکتا کیونکہ وہ اس کا حصہ ہوتے ہیں یہاں تک کہ تحریر وجود میں آنے کے بعد اپنے خالق سے الگ ہو جاتی ہے اور اپنا آزادانہ وجود رکھتی ہے۔ اس میں معانی کی مختلف جہات منکشف ہوتی رہتی ہیں۔ معنی کی ایک رو بہتی رہتی ہے۔ ہر قاری کو معنی کے سرچشمے سے اپنے معنی اخذ کرنا ہوتے ہیں۔ اگر قاری کی داخلیت کا شعلہ بجھ جائے تو سارے فن پارے بے معنی و بے مصرف ہو کر رہ جائیں وہ فن پارہ سرے سے موجود ہی نہیں جو قاری کی معنی آفرین قوتوں کو بیدار نہ کر دے۔ تحریر تو قاری سے معانی کا چندہ کرتے کرتے اس قدر معانی سے گرانبار ہو جاتی ہے کہ کوئی نقاد اسے تہی دست نہیں کر سکتا لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ تحریر ایک اہم ہیئت SIGNIFICANT FORM رکھتی ہو۔ وہ زندگی کی ایک دستاویز ہو اور صداقت اس کے وجود سے باہر نہ ہو۔ یعنی تحریر اظہار کی تکمیل سے وجود میں آتی ہے۔ اور اسی طرح اس کے ابلاغ کا تسلسل قائم رہتا ہے۔ ہر سال مونالیزا کی پر اسرار مسکراہٹ کے بارے میں سینکڑوں مضامین چھپتے رہتے ہیں یہاں تک کہ سارتر نے لکھا کہ مونالیزا کے لبوں پر نشاۃ ثانیہ مسکرا رہی ہے کسی نے کہا کہ یہ تخلیق کی مسکراہٹ ہے لیکن معانی کی یہ رو صرف اس وجہ سے بہہ رہی ہے کہ مونالیزا ایک اہم ہیئت SIGNIFICANT FORM رکھتی ہے جو اظہار کی تکمیل کا دوسرا نام ہے۔ جسے راجر فرائی ڈیزائن کا نام دیتا ہے اور وکٹر کوزین تجرید راست کہتا ہے۔ سارتر اسے مظہریت کے فلسفہ سے جوڑ دیتا اور اس میں تخیلاتی شعور کی کارفرمائی دیکھتا ہے۔ کروچے ایک قدم آگے بڑھ کر کہتا ہے کہ اظہار کا عمل تو فنکار کے وجدان میں مکمل ہو جاتا ہے فن پارہ تو اس کی اطلاقی شکل ہے۔ ہماری رسائی فنکار کے تخلیقی وجدان تک تو ہو نہیں سکتی صرف اس کی اطلاقی شکلیں ہمارے مشاہدے میں آتی ہیں اور ہمارا ادراک ان اطلاقی شکلوں سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔

منٹو کا فن اس ساختیاتی، مظہری وجودی جمالیات کے دائرے سے باہر موجود نہیں اور اپنی روایت اور تہذیب اور جمالیاتی نظام میں ایک مخصوص قدر و قیمت کا حامل ہے لیکن منٹو کے افسانے ایک پیچیدہ تکنیک سے وجود میں آتے ہیں۔ سارا آرٹ حقیقت کو تخیل میں تبدیل کرتا رہتا ہے یعنی آرٹ تخیلی ہوتا ہے۔ لیکن منٹو حقیقت کے تار و پود سے اپنے کرداروں کو تخلیق کرتا ہے۔ وہ انہیں تخیلی بنانے پر قانع نہیں ہوتا بلکہ تخیل کو پھر حقیقت میں تبدیل کر دیتا ہے۔ اس لیے اس کے کردار حقیقت کی عکاسی نہیں کرتے بلکہ خود حقیقت میں شریک نظر آتے ہیں۔ اس کے کردار جمالیاتی فاصلوں کے دھندلکوں میں گم نہیں ہوتے وہ ایک ایسا حقیقت پسند ہے جو تخیل کو حقیقی بنا دیتا ہے۔ لیکن قرۃ العین حیدر کا فن اس سے بالکل مختلف ہے وہ حقیقی کو تخیلی بنا دیتی ہیں اور تاریخ کو افسانہ۔ لیکن منٹو افسانے کو تاریخ اور تخیل کو حقیقی روپ دینے والا فنکار ہے۔ تقسیم برصغیر کے واقعات و حادثات کو منٹو نے افسانہ بنا دیا ہے۔ جس کی مثالیں ٹوبہ ٹیک سنگھ، موذیل اور ٹھنڈا گوشت ہیں لیکن بعض تخیلی کرداروں کو حقیقی کرداروں میں بھی اس نے تبدیل کیا ہے جیسے بابو گوپی ناتھ، ہتک، کالی شلوار اور "کھول دو" ان دونوں کا سنگم ہے۔

منٹو کا فن ایک آئینہ خانہ کی مانند عکس در عکس اپنا اظہار کرتا ہے۔ وہ اپنی علامتوں کو وضاحتوں میں ا وضاحتوں کو علامتوں میں تبدیل کرتا رہتا ہے۔ وضاحت اور علامت کے اس کھیل میں منٹو انتہائی تلخ حقیقتوں کا اظہار کرتا ہے۔ اس کی واقعیت نگاری اپنے اندر ایک پورا علامتی اور اشاریتی نظام رکھتی ہے۔ جس کی گہرائیوں تک پہنچے

کے لیے ہمیں پوری دیانت داری خلوص اور سچائی سے منٹو کے ART اور اس کے پس منظر کا جائزہ لینا چاہیئے۔

مضمون کے آغاز میں کہا گیا تھا کہ بڑا فنکار سمندر کی طرح اپنا پھیلاؤ رکھتا ہے۔ اس کے ساحلوں پر مختلف بستیاں آباد ہوتی ہیں۔ منٹو کے فن کے وسیع و عریض ساحل پر یوں تو ہمیں کئی بستیاں نظر آتی ہیں لیکن آج جس بستی کا منظر نامہ پیش کیا جا رہا ہے وہاں ایک ایسی صورت حال نظر آ رہی ہے جسے عالمی ادب میں وجودی صورت حال کا نام دیا گیا ہے۔

"ہتک" منٹو کی ایک اہم کہانی ہے۔ جس کا مرکزی کردار ایک طوائف ہے جس کا نام سوگندھی ہے اس کہانی کی پوری سیٹنگ وجودی ہے سوگندھی کی دو شخصیتیں ہیں، "ہتک سے پہلے اور ہتک کے بعد۔ پہلی شخصیت خود فریبی کے جال میں جکڑی نظر آتی ہے۔ جسے سارتر BAD FAITH کا نام دیتا ہے۔ سوگندھی جانتی تھی کہ لوگ اس کے پاس کیوں آتے ہیں اور ان میں سے کوئی بھی اس سے محبت نہیں کرتا وہ اس دنیا میں تنہا ہے۔ لیکن پھر بھی وہ یقین کر لیتی تھی۔

سارتر نے خود فریبی کی مثال دیتے ہوئے ایک ایسی عورت کی صورت حال پیش کی ہے جو پہلی مرتبہ کسی مرد کے ساتھ اپنی مرضی سے جانے کا ارادہ کرتی ہے۔ وہ اس مرد کے ارادوں سے بخوبی واقف ہے جو اس سے باتیں کرتا ہے۔ یا اس کے بارے میں جو عزائم رکھتا ہے وہ جانتی ہے کہ جلد یا بدیر اس کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ اس کے بارے میں کوئی فیصلہ کرے لیکن وہ اس معاملے میں فوری فیصلے کی ضرورت سمجھنا نہیں چاہتی اور فیصلے سے گریز پا رہتی ہے۔ لیکن وہ سب کچھ سمجھنے کے باوجود اپنا تعلق اپنے ساتھی کے اس رویے سے رکھتی ہے جس میں احتیاط ہوشیاری، اور اس کے لیے عزت بھی ہے۔ وہ اپنے ساتھی کے عزائم کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کے الفاظ کے گہرائی تک پہنچنا نہیں چاہتی بلکہ اس کے سطحی مفہوم و معنی سے سروکار رکھنا چاہتی ہے۔ اگر اس کا ساتھی یہ کہتا ہے کہ "تم بہت پر کشش اور خوبصورت ہو"، تو وہ اس کے ظاہری مطلب و مفہوم تک خود کو محدود رکھنا چاہتی ہے۔ اس جملے کے پس پردہ اس کے ساتھی کے عزائم سے وہ نظریں چرانا چاہتی ہے۔ وہ اس کے رویے میں خلوص اور احترام دیکھتی ہے اور اس طرح اپنی لامحدود آزادی کی نفی کرتی ہے اور فیصلے کی گھڑی کو مستقل طور پر ملتوی کرنے میں مصروف ہے اور اپنے ادراک پر خود پردہ ڈالنا چاہتی ہے۔ اپنے مشاہدے کی خود تکذیب کرنا چاہتی ہے۔ اپنی فردیت کو شئے میں تبدیل ہوتا دیکھتی ہے اور خاموش رہتی ہے سارتر نے اس خود فریبی کے رویے کو اپنے، وجودی فلسفہ میں ایک اہم جگہ دی ہے۔ یہ اپنی فردیت، اور غیر محدود آزادی سے فرار کا رویہ ہے جو ایک شخص کو شئے میں تبدیل کر دیتا ہے۔

منٹو وجودیت کے فلسفے سے واقف نہ تھا لیکن وہ ایک فنکار تھا۔ اس کا تخلیقی وجدان ایک آئینے کی مانند تھا۔ جس میں وہ انسانی وجود کی کلیت کا ادراک کرتا تھا۔ صرف گوشت پوست کا جنس زدہ انسان نہیں بلکہ نفسیات کی تمام غیر مرئی حقیقتوں والا انسان جس کی رُوح کے سارے زیر و بم اس کے وجدان پر منکشف ہوتے رہتے تھے۔ فنکار کسی فلسفے کا پابند نہیں ہوتا بلکہ وہ فلسفیانہ بصیرت کا ایک کبھی نہ ختم ہونے والا سرچشمہ ہوتا ہے جو انسانیت کو یہ بتلاتا ہے کہ انسان کیا ہے۔ منٹو وجودی صورت حال تک اپنے فن اور اپنے وجدان کے ذریعے پہنچتا ہے۔ فلسفہ سازی اور نظریہ سازی سے فن کا مقام بہت بلند ہے۔ منٹو کی یہ کہانی وجودی فلسفہ کی آئینہ دار نہیں بلکہ وجودی صورت حال کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے اب آیئے اس کہانی پر ایک نظر ڈالتے ہیں جو BAD FAITH اور شخص اور شئے کے رشتے کے بارے میں اردو ادب کی سب سے مکمل اور خوبصورت کہانی ہے جو ہے تو ایک طوائف کی مختصر کہانی لیکن اپنے

وژن کے پھیلاؤ میں وہ پوری انسانیت کو اپنے اندر سمیٹ لیتی ہے۔

سوگندھی اتنی چالاک نہیں تھی جتنی کہ خود کو ظاہر کرتی تھی۔ اس کے گاہک بہت کم تھے۔ غایت درجہ جذباتی لڑکی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تمام گر جو اسے یاد تھے۔ اس کے دماغ سے پھسل کر اس کے پیٹ میں آجاتے تھے۔ ۔ ۔ ۔ سوگندھی دماغ میں زیادہ رہتی تھی لیکن جونہی کوئی نرم و نازک بات کوئی کومل بول اس سے کہتا تو جھٹ پگھل کر وہ اپنے جسم کے دوسرے حصوں میں پھیل جاتی۔ گو مرد و عورت کے جسمانی ملاپ کو اس کا دماغ بالکل فضول سمجھتا تھا مگر اس کے جسم کے باقی اعضا سب کے سب اس کے بری طرح قائل تھے۔ وہ تھکن چاہتے تھے۔

یہ تو اس کہانی کے مرکزی کردار کا ایک مختصر تعارف تھا لیکن یہ کردار آہستہ آہستہ خود فریبی کی بھول بھلیوں میں گم ہونے لگتا ہے۔ منٹو کے الفاظ میں۔

"ہر روز رات کو اس کا نیا یا پرانا ملاقاتی اس سے کہا کرتا تھا۔ "سوگندھی میں تجھ سے پریم کرتا ہوں" اور سوگندھی یہ جان بوجھ کر کہ وہ جھوٹ بولتا ہے۔ بس موم ہو جاتی تھی۔ اور ایسا محسوس کرتی تھی جیسے سچ مچ اس سے پریم کیا جا رہا ہے۔ پریم ۔ ۔ ۔ ۔ کتنا سندر بول ہے وہ چاہتی تھی اس کو پگھلا کر اپنے سارے انگوں پر مل لے۔ اس کی مالش کرے تاکہ یہ سارے کا سارا اس کے مساموں میں رچ جائے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یا پھر وہ خود اس کے اندر چلی جائے سمٹ سمٹا کر اس کے اندر داخل ہو جائے اور اوپر سے ڈھکنا بند کر دے۔"

منٹو کا یہ کردار ایک قدم آگے بڑھتا نظر آتا ہے سوگندھی طوائفوں کے جنس زدہ ماحول سے نکل کر عورت کی بنیادی خواہش کی جانب بڑھتی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ کوئی اس سے محبت کرے پریم کا لفظ اس کے ساز حیات کو نغمہ بار کر دیتا ہے بلکہ وہ خود ایک نغمے میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ وہ ایک عورت ہے اور اپنی تکمیل چاہتی ہے۔ خود کو چاہے جانے کی خواہش سے ایک اور کردار پیدا ہوتا ہے مادھو، مادھو منٹو کی اس کہانی کا دوسرا اہم کردار ہے۔ جو سوگندھی کے لیے التباس محبت بھی ہے اور وہ راستہ بھی جس پر سوگندھی BAD FAITH کا فریب کھتی ہے اور اپنی تقدیر کے زنداں کے بند کواڑوں کو کھولنا چاہتی ہے سوگندھی اور مادھو یہ دو کردار مرد اور عورت کے ازلی و ابدی حیاتیاتی رشتے کی علامت کے طور پر کہانی میں ابھرتے ہیں۔ اور خود فریبی کی شطرنج کھیلتے دکھائی دیتے ہیں جو لطف انگیز بھی ہے اور اذیت ناک بھی نفی اور اثبات کے اس ظالمانہ کھیل میں ہم منٹو کے ساتھ دور تک چلے جاتے ہیں۔ جہاں زندگی اپنے زخموں کا مرہم ڈھونڈتی ہے اور برگ خزاں کی طرح خاک نشیں ہو جاتی ہے۔ آیئے منٹو کے اس دوسرے کردار سے ملاقات کرتے ہیں۔

سوگندھی سے جب مادھو کی پہلی ملاقات ہوئی تو اس نے کہا تھا۔ "تجھے لاج نہیں آتی اپنا بھاؤ کرتے جانتی ہے تو میرے ساتھ کس چیز کا سودا کر رہی ہے اور میں تیرے پاس کیوں آیا ہوں؟ چھی چھی چھی، دس روپے اور جیسا کہ تو کہتی ہے ڈھائی روپے دلال کے باقی ساڑھے سات روپئے رہے نا ساڑھے سات۔ ۔ ۔ ۔ اب ان ساڑھے سات روپیوں پر تو مجھے ایسی چیز دینے کا وچن دیتی ہے جو تو دے ہی نہیں سکتی اور میں ایسی چیز لینے آیا ہوں جو میں لے نہیں سکتا۔ ۔ ۔ ۔ مجھے عورت چاہیئے پر تجھے کیا اس وقت، اسی گھڑی مرد چاہیے۔ ۔ ۔ ۔ مجھے تو عورت بھی بھا جائے گی پر کیا میں تجھے جچتا ہوں۔ ۔ ۔ ۔ ! تیرا میرا ناطہ ہی کیا ہے کچھ بھی نہیں۔ ۔ ۔ ۔ بس یہ دس روپئے جن میں سے ڈھائی دلال کو چلے جائیں گے اور باقی ادھر ادھر بکھر جائیں گے جو تیرے میرے بیچ میں بج رہے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ تو بھی اس کا بجنا سن رہی ہے

اور ہیں بھی. تیرا من کچھ اور سوچتا ہے میرا من کچھ اور..... کیوں نہ کوئی ایسی بات کریں کہ مجھے تیری ضرورت ہو اور تجھے میری. پونے میں حوالدار ہوں، مہینے میں ایک بار آیا کروں گا تین چار دن کے لیے یہ دھندا چھوڑ..... میں تجھے خرچ دیا کروں گا..... کیا بھاڑا ہے اس کھولی کا.....''

سوگندھی کے احساس کے اُفق پر مادھو ایک مثبت کردار کے طور پر ابھرتا ہے.

''تین گھنٹے کی بات چیت کے بعد سوگندھی اور مادھو دونوں آپس میں گھل مل گئے تھے اور سوگندھی کو تو ایسا محسوس ہوا تھا کہ وہ برسوں سے حوالدار کو جانتی ہے..... مادھو کتنا اچھا تھا اس کی ہر بات باون تولے اور پاؤ رتی کی تھی. کیا کھری کھری سنائی تھیں اس نے سوگندھی کو..... محسوس ہونے لگا کہ اس مادھو کی ضرورت ہے چنانچہ ان دونوں میں سمبندھ ہو گیا.''

سوگندھی کی زود یقینی اسے ڈھکیلتی ہوئی خود فریبی کے اس جال کی طرف لے جاتی ہے جو مادھو نے اس کے لیے بڑی صفائی اور بابکی سے بنا تھا لیکن وہ اس جال کو تحفظ کی علامت سمجھتی ہے. معاشرے کی آغوش بے پرواسے بھاگے ہوئے بچے ہر سایہ دیوار کو دیوار سمجھنے لگے ہیں. ہر رات کی تاریکی اس کی منزل بن جاتی ہے اس لیے کہ ان کی کوئی منزل نہیں ہوتی. دن کا اجالا ان کے لیے چیلنج بن کر آتا ہے کیونکہ رات پردہ پوش ہوتی ہے وہ جس چیز کو چھپا لیتی ہے دن اس کو فاش کر دیتا ہے تاریکی کے ان مسافروں کا سفر رات سے رات کی جانب ہوتا ہے لیکن وہ دن کو پھلانگ نہیں سکتے ایک رات سے دوسری رات تک پہنچنے کے لیے انہیں دن کی تکلیف دہ مسافت طے کرنا پڑتی ہے. دن ان کے زخموں کو نمایاں کر دیتا ہے المیہ یہ ہے کہ وہ اپنے زخموں کی نمائش سے خود کو نہیں بچا سکتے سوگندھی رات کا کردار ہے اسے تاریکی نے جنم دیا ہے وہ کبھی نہ ختم ہونے والی تاریکی میں ڈوب جانا چاہتی ہے لیکن تاریکی کا تسلسل بار بار ٹوٹ جاتا ہے اور سوگندھی اپنے آپ کو بار بار دن کی دہلیز پر پاتی ہے جہاں سورج بھی اس کو ایک تماشائی سے زیادہ محسوس نہیں ہوتا. دن کی کڑی دھوپ میں مادھو کا خیال ایک متحرک سایہ تھا جس کے نیچے وہ بے معنی طور پر دوڑ رہی تھی وہ دھوپ سے بھاگنا چاہتی تھی اور مادھو کا خیال اس پر سایہ فگن تھا.

''مہینے میں ایک بار مادھو پونے سے آتا تھا اور واپس جاتے ہوئے ہمیشہ سوگندھی سے کہا کرتا تھا دیکھ سوگندھی اگر تو نے پھر سے اپنا دھندا شروع کیا تو بس تیری میری ٹوٹ جائے گی. اگر تو نے ایک بار بھی کسی مرد کو اپنے یہاں ٹھہرایا تو چٹیا پکڑ کر باہر نکال دوں گا. دیکھ اس مہینے کا خرچ میں تجھے پونا پہنچتے ہی منی آرڈر کر دوں گا..... ہاں کیا بھاڑا ہے اس کھولی کا..... نہ مادھو نے کبھی پونے سے خرچ بھیجا تھا اور نہ سوگندھی نے اپنا دھندا بند کیا تھا. دونوں اچھی طرح جانتے تھے. کیا ہو رہا ہے نہ سوگندھی نے کبھی مادھو سے کہا تھا تو یہ ٹرٹر کیا کرتا ہے ایک پھوٹی کوڑی بھی دی ہے کبھی تو نے؟ اور نہ مادھو نے کبھی سوگندھی سے پوچھا تھا یہ مال تیرے پاس کہاں سے آیا ہے جبکہ میں تجھے کچھ دیتا ہی نہیں..... دونوں جھوٹے تھے. دونوں ایک ملمع کی ہوئی زندگی بسر کر رہے تھے..... لیکن سوگندھی خوش تھی. جس کو اصل سونا پہننے کو نہ ملے وہ ملمع کیے ہوئے گہنوں پر راضی ہو جاتا ہے.''

منٹو انسانی نفسیات کی جن گہرائیوں تک اتر جاتا ہے وہ اردو کے ادیبوں میں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے اس کا عمیق مشاہدہ اور اظہار کی غیر معمولی قوت اس کے افسانوی ادب کو حقیقت کے ایک دستاویز کے

ذہن جدید

حیثیت دے دیتی ہے۔ وہ کم سے کم الفاظ میں بڑی سے بڑی سچائی بیان کرنے پر قادر ہے۔ لیکن منٹو کے فن کے کمال سے اب بھی ہم دور ہیں وہ سوگندھی کے کردار کے جذباتی نشیب و فراز کا انتہائی گہرا مطالعہ کرتا ہے اور انسانی نفسیات کے ان گوشوں کو بے نقاب کرتا ہے جن پر عام طور سے ہماری نظر نہیں پڑتی اور اگر نظر پڑتی بھی ہے تو ہم اسے دیکھتے نہیں۔ اور اگر دیکھ بھی لیتے ہیں تو اس کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ انسان کا لاشعور ایک طاقتور دھار کی مانند ہے جو ہمارے پورے وجود کو بہائے لیے جا رہا ہے۔ اس طاقتور دھارے میں منٹو کے کردار بھی بہہ رہے ہیں ... واقعات و حادثات کی احمقانہ منطق ان کرداروں کو زخمی کرتی رہتی ہے۔

سوگندھی ایک رات تھک کے چور ہونے کے بعد گہری نیند سو رہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی ہے وہ ہڑبڑا کر اٹھ جاتی ہے کروٹیں بدلنے کے بعد نیند میں مدہوش وہ اٹھتی ہے اور دروازہ کھول دیتی ہے۔ رام لال دلال اس کے سامنے کھڑا ہے اور اس سے کہتا ہے۔

"اب تو میرا منھ کیا دیکھتی ہے جھٹ پٹ یہ دھوتی اتار کر پھولوں والی ساری پہن پوڈر ووڈر لگا اور چل میرے ساتھ باہر موٹر میں ایک سیٹھ بیٹھے تیرا انتظار کر رہے ہیں، چل چل ایک دم جلدی کر"

سوگندھی کی نیندیں پوری نہیں ہوئی اس کے سر میں شدید درد ہے وہ جانے کے لیے تیار نہیں لیکن پھر اسے خیال آتا ہے کہ اس کے ساتھ والی کھولی میں ایک مدراسی عورت رہتی ہے اس کا مرد ایک حادثے میں مر جاتا ہے اس کے پاس کرایے کا بندوبست نہیں ہے وہ اس کی اور اس مدراسی عورت کی لڑکی کے کرایے کے پیسوں کا وعدہ کر لیتی ہے۔ سوگندھی نے کل ہی اس کو ڈھارس دی تھی۔

"بہن چنتا نہ کر میرا مدھو پونے سے آنے ہی والا ہے میں اس سے کچھ روپیہ لے کر تیرے جانے کا بندوبست کر دوں گی۔" مادھو پونے سے آنے والا تھا لیکن روپیوں کا بندوبست تو سوگندھی ہی کو کرنا تھا اس لیے سوگندھی جانے کو تیار ہوگئی۔ اس نے پھولوں والی ساڑی پہنی اور رام لال کے ساتھ روانہ ہوگئی۔ اندھی روشنی میں گلی کے آخری سرے پر ایک موٹر نظر آرہی تھی۔

سوگندھی کی طبیعت خراب تھی لیکن وہ اپنی پڑوسی مدراسن کے لیے روپیوں کا بندوبست کرنے اپنی نیند اور آرام کا خیال بھی دل میں نہیں لائی وہ ایک اعلیٰ انسانی قدر کے لیے سیٹھ کی موٹر کی طرف بڑھ رہی تھی، سوگندھی کا انسانی کردار تیزی سے تکمیل کی طرف بڑھ رہا ہے .... وہ ساڑھے سات روپئے ایک ضرورت مند کو دینا چاہتی ہے لیکن یہ حسن عمل کا خیال، خیال خام ثابت ہوا اور سوگندھی اس خلا کی طرف بڑھی جو اس کا اور شاید ساری ایسی عورتوں کا مقدر رہے منٹو بڑی فنکارانہ چابکدستی سے سوگندھی کو اس خلائے محض کی طرف جاتا ہوا دیکھتا ہے جس سے ہم سب دہشت زدہ رہتے ہیں۔ منٹو کے قلم کا یہ حیرتناک شاہکار دیکھئے۔

"کمزور روشنی میں اس سیاہ رنگ کی موٹر کا سایہ نظر آنا اور رات کے پچھلے پہر کی بھیدوں بھری خاموشی .... سوگندھی کو ایسا لگا کہ اس کے سر کا درد فضا پر بھی چھا گیا ہے۔ ایک کسیلا پن اسے ہوا کے اندر بھی محسوس ہوتا تھا جیسے برانڈی اور ہوڑا کی باس سے وہ بھی بوجھل ہو رہی ہے۔ آگے بڑھ کر رام لال نے موٹر کے اندر بیٹھے ہوئے آدمیوں سے کچھ کہا اتنے میں جب سوگندھی موٹر کے پاس پہنچ گئی تو رام لال نے ایک طرف ہٹ کر کہا لیجئے وہ آگئی ... بڑی اچھی چھوکری ہے تھوڑے ہی دن ہوئے ہیں اسے دھندا شروع کیے ہوئے۔ پھر سوگندھی سے مخاطب ہو کر کہا سوگندھی ادھر آ۔

ذہن جدید

سیٹھ جی بلاتے ہیں۔

سوگندھی ساڑی کا ایک کنارہ اپنی انگلی پر لپیٹتی ہوئی آگے بڑھی اور موٹر کے دروازے کے پاس کھڑی ہوگئی سیٹھ صاحب نے بیٹری اس کے چہرے پاس روشن کی ایک لمحے کے لیے اس روشنی نے سوگندھی کی خمار آلود آنکھوں میں چوندھا چوندھ پیدا کی۔ بٹن دبانے کی آواز پیدا ہوئی اور روشنی بجھ گئی۔ ساتھ ہی سیٹھ کے منھ سے "اونہہ" نکلی پھر ایک دم موٹر کا انجن پھڑ پھڑایا اور کار یہ جا وہ جا۔۔۔۔"

منٹو کے فن کا کمال یہ ہے کہ اس نے ماحول اور صورت حال کی مناسبت سے الفاظ اور رنگوں کی علامتوں کو استعمال کیا ہے دھندلی روشنی سوگندھی کی داخلی کیفیت کے دھندلے پن کو ظاہر کرتی ہے۔ گاڑی کا کالا رنگ افسردگی اور رنج و دہشت کی علامت ہے۔ جو اس ماحول کو غیر انسانی بنانے کے لیے کافی ہے۔ دھندلی روشنی میں سوگندھی کا سیاہ کار کی طرف بڑھنا یہ سب مختلف موڈ اور کیفیات کی علامتی تصویر کشی ہے جو منٹو کے موقلم نے تیار کی ہے اب دیکھیے یہ زہر غم سوگندھی کی رگ و پے میں کس طرح اترتا ہے۔

"سوگندھی کچھ سوچنے بھی نہ پائی تھی کہ موٹر چل دی، اس کی آنکھوں میں ابھی تک بیٹری کی تیز روشنی گھسی ہوئی تھی وہ ٹھیک طرح سے سیٹھ کا چہرہ بھی تو نہ دیکھ سکی تھی۔ یہ آخر ہوا کیا تھا، اس اونہہ کا کیا مطلب تھا جو ابھی تک اس کے کانوں میں بھنبھنا رہی تھی۔ کیا۔۔۔ کیا"

رام لال دلال کی آواز سنائی دی پسند نہیں کیا تجھے اچھا بھئی چلتا ہوں دو گھنٹے مفت ہی میں برباد کیے۔ یہ سن کر سوگندھی کی ٹانگوں میں، اس کی باہوں میں، اس کے ہاتھوں میں ایک زبردست حرکت پیدا ہوئی۔ کہاں ہے وہ موٹر کہاں ہے وہ سیٹھ۔۔۔ تو اونہہ کا مطلب یہ تھا کہ اس نے مجھے پسند نہیں کیا۔۔۔ اس کی۔۔۔ گالی اس کے پیٹ کے اندر ہی اٹھی اور زبان کی نوک پر آکر رک گئی وہ آخر گالی کسے دیتی موٹر تو جا چکی تھی۔ اس کی دُم کی سرخ بتی اس کے سامنے بازار کے اندھیارے میں ڈوب رہی تھی۔ اور سوگندھی کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ یہ لال لال انگارہ "اونہہ" ہے جو اس کے سینے میں برمے کی طرح اترا جا رہا ہے اس کے جی میں آئی کہ زور سے پکارے او سیٹھ۔۔۔۔ او سیٹھ ذرا موٹر روکنا اپنی۔۔۔ بس ایک منٹ کے لیے۔ پر وہ سیٹھ، تھو ہے اس کی ذات پر بہت دور نکل چکا تھا۔"

اس سیٹھ نے اسے ناپسند کر کے اس کی ہتک کر دی تھی اس ہتک کے احساس نے اس کے وجود کو لرزہ براندام کر دیا تھا۔ وہ غصے اور نفرت کی آگ میں ہر چیز کو جلا دینا چاہتی تھی اس توہین کے شعلوں میں اس کا سارا ماضی جل کر راکھ ہو گیا تھا۔ آج پہلی بار اس کی توجہ اپنی ذات کی جانب ہوئی تھی اور وہ BAD FAITH کے خواب گراں سے جاگ رہی تھی اس نے اپنے ارد گرد انسانی تعلقات اور رشتوں کی جو دیواریں کھڑی کی تھیں وہ سب منہدم ہو چکی تھیں اور وہ اپنے زخمی وجود کے ساتھ کھنڈر میں کھڑی ہوئی تھی جہاں ویرانی تھی، خلا تھا، اذیت تھی اور تکلیف دہ تنہائی ایک ایسی تنہائی جس کو اب کوئی تعلق اور کوئی رشتہ اور کوئی خیال ختم نہیں کر سکتا تھا۔ ایک گہری سوچ اس کا چاروں طرف سے احاطہ کیے ہوئے تھی۔ وہ خدا کے بلند آسمان کے نیچے تنہا کھڑی تھی۔ اس کی تنہائی ناقابل برداشت ہو جاتی اگر اس کے اندر ٹوٹ پھوٹ کا شور اس کی توجہ اپنی طرف نہ کرلیتا۔ اس کے اندر ایک شور تھا جو خیالات

اور جذبات کے جوار بھاٹے سے پیدا ہو رہا تھا۔ اس کا ذہن وحشی خیالوں کی گزر گاہ بنا ہوا تھا۔ وہ سیٹھ کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینا چاہتی تھی۔ اس وحشت اور اضطراب کے عالم میں اس نے طرح طرح سے خود کو دلاسے دینے کی کوشش کی لیکن سیٹھ کے منہ سے نکلی ہوئی آواز "اونہہ" ایک آسیب کی طرح اس کے چاروں طرف ناچ رہی تھی ...

وہ خود ایک آسیب زدہ مکان بن چکی تھی جس میں انتقام، نفرت اور غصے کی بدروحوں نے قبضہ کر لیا تھا۔ اس کی معصوم خواہشات اس ویرانے میں کہیں دفن ہو چکی تھیں۔ اسی سوچ میں وہ اپنے زخمی وجود کے ساتھ کھولی کی جانب اپنے بھاری قدموں سے چل رہی تھی۔ دل اس کا اداس تھا لیکن سارا ماحول سائیں سائیں کر رہا تھا۔ سوگندھی کو جب سیٹھ کے الفاظ یاد آئے تو اس کے پیر کے انگوٹھے سے لے کر سر کی چوٹی تک گرم گرم لہریں دوڑنے لگتیں۔ اس کو کبھی اپنے آپ پر غصہ آتا تھا اور کبھی رام لال دلال پر جس نے رات کے دو بجے اسے بے آرام کیا لیکن دونوں کو بے قصور پا کر وہ پھر سیٹھ کے الفاظ یاد کرتی اور آگ بگولہ ہو جاتی۔ لیکن منٹو کا نفسیاتی تجربہ انسانی فطرت کی ان گہرائیوں تک پہنچتا ہے جہاں سائنس اور فلسفہ کبھی نہیں پہنچتے۔ کیونکہ فن انسان اور اس کی فطرت کے مظاہر کو کلیت میں دیکھتا ہے وہ نہ تجرید سے سروکار رکھتا ہے اور نہ جزوی حقیقت سے۔ وہ ادراک کے اس مقام پر فائز ہے۔ جہاں موت وحیات، خیر و شر، خوب و ناخوب اور منفی مثبت ایک ناقابل قبول تفہیم وحدت میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ ہیڈیگر اسے وجود باقی وحدت کا نام دیتا ہے اور لارنس کے نزدیک تو جسمانی اتحاد بھی وہ فطری عمل ہے جس کے ذریعہ کائنات میں وحدت کا شعور بیدار ہوتا ہے۔

منٹو زندگی بھر عورت کی فطرت کی گہرائیوں میں مثبت عناصر تلاش کرتا رہا وہ سوگندھی کے منفی جذبات کو مثبت شکل دے دیتا ہے... لیکن یہ مثبت اقدار سوگندھی اپنی آزادی سے پیدا کرتی ہے اس کا سرچشمہ خود اس کی اپنی ذات اور اس میں بہنے والا وہ دریائے محبت ہے جو ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے جانا چاہتا ہے۔ سوگندھی کی بدقسمتی یہ ہے کہ وہ ایک سماج کی ٹھکرائی ہوئی عورت ہے۔ لیکن معاشرے کی منفی قوتیں اس کی نسائی فطرت کے مثبت پہلوؤں کو مسخ کرنے میں کامیاب نہیں ہوتیں۔ منٹو ہماری توجہ اس کی جانب مبذول کرتا ہے۔ سوگندھی بڑی ملنسار تھی۔ بڑی رحمدل تھی۔ وہ پریشان حال گاہکوں کو پیسے واپس کر دیا کرتی تھی۔

" مجھ میں کیا برائی ہے سوگندھی نے یہ سوال ہر اس چیز سے کیا جو اس کی آنکھوں کے سامنے تھی۔ گیس کے اندھے لیمپ، لوہے کے کھمبے، فٹ پاتھ کے چوکور پتھر اور سڑک کی اکھڑی ہوئی بجری.... ان سب چیزوں کی طرف اس نے باری باری دیکھا۔ پھر آسمان کی طرف نگاہیں اٹھائیں جو اس کے اوپر جھکا ہوا تھا۔ مگر سوگندھی کو کوئی جواب نہ ملا جواب اس کے اندر تھا وہ جانتی تھی کہ وہ بری نہیں اچھی ہے پر وہ چاہتی تھی کہ کوئی اس کی تائید کرے۔ کوئی ... کوئی اس وقت کوئی اس کے کاندھوں پر ہاتھ رکھ کر صرف اتنا کہہ دے سوگندھی کون کہتا ہے تو بری ہے جو تجھے برا کہے وہ آپ برا ہے۔ نہیں یہ کہنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔ کسی کا اتنا کہہ دینا کافی تھا سوگندھی تو بہت اچھی ہے آج کیوں وہ بے جان چیزوں کو بھی ایسی نظروں سے دیکھتی ہے جیسے ان پر اپنے اچھے ہونے کا احساس طاری کرنا چاہتی ہے اس کے جسم کا ذرہ ذرہ کیوں ماں بن رہا تھا.... وہ ماں بن کر دھرتی کی ہر شئے کو اپنی گود میں لینے کے لیے کیوں تیار ہو رہی تھی" جامد اور بے جان چیزوں سے بھی اسے ایک لگاؤ محسوس ہو رہا تھا۔ شاید وہ ایک ہوا تھی جو چیزوں کے جانب چل رہی تھی۔ خارج کی دنیا اس کی داخلی کیفیات کا اظہار کر رہی تھی اس کے شعور کے دھارے کی تبدیلی خارجی مظاہر کو بھی تبدیل کر رہی تھی۔ اس کی غالباً یہ وجہ ہے کہ سیٹھ کی ہتک نے اس کے اپنے ہونے کا شعور بیدار کر دیا تھا اب وہ ایک شئے نہیں تھی۔ جسے جو شخص چاہے خرید سکے بلکہ اب وہ ایک فرد بن چکی تھی۔ اس میں شعور، ذات احساس

ذات اور ادراک ذات اس قدر شدید ہوگیا تھا کہ خارجی دنیا بھی اس کی زد میں آگئی تھی۔ اب وہ محض ایک طوائف نہیں بلکہ بقول سارتر قابل احترام طوائف تھی۔ اس کی توہین کی گئی تھی۔ اس توہین کو وہ ایک مثبت قوت میں تبدیل کر دیتی ہے اور شعور ذات سے بہرہ ور ہو جاتی ہے اور اپنی کھوئی ہوئی شناخت کو پالیتی ہے۔ وہ شناخت جو جسم فروشی کے بازار میں وہ گم کر چکی تھی۔ اپنے تشخص اور اپنی آزادی کی بازیافت اسے اس روحانی تجربے سے دوچار کر دیتی ہے جس کا نام ممتا ہے۔ جو عورت کی ابتدا بھی ہے اور اس کی تکمیل بھی۔ التفات کا نقطۂ عروج اور جذبے کا وہ طاقتور بہاؤ بھی جو زندگی کی بقا کی ضمانت بن جاتا ہے اور وہ قوت بھی جسے برگساں قوت حیات کا نام دیتا ہے اور سارتر جسے روح وجود کی واحد مہم جوئی سے تعبیر کرتا ہے۔ اب سوگندھی ایک آزاد فرد بن چکی ہے۔ منفی اور مثبت قوتیں اس پر حملہ آور ہوتی ہیں وہ اپنے آپ کو ایک مکمل وجودی صورت حال میں پاتی ہے اب اسے فیصلہ کرنا ہے۔ ممتا اور انتقام یہ دو جذبے اس کے پائے آزادی سے لپٹ جاتے ہیں۔ اسے کتنی زبردست آرزو تھی کہ وہ موٹر پھر ایک بار آئے اور.... اور.... نہ آئے.... بلا سے۔ وہ انہیں خیالات میں غلطاں و پیچاں اپنے گھر کی طرف بڑھنے لگتی ہے۔ وجودی صورت حال اپنے تمام مطالبات کے ساتھ اس کے ہمراہ ہو جاتی ہے۔ اس کے قدم گھر کی جانب بڑھ رہے ہیں اور اس کے خیالات میں پیکار اور ایک تصادم کی کیفیت ہے۔ وہ اضداد کا میدان کارزار بن جاتی ہے۔ جذبات کے مدوجزر میں بہتی ہوئی بالآخر وہ اپنے گھر پہنچ جاتی ہے۔ لیکن اب وہ ایک نئی صورت حال سے دوچار ہوتی ہے۔

"اسی ادھیڑ بن میں وہ دوسری منزل پر اپنی کھولی کے پاس پہنچ گئی چولی میں سے چابی نکال کر تالا کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو چابی ہوا میں گھوم گئی۔ کنڈے میں تالا نہیں تھا۔ سوگندھی نے کواڑ اندر کی طرف دبائے تو ہلکی چرچراہٹ پیدا ہوئی۔ اندر سے کسی نے کنڈی کھولی اور دروازے نے جمائی لی۔ سوگندھی اندر داخل ہو گئی.... مادھو مونچھوں میں ہنسا اور دروازہ بند کر کے سوگندھی سے کہنے لگا۔ آج تو نے میرا کہا مان ہی لیا۔ صبح کی سیر تندرستی کے لیے بڑی ہی اچھی ہوتی ہے۔"

سوگندھی نے مادھو کی باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا وہ پلنگ پر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر بعد سوگندھی نے کہا۔

"میں آج تیرا انتظار ہی کر رہی تھی۔ مادھو بڑا اسپٹایا انتظار؟ تجھے کیسے معلوم ہوا کہ میں آج آنے والا ہوں" سوگندھی نے اسے ٹالتے ہوئے کہا میں نے تجھے خواب میں دیکھا تھا۔ جس کا جواب مادھو اس طرح دیتا ہے۔

"مادھو کرسی پر سے اٹھ کر سوگندھی کے پاس بیٹھ گیا اور میں نے تجھے ٹھیک دو بجے سپنے میں دیکھا.... جیسے تو پھولوں والی ساڑھی.... ارے بالکل یہی ساڑھی پہنے میرے پاس کھڑی ہے تیرے ہاتھوں میں.... کیا تھا تیرے ہاتھوں میں.... ہاں تیرے ہاتھوں میں روپیوں سے بھری ہوئی تھیلی تھی۔ تو نے یہ تھیلی میری جھولی میں رکھ دی اور کہا مادھو تو چنتا کیوں کرتا ہے۔ لے یہ تھیلی۔ ارے تیرے میرے روپے کیا دو ہیں.... کیا سناؤں بڑی پریشانی ہے۔ بیٹھے بٹھائے ایک کیس ہوگیا ہے اب بیس تیس روپے ہوں تو.... انسپکٹر کی مٹھی گرم کر کے چھٹکارا ملے"

اس کے بعد وہ سوگندھی کی خوشامد کرنے لگتا ہے۔ مادھو کہتا ہے تھک تو نہیں گئی تو لیٹ جا میں تیرے پیر دبا دوں

سوگندھی لبٹ جاتی ہے۔ ذرا بدلے ہوئے لہجے میں کہنے لگی مادھو یہ کس موئے نے تجھ پر کیس کیا ہے جیل وہیں کا ڈر ہو تو مجھ سے کہدے بیس تیس کیا سو پچاس بھی ایسے موقعوں پر پولس کے ہاتھوں میں تھما دیئے جائیں تو فائدہ اپنا ہی ہے واپس کب جائے گا تو مادھو موقع سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔

" دوپہر کی گاڑی سے واپس جانا پڑے گا۔ اگر شام تک سب انسپکٹر کو سو پچاس نہ تھمائے تو ....

زیادہ دینے کی ضرورت نہیں۔ میں سمجھتا ہوں پچاس میں کام چل جائے گا۔ " پچاس "۔ یہ کہہ کر سوگندھی بڑے آرام سے اٹھی اور ان چار تصویروں کے پاس آہستہ آہستہ گئی جو دیوار پر لٹک رہی تھیں بائیں طرف سے تیسرے فریم میں مادھو کی تصویر تھی۔ ... تصویر اترواتے کا خیال مادھو پر اس قدر غالب تھا کہ اس کی ہر شئے تصویر سے باہر نکل نکل کر گویا پکار رہی تھی۔ ہمارا فوٹو اترے گا۔

سوگندھی کھکھلا کر ہنس پڑی .... اس کی ہنسی کچھ ایسی تیکھی اور نوکیلی تھی کہ مادھو کے سوئیاں سی چبھیں پلنگ پر سے اٹھ کر وہ سوگندھی کے پاس گیا کس کی تصویر دیکھ کر اس قدر زور سے ہنسی ہے سوگندھی نے بائیں ہاتھ کی پہلی تصویر کی طرف اشارہ کیا جو میونسپلٹی کے داروغہ صفائی کی تھی۔

ذرا دیکھ تو تھوبڑا .... کہتا تھا کہ ایک رانی مجھ پر عاشق ہو گئی تھی اونہہ یہ منہ اور مسور کی دال۔

یہ کہہ کر سوگندھی نے فریم کو اس زور سے کھینچا کہ دیوار میں سے کیل بھی پلستر سمیت اکھڑ آئی۔

مادھو کی حیرت ابھی دور نہیں ہوئی تھی کہ سوگندھی نے فریم کو کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔

دو منزلوں سے یہ فریم نیچے زمین پر گرا۔ اور کانچ ٹوٹنے کی جھنکار سنائی دی۔ سوگندھی نے اس جھنکار کے ساتھ کہا " رانی بھنگن کچرا اٹھانے آئے گی تو میرے اس راجہ کو بھی ساتھ لے جائیگی "

اس کے بعد وہ زور زور سے ہنسنے لگی۔ مادھو بڑی مشکل سے مسکرایا اور ہی ہی ہی کرنے لگا۔ سوگندھی نے اس طرح دوسری تصویر بھی اٹھائی دوسرے ہاتھ میں مادھو کی تصویر تھی۔

" مادھو اپنی جگہ سمٹ گیا ، جیسے ہاتھ اس کی طرف بڑھ رہا ہو اور ایک سیکنڈ میں فریم کیل سمیت اس کے ہاتھ میں تھا۔ زور کا قہقہہ لگا کر اس نے " اونہہ " کی اور دونوں فریم ایک ساتھ کھڑکی میں سے باہر پھینک دیئے۔ دونوں منزلوں سے جب فریم زمین پر گرے اور کانچ ٹوٹنے کی آواز آئی تو مادھو کو ایسا معلوم ہوا کہ اس کے اندر کوئی چیز ٹوٹ گئی ہے۔ بڑی مشکل سے اس نے ہنس کر کہا اچھا کیا مجھے بھی یہ فوٹو پسند نہیں تھا۔ آہستہ آہستہ سوگندھی مادھو کے پاس آئی اور کہنے لگی تجھے یہ فوٹو پسند نہیں تھا۔ پر میں پوچھتی ہوں تجھ میں ہے ایسی کونسی چیز جو کسی کو پسند آسکتی ہے۔ یہ تیری پکوڑا ایسی ناک۔ یہ تیرا بالوں بھرا ماتھا۔ یہ تیرے سوجے ہوئے نتھنے۔ یہ تیرے مڑے ہوئے کان، یہ تیرے منھ کی باس۔ یہ تیرے بدن کا میل۔ تجھے اپنا فوٹو پسند نہیں تھا۔ اونہہ ... مادھو پیچھے ہٹتا گیا۔ آخر جب وہ دیوار سے لگ گیا تو اس نے اپنی آواز میں زور دیکر کہا۔ دیکھ سوگندھی مجھے ایسا دکھائی دیتا ہے کہ تو نے پھر سے اپنا دھندا شروع کیا ہے اب تجھ سے آخری بار کہتا ہوں ... سوگندھی نے اس سے آگے مادھو کے لہجے میں کہنا شروع کیا اگر تو نے پھر سے اپنا دھندا شروع کیا تو بس تیری میری ٹوٹ جائیگی .. اس مہینے کا خرچ میں تجھے پونا پہنچتے ہی منی آرڈر کر دوں گا۔ ہاں کیا بھاڑا ہے اس کھولی کا۔ مادھو چکرا گیا سوگندھی نے کہا۔ میں

تجھے بتاتی ہوں پندرہ روپیے بھاڑا ہے اس کھولی اور دس روپیے بھاڑا ہے۔ میرا.... پہلے تیرے میرے درمیان دس روپیے بجتے تھے اور پچاس بج رہے ہیں.... یہ کہہ کر سوگندھی نے مادھو کی ٹوپی انگلی سے ایک طرف اڑا دی مادھو کو یہ حرکت بڑی ناگوار گذری اس نے بڑے کرڑے لہجے میں کہا، سوگندھی".... سوگندھی نے تیز لہجے میں کہا سوگندھی کے بچے تو آیا کس لیے یہاں.... تیری ماں رہتی ہے اس جگہ جو تجھے پچاس روپیے دے گی یا تو کوئی ایسا بڑا گبرو جوان ہے جو میں تجھ پر عاشق ہو گئی ہوں.... کتے کمینے مجھ پر رعب گانٹھتا ہے؟ میں تیری رکھیل ہوں کیا.... بھک منگے تو اپنے آپ کو سمجھ کیا بیٹھا ہے میں پوچھتی ہوں تو ہے کون چور یا جیب کترا اس وقت تو میرے مکان میں کرنے کیا آیا ہے بلاؤں پولیس والوں کو؟ پونے میں تجھ پر کیس ہو نہ ہو یہاں تو تجھ پر کیس کھڑا کر دوں.... بھاگ یہاں سے ورنہ.... سوگندھی کی بلند آواز سن کر اس کا خارش زدہ کتا جو سوکھے ہوئے چپلوں پر منھ رکھے سو رہا تھا ہڑبڑا کر اٹھا اور مادھو کی طرف منھ اٹھا کر بھونکنا شروع کر دیا.... مادھو ڈر گیا گری ہوئی ٹوپی اٹھانے کے لیے وہ جھکا تو سوگندھی کی گرج سنائی دی "خبردار.... پڑی رہنے دے وہیں۔ تو جا تیرے پونا پہنچتے ہی میں اس کو منی آرڈر کر دوں گی یہ کہہ کر وہ اور زور سے ہنسی اور ہنستی ہنستی بید کی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کے خارش زدہ کتے نے بھونک بھونک کر مادھو کو کمرے سے باہر نکال دیا۔ سیڑھیاں اتار کر جب کتا اپنی ٹنڈ منڈ دم ہلاتا سوگندھی کے پاس واپس آیا اور اس کے قدموں کے پاس بیٹھ کر کان پھڑپھڑانے لگا تو سوگندھی چونکی.... اس نے اپنے چاروں طرف ایک ہولناک سناٹا دیکھا۔ ایسا سناٹا جو اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ایسا لگا کہ ہر شئے خالی ہے.... یہ خلاء جو اچانک سوگندھی کے اندر پیدا ہو گیا تھا۔ اسے بہت تکلیف دے رہا تھا۔ اس نے کافی دیر تک اس خلاء کو بھرنے کی کوشش کی مگر بے سود وہ ایک ہی وقت میں بے شمار خیالات اپنے دماغ میں ٹھونستی تھی۔ مگر بالکل چھلنی کا سا حساب تھا۔ ادھر دماغ کو پُر کرتی تھی ادھر وہ خالی ہو جاتا تھا۔ بہت دیر تک وہ بید کی کرسی پر بیٹھی رہی۔ سوچ بچار کے بعد جب اس کو اپنا دل بہلانے کا کوئی طریقہ نہ ملا تو اس نے اپنے خارش زدہ کتے کو گود میں اٹھایا اور ساگوان کے چوڑے پلنگ پر اسے پہلو میں لٹا کر سو گئی۔"

منٹو کی کہانی ایک بہاؤ کی حیثیت رکھتی ہے جس میں سارے کردار بہتے ہوئے اپنے اپنے انجام تک پہنچ جاتے ہیں سوگندھی چونکہ BAD FAITH کی نیند سے جاگ اٹھی تھی اس لیے وہ آزاد ہو گئی تھی۔ وہ اپنی آزادی کا استعمال مادھو کو معاف کر کے بھی کر سکتی تھی لیکن ہتک کی تکلیف اس کے احساس کے دروازے پر بار بار دستک دے رہی تھی۔ اس لیے اس نے انتقام اور ہتک کا راستہ اختیار کیا اپنے نفسیاتی اور جذباتی توازن کو قائم کرنے کے لیے۔ لیکن وجودی جسے فرد کی تنہائی کہتے ہیں اس کا تجربہ اسے پہلی بار اس لیے ہوا کہ وہ فرد بن چکی تھی اور اس نے اپنے چاروں طرف جو جھوٹے رشتے قائم کر رکھے تھے وہ بکھر گیے اور وہ اکیلی رہ گئی جو اس کے وجود کی اصلی و بنیادی صورت حال تھی۔ سارتر نے شعور کے خلا کی طرف جو ہماری توجہ دلائی ہے سوگندھی نے بھی اس کا تجربہ کیا خیالات آتے تھے لیکن اس کے شعور کا خلاء پُر نہیں ہو پاتا تھا۔ شعور اپنی مقصودیت اور خلاء کے ساتھ ہمارے سامنے موجود ہے۔ سوگندھی نے مادھو

کو دھتکار کر نکالنے کا فیصلہ اس لیے کیا کہ اب اس کی قوت فیصلہ واپس آچکی تھی وجودی صورت حال اپنے تمام تقاضوں کے ساتھ اس کے سامنے آگئی تھی۔ جس سے وہ اس لیے گزر گئی کہ وہ آزاد تھی وہ فیصلہ کر سکتی تھی۔ اور اس نے فیصلہ کیا اب وہ فیصلہ اور اس کے مضمرات ہمیشہ اس کے ساتھ رہیں گے وجودی صورت حال کو ماضی میں تبدیل کر کے فرد اس میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا کیونکہ بقول سارتر یہ وجودی صورت حال مطلق بن جاتی ہے۔

منٹو کی کہانی کا وجودی نقطہ نظر سے مطالعہ کوئی نئی بات اس لیے نہیں ہے کہ دوستوو سکی، ٹالسٹائی، کافکا اور شیکسپیر کا مطالعہ بھی وجودی افکار کی روشنی میں کیا جا چکا ہے۔ منٹو ایک سچا فنکار تھا اس نے فرد کی نفسیات اور اس کے دوسرے پہلوؤں کا بڑی گہرائی سے تجزیہ کیا ہے اس کے کردار لافانی ہیں اور فرد کی سائیکی کے مختلف جہات ۔ ہم پر روشن کرتے ہیں۔

منٹو کے بعد کہانی کا فن بہت آگے جا چکا ہے اینٹی ناول اور شعور کی رو کے بعد کافکا، ہیمنگوے، البرٹ کامیو، اور سارتر کی کہانیاں اور ناول ہم پر ایک ایسی کائنات منکشف کرتے ہیں جو انسان کی بنیادی صورت حال یعنی احساس تنہائی بلکہ مابعد الطبیعاتی تنہائی کی اساس ہے۔ منٹو اپنے تخلیقی وجدان کی روشنی میں اس تنہائی کو بڑی شدت سے محسوس کرتا ہے اور اپنے کرداروں میں منتقل کر دیتا ہے لیکن ناول، فن اور ٹیکنیک کے اعتبار سے بہت ارتقائی مراحل طے کر چکا ہے . . . . اور منٹو کو ساختیت پسند بھی حقیقت پسندی سے آگے نہیں لے جا سکتے ۔ کیونکہ منٹو اول و آخر حقیقت پسند ہے لیکن تفہیم و تعبیر کی جہت کھلی ہے اور ساختیت نے تو اس جہت کو ایک شاہراہ میں تبدیل کر دیا ہے جس پر چل کر ہم منٹو کے کرداروں کے مختلف روپ دیکھ سکتے ہیں۔ ایک روپ اس مضمون میں بھی پیش کیا گیا ہے۔ ممکن ہے آپ کو اس سے اتفاق نہ ہو لیکن میرے حق تعبیر سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ منٹو کی کہانیوں سے ہم لطف اندوز ہو سکتے ہیں نئے تناظر میں ان کا مطالعہ کر سکتے ہیں کیونکہ متن کی معنویت ایک بہتے ہوئے دریا کی طرح ہے جس سے استفادہ آپ بھی کر سکتے ہیں۔ اور میں بھی۔ میں تو اپنا حق استعمال کر چکا ہوں اب آپ کی باری ہے یعنی اس مضمون کے اس قاری کی جس کی واپسی کا مژدہ ساختیت پسند سنا رہے ہیں۔

ماخذ۔ دریافت۔ کراچی

مجھے آپ افسانہ نگار کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ اور عدالتیں ایک فحش نگار کی حیثیت سے۔ حکومت کبھی کمیونسٹ کہتی ہے اور کبھی ملک کا بہت بڑا ادیب۔ کبھی میرے لئے روزی کے دروازے بند کئے جاتے ہیں کبھی کھولے جاتے ہیں۔ کبھی مجھے غیر ضروری انسان قرار دے کر "مکان باہر" کا حکم دیا جاتا ہے کبھی موج میں آ کر یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ نہیں تم "مکان اندر" رہ سکتے ہو میں پہلے بھی سوچتا تھا۔ اب بھی سوچتا ہوں کہ میں کیا ہوں۔ اس ملک میں جسے دنیا کی سب سے بڑی اسلامی سلطنت کہا جاتا ہے۔ میرا مقام کیا ہے میرا مصرف کیا ہے۔

آپ اسے افسانہ کہہ لیجئے۔ مگر میرے لئے یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ میں ابھی تک خود کو اپنے ملک میں جسے پاکستان کہتے ہیں۔ اور جو مجھے بہت عزیز ہے۔ اپنا صحیح مقام تلاش نہ کر سکا یہی وجہ ہے کہ میری روح بے چین رہتی ہے یہی وجہ ہے کہ میں کبھی پاگل خانے میں اور کبھی ہسپتال میں ہوتا ہوں۔ پاکستان میں اپنا صحیح مقام میں ابھی تک معلوم نہیں کر سکا۔ لیکن بزعم خود یہ سمجھتا ہوں کہ میری شخصیت بہت بڑی ہے۔ اردو ادب میں میرا نام بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ خوش فہمی نہ ہو تو زندگی اور بھی اجیرن ہو جائے۔

• سعادت حسن منٹو •

ذہن جدید

منٹو کے افسانوں میں کلائمکس کی توسیع

نشافع قدوائی

موضوع کے حوالے سے فن پارے کی قدر و قیمت تعین اردو تنقید کی عام روش اور مقبول عام طریقہ کار ہے یہی سبب ہے کہ تمام اصناف سخن علی الخصوص فکشن کی تنقید ایک آدھ استثنائی مثال سے قطع نظر موضوع کے PARA PHRASING سے عبارت اور مواد کے توسط سے VALUE JUDGEMENT سے گراں بار نظر آتی ہے۔ نقد شعر میں تو بعض فنی نکات اور فن پارہ کی ظاہری ساخت کے عناصر ترکیبی زیر بحث آ بھی جاتے ہیں مگر فکشن کے مطالعہ میں پلاٹ، کردار، راوی اور زبان کے استعمال سے متعلق سرسری تذکرہ سے قطع نظر تعین قدر میں موضوعاتی حسن و قبح اساسی کردار ادا کرتا ہے۔ شاید اس کم مائگی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ناول سے متعلق خود مکتفی تنقیدی نظریات بہت کم ہیں اور ان نظریات کا کم و بیش اطلاق افسانہ پر بھی کیا جاتا ہے۔ افسانہ کی تنقید کے علاحدہ اور خود مکتفی اصولوں کی تدوین فکشن تنقید کا ایک اہم مسئلہ ہے اور یہ کہنا بھی بے جا نہ ہوگا کہ افسانہ سے متعلق کوئی مستحکم اور آزاد تنقیدی تھیوری نہیں ہے۔ ہر چند کہ یہ بات تسلیم کی جا چکی ہے کہ افسانہ اور ناول میں خط امتیاز صرف ضخامت کی بنیاد پر نہیں کھینچا جا سکتا ہے بلکہ بعض ایسی صنفی خصوصیات GENETIC CHARACTERISTICS بھی ہیں جن کی بنا پر ان اصناف کو ایک دوسرے سے ممتاز اور ممیز کیا جا سکتا ہے۔

موضوع پر غیر ضروری اصرار کے باعث یہ مفروضہ ادبی تنقید میں ایک مسلمہ اصول کی حیثیت اختیار کر گیا ہے کہ منٹو کے یہاں موضوعاتی تنقید کا بڑی حد تک فقدان ہے اور انہوں نے زیادہ تر ایک ہی موضوع (جنس) کو مختلف زاویوں سے اپنے مطالعہ کا معروض بنایا ہے نیز ان کے بعض مشہور اور نمائندہ افسانوں ٹھنڈا گوشت، دھواں، کالی شلوار، ہتک، بو، موذیل اور سڑک کے کنارے وغیرہ میں جنسی تلذذ کا پہلو بہت نمایاں ہے۔ اس تنقیدی مفروضہ کی مقبولیت نہ صرف ناقدین کی سہل انگاری کو آشکار کرتی ہے بلکہ منٹو کی تعین قدر کو بھی دشوار گذار بناتی ہے۔ منٹو کی تخلیقات کے ہیئتی خصائص پر اب تک بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ محمد حسن عسکری، ممتاز شیریں اور وارث علوی تک نے منٹو کے تصور انسان اور خیر و شر کے تصور وغیرہ موضوعات پر تو تفصیلی اور سیر حاصل گفتگو کی ہے تاہم منٹو کے اسلوبی اور ہیئتی خصائص پر دلجمعی سے بحث نہیں کی۔ اس تنقیدی رائے کے صائب ہونے میں کلام نہیں ہے کہ مربوط اور چست پلاٹ اور غیر متوقع بالڈرامائی انجام منٹو کے افسانوں کے مابہ الامتیاز عناصر ہیں۔ منٹو پر بعض مغربی اور روسی ادیبوں کے اثرات کا تذکرہ بھی کیا گیا۔ بعض ناقدین نے منٹو کے افسانہ پر روسی ادیبوں، چیخوف اور گورکی وغیرہ کے اثرات کی نشان دہی کی تو بعض معتبر ناقدین نے موپاساں، او ہنری، ایڈگر ایلن پو اور ہیمنگوے کے افسانوں اور منٹو کی بعض کہانیوں کا تقابلی مطالعہ کر کے یہ نتیجہ نکالا کہ منٹو نے مذکورہ مغربی ادیبوں سے کہانی کہنے کے گر سیکھے ہیں اور یہ اثرات مواد اور تکنیک دونوں سطحوں پر نمایاں ہیں۔ منٹو نے خود بھی اپنے ایک افسانہ "پریشانی کے سبب" میں ایڈگر ایلن پو کا ذکر کیا ہے۔

"یہ تو بالکل ایڈگر ایلن پو کا افسانہ معلوم ہوتا ہے۔ یہ زہرہ بالکل پو کے افسانوں کے غیر متوقع انجام کی

طرح داستان میں آئی ہے. یہ عورت کون ہے؟" پو کے اس ذکر نے ناقدین کے اس نقطۂ نظر کو مزید اعتبار بخشا کہ منٹو نے پو کی طرح شعوری طور پر اپنے افسانے غیر متوقع انجام پر استوار کیے اور قارئین کو دانستہ طور پر استعجاب میں ڈالنے اور انہیں ششدر کرنے کی کوشش کی. یہ درست ہے کہ منٹو نے پو اور موپاساں کی طرح صرف بے جان تقلید کو اپنا مطمع نظر نہیں بنایا بلکہ اپنے افسانہ میں ٹیکنک کے نئے تجربے کیے گو کہ بیشتر ناقدین نے UNEXPECTED ENDING کو منٹو کے فن کی ایک لازمی صفت کے طور پر قبول کر لیا بہتر ہوتا اگر ناقدین منٹو کے افسانوں کے متن سے براہ راست استنباط کر کے یہ نتیجہ نکالتے. منٹو نے غیر متوقع انجام کی ٹیکنک کثرت سے استعمال کی ہے مگر انہوں نے بالکل ایک نئے طرح کے کلائمکس یعنی EXTENDED CLIMAX.. کو فنکارانہ شعور اور فنی چابکدستی کے ساتھ استعمال کیا یہ ٹیکنک اردو افسانہ نگاروں نے شاذ ہی استعمال کی ہے EXTENDED CLIMAX سے مراد یہ ہے کہ افسانہ بظاہر اپنے منطقی انجام LOGICAL CONCLUSION پر منتج نہ ہو بلکہ کلائمکس گھماؤ دار MULTI-FOLD.. ہو اور کلائمکس کا ہر مرحلہ مرکزی موضوع کے کسی نئے ابعاد یا نئی جہت کو آشکار کرتا ہو EXTENDED CLIMAX کی ٹیکنک افسانہ پر کس طرح اثر انداز ہوتی ہے. اس کا استعمال افسانہ کو بہتر بناتا ہے یا کمزور ان سوالات سے قطع نظر اس امر سے انکار محال ہے کہ یہ ایک اہم اور قابل لحاظ ٹیکنک جو بعض مغربی افسانہ نگاروں نے علی الخصوص بورخیس نے کثرت سے استعمال کی ہے. منٹو کی شہرۂ آفاق غیر متوقع یا ڈرامائی انجام کی ٹیکنک بھی بعض افسانوں میں کلائمکس کی توسیع کی طرح کی ہے اور اس ٹیکنک کے استعمال کی نوعیت کیا ہے اور اس سے افسانے کے مرکزی موضوع کا کوئی نیا ابعاد روشن ہوتا ہے یا نہیں ان اہم سوالات پر غور کرنے کے لیے منٹو کے افسانوں کے انجام کا گہرا مطالعہ ضروری ہے. طوالت کے خوف کی وجہ سے منٹو کے چار افسانوں کو جن میں ان کا ایک مشہور اور نمائندہ افسانہ ہتک بھی شامل ہے، سر دست مطالعہ کا موضوع بنایا جا رہا ہے اور اس سوال پر بھی غور کیا جائے گا کہ افسانہ اپنے منطقی انجام پر اختتام پذیر کیوں نہ ہوا اور افسانہ کا کوئی منطقی انجام جس کی طرف اکثر عنوان یا پیراگیراف اشارہ کرتا ہے، ہوتا بھی ہے یا نہیں۔

> منٹو کی شہرۂ آفاق غیر متوقع یا ڈرامائی انجام کی ٹیکنک بھی بعض افسانوں میں کلائمکس کی توسیع کی طرح ہے۔

"چوری" منٹو کے ابتدائی دور کا ایک مشہور افسانہ ہے. اس افسانہ کا پلاٹ یہ ہے کہ ایک آوارہ گرد بیک صفت بوڑھا اپنی آپ بیتی بچوں کو کہانی کے طور پر سناتا ہے. بوڑھا بتاتا ہے کہ وہ ایک اچھے گھرانے میں پیدا ہوا تھا اور اسے بچپن سے پڑھنے کا بہت شوق تھا اور زیادہ تر افسانے کی کتابیں اس کے زیر مطالعہ رہتی تھیں. وہ ایک کتب فروش سے اکثر کتابیں خریدا کرتا تھا ایک دن اس کی دکان پر اسے اپنے ایک محبوب مصنف کی کتاب نظر آئی مگر اس کی جیب خالی تھی. وہ ضبط نہیں کر پایا اور اس نے کتاب چرا لی. دکاندار کو شک ہو گیا اور اس نے اس کا تعاقب کیا. وہ ڈر گیا اور اسے دکاندار نے پکڑ لیا. اس کے آگے کی کہانی منٹو کے زبانی سنیے؟؟ "کتب فروش نے مجھے پولیس کے حوالے نہ کیا اور اپنی کتاب لے لی اور نصیحت کرنے کے بعد چھوڑ دیا. بوڑھے نے اپنے آنسو کھردرے کمبل سے خشک کیے. خدا اس کو جزائے خیر دے. میں عدالت کے دروازے سے تو بچ گیا مگر اس واقعے کی والد اور اسکول کے لڑکوں کو خبر ہو گئی. والد مجھ پر سخت خفا ہوئے لیکن انہوں نے آخر میں مجھے معاف کر دیا. تین روز مجھے اس ندامت کے باعث بخار آتا رہا اس کے بعد میں نے دیکھا میرا دل کسی کروٹ آرام نہیں لیتا ہے اور مجھ میں اتنی قوت

نہیں ہے کہ میں لوگوں کے سامنے اپنی نگاہیں اٹھا سکوں تو میں شہر چھوڑ کر وہاں سے ہمیشہ کے لیے روپوش ہو گیا۔ اس وقت سے لے کر اب تک میں نے مختلف شہروں کی خاک چھانی ہے ہزاروں مصائب برداشت کیے ہیں صرف اس کتاب کی چوری کی وجہ سے جو مجھے تا دم مرگ نادم و شرمسار رکھے گی"۔ افسانہ کے عنوان چوری اور پھر پیراگراف میں آوارہ گرد بوڑھے کے احوال کے مختصر تذکرے کی مناسبت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان سطروں پر افسانہ ختم ہو گیا ہوگا۔ منٹو نے اپنے بیشتر افسانوں کے عنوانوں اور ابتدائی چند جملوں سے FORESHADOWING کا کام لیا ہے یعنی صرف عنوان اور ابتدائی جملوں سے افسانہ کے اختتام یا اس کے مرکزی موضوع کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اگر منٹو اس مرحلہ پر یعنی بظاہر منطقی انجام پر افسانہ ختم کر دیتے تو یہ اسباب و علل پر استوار ایک بے جان بیانیہ افسانہ ہوتا ہے لہٰذا منٹو نے کلائمکس کی توسیع کی اور بوڑھے کی زبانی کہانی دوبارہ شروع کی "اس آوارہ گردی کے دوران میں، میں نے اور بھی بہت سی چوریاں کیں۔ ڈاکے ڈالے اور ہمیشہ پکڑا گیا مگر میں ان پر نادم نہیں ہوں۔ مجھے فخر ہے"، بوڑھے کی دھندلی آنکھوں میں پھر پہلی سی چمک نمودار ہو گئی اور اس نے الاؤ کے شعلوں کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنا شروع کر دیا، "ہاں مجھے فخر ہے" یہ الفاظ اس نے تھوڑے توقف کے بعد دوبارہ کہے۔ "الاؤ میں آگ کا ایک شعلہ بلند ہوا اور ایک لحظہ فضا میں تھرتھرا کر وہیں سو گیا۔ بوڑھے نے شعلے کی جرأت دیکھی اور مسکرا دیا۔ پھر لڑکوں سے مخاطب ہو کر کہنے لگا "کہانی ختم ہو گئی ہے اب تم جاؤ تمہارے ماں باپ انتظار کر رہے ہوں گے۔" اس مرحلہ پر بھی کہانی ختم ہو سکتی تھی تاہم منٹو نے کلائمکس کو ایک بار پھر EXTEND کیا اور لکھا (ایک لڑکے) مسعود نے سوال کیا "مگر آپ کو دوسری چوریوں پر کیوں فخر ہے؟"

"فخر کیوں ہے؟" بوڑھا مسکرا دیا "اس لیے کہ وہ چوریاں نہیں تھیں اپنی مسروقہ چیزوں کو دوبارہ حاصل کرنا چوری نہیں ہوتی میرے عزیز بڑے ہو کر تمہیں اچھی طرح معلوم ہو جائے گا۔"

"میں سمجھا نہیں۔"

"ہر وہ چیز جو تم سے چرالی گئی تمہیں حق حاصل ہے کہ اسے ہر ممکن طریقے سے اپنے قبضے میں لے آؤ۔ پر یاد رہے تمہاری کوشش کامیاب ہونی چاہیئے ورنہ ایسا کرتے ہوئے پکڑے جانا اور اذیتیں اٹھانا عبث ہے۔" بظاہر اس مقام پر افسانہ کا DEAD-END نظر آتا ہے مگر منٹو نے کلائمکس کی ایک بار پھر توسیع کر کے نہ صرف غیر متوقع انجام تک رسائی حاصل کی بلکہ افسانہ کے مرکزی موضوع چوری اور نئی نسل (جس کے نمائندہ کہانی سننے والے بچے ہیں) کے مستقبل کے تئیں اپنے زاویۂ نظر کی ایک نئی جہت کو آشکارا کیا۔ افسانہ کا اصل اختتام ملاحظہ کریں۔

"لڑکے اٹھے اور باجی کو شب بخیر کہتے ہوئے کوٹھری کے دروازے سے باہر چلے گئے۔ بوڑھے کی نگاہیں ان کو تاریکی میں گم ہوتے دیکھتی رہیں۔ تھوڑی دیر اس طرف دیکھنے کے بعد وہ اٹھا اور کوٹھری کا دروازہ بند کر کے بولا "کاش کہ یہ بڑے ہو کر اپنی کھوئی ہوئی چیزیں واپس لے سکیں۔" بوڑھے کو خدا معلوم ان لڑکوں سے کیا امید تھی۔

آخری جملے "بوڑھے کو خدا معلوم ان لڑکوں سے کیا امید تھی"، منٹو کے فن سے متعلق اس تصور کی تکذیب کرتا ہے کہ منٹو کے بیشتر افسانوں میں THIRD PERSON NARRATOR نظر آتا ہے جو کرداروں کے عمل پر حاوی نہیں ہے اور ہمیشہ غیر جانبدارانہ معروضی نقطۂ نظر کے ساتھ افسانہ بیان کرتا ہے۔ چوری کی آخری سطریں خیر مطلق راوی OMINIENT NARRATOR کی موجودگی ظاہر کرتی ہیں۔ منٹو کا راوی بہت سی اطلاعات

فراہم کرنے کے باوجود کرداروں کے عمل پر حاوی نظر نہیں آتا اکثر یہ راوی واحد متکلم شاہد ہوتا ہے اس طرح منٹو نے THIRD PERSON FRAME میں ایک نیا عنصر شامل کیا ہے جیسے LE SILE A FLEMMING نے منٹو پر اپنے مونوگراف ANOTHER LONELY VOICE میں MANTO PERSONA سے تعبیر کیا ہے۔

منٹو نے اپنے بعض افسانوں میں کلائمکس کی توسیع صرف مرکزی موضوع کے مختلف اور متضاد ابعاد روشن کرنے سے پہلے استعمال نہیں کی ہے بلکہ اکثر بیانیہ کو اسباب و علل CAUSE OF EFFECT کی قید سے آزاد کرانے کے لیے بھی استعمال کی ہے۔ ایک دوسرا افسانہ ''چوہے دان'' بھی اسی تکنیک میں لکھا گیا ہے۔ اس افسانہ میں دو دوستوں شوکت اور ارشد کی کہانی ایک تیسرے دوست کی زبان FIRST PERSON میں بیان کی گئی ہے افسانہ کا پلاٹ یہ ہے کہ شوکت کو چوہے پکڑنے میں بڑی مہارت حاصل تھی وہ اسے ایک فن سمجھتا تھا اس نے چوہے پکڑنے کی بعض ترکیبیں اور اصول وضع کر لیے تھے وہ ارشد کو بتاتا ہے کہ چوہے دان کبھی ایسی جگہ نہ رکھنا چاہیئے جہاں اکثر چوہے نظر آتے ہوں، بل کے قریب چوہے دان رکھنے سے چوہے چوکنا ہو جائیں گے اور وہ کبھی اس نئی چیز کے قریب نہ جائیں گے۔ چوہے دان میں تلی ہوئی مچھلی کا ٹکڑا لگانا چاہیئے، چوہے دان جگہ جگہ بدل بدل کر لگانا چاہیئے اور چوہا پکڑنے کے بعد چوہے دان کو گرم پانی سے دھو لینا چاہیئے تاکہ اس کی بو ختم ہو جائے اگر بو باقی رہے گی تو دوسرا چوہا نہیں آئے گا۔ ارشد یہ ترکیبیں بڑی دلچسپی سے سنتا ہے اور پھر اپنے گھر آ کر ان کو آزماتا ہے۔ ارشد کے پڑوس میں ایک بڑی خوبصورت اور نفاست پسند لڑکی سلیمہ رہتی ہے جس پر ارشد بری طرح مرتا ہے مگر وہ اسے لائق اعتنا نہیں سمجھتی ہے۔ سلیمہ ایک دن ارشد کے گھر آتی ہے تو اس وقت ارشد چوہے پکڑنے کا اہتمام کر رہا ہوتا ہے اور گھر میں کوئی نہیں ہوتا ہے۔ ارشد نفاست پسند سلیمہ کو چوہے پکڑنے کے فن پر ایک لیکچر دے کر مرعوب کر لیتا ہے یہ لیکچر شوکت سے حاصل کردہ معلومات پر مبنی تھا۔ ارشد اسے بتاتا ہے کہ اگر چوہے دان گرم پانی سے دھو کر لگایا جائے اور کانٹے میں مچھلی کا ٹکڑا پھنسایا جائے تو پندرہ منٹ میں چوہا پھنس جائے گا۔ سلیمہ یہ بات نہیں مانتی ہے اور آخر میں اس پر شرط لگانے سے پہلے تیار ہو جاتی ہے اور کہتی ہے '' میں ہر شرط باندھنے کے لیے تیار ہوں۔ اس لیے کہ ہار آپ ہی کی ہوگی''۔
ارشد فوراً کہتا ہے '' تو یہ وعدہ کیجئے کہ اگر میں نے چوہا پکڑ لیا تو آپ سے جو چیز میں طلب کروں گا آپ بخوشی دے دیں گی۔

سلیمہ نے جواب دیا'' مجھے منظور ہے''۔

اس مکالمہ کے بعد چوہے دان لگا دیا جاتا ہے اور ١٢½ منٹ بعد چوہا پھنس جاتا ہے۔ اس سے آگے کا قصہ ارشد کی زبانی ملاحظہ کریں '' سوا بارہ منٹ ہو گئے ساڑھے بارہ ہوئے کہ دفعتاً کھٹ کی آواز بلند ہوئی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ چوہے دان میرے سینے میں بند ہوا ہے۔ ایک لمحہ کے لیے دھڑکن بند ہو گئی ہے لیکن فوراً ہی ہم دونوں اٹھے دوڑ کر کمرے میں آ گئے اور چوہے دان کے تاروں میں سے جب مجھے ایک موٹے چوہے کی تھوتھنی اور اس کی لمبی لمبی مونچھیں نظر آئیں تو میں خوشی سے اچھل پڑا پاس ہی سلیمہ کھڑی تھی اس کی طرف میں نے فتح مند نظروں سے دیکھا اور جھٹ پٹ

منٹو نے افسانوں میں کلائمکس کی توسیع بیانیہ کو اسباب و علل کی قید سے آزاد کرانے کے لیے بھی استعمال کی ہے

اس کے جبرن سے کھلے ہوئے ہونٹوں کو چوم لیا،،

یہاں افسانہ ختم ہو سکتا تھا کیونکہ عنوان چوہے دان اور پھر ابتدائی سطروں میں یہ ذکر کہ سلیمہ رام ہو گئی ہے کا تقاضا تھا کہ کہانی یہاں ختم ہو جائے کہ چوہا بھی پھنس گیا اور سلیمہ بھی ہاتھ آگئی مگر منٹو نے یہاں افسانہ ختم نہیں کیا اور آگے لکھا ہے

" یہ سب کچھ اس قدر جلدی میں ہوا کہ سلیمہ چند لمحات تک بالکل خاموش رہی لیکن اس نے خفگی آمیز لہجے میں مجھ سے کہا "یہ کیا بے ہودگی ہے" اس وقت خدا معلوم میں کس موڈ میں تھا کہ ایک بار میں نے پھر اسی افراتفری میں اس کا بوسہ لے لیا اور کہا "اجی مولانا آپ نے شرط ہاری ہے" اور تیسری مرتبہ اس نے اپنے ہونٹ بوسے کے لیے خود پیش کر دیئے۔ جس طرح چوہا ہاتھ آیا اسی طرح سلیمہ بھی ہاتھ آگئی ،، ان جملوں سے تو ایسا لگتا ہے کہ یہی کہانی کا انجام ہے کہ منٹو کے بیشتر افسانوں کے آخری جملے افسانے کے THEME کو ایک جملہ میں SUM -UP کر دیتے ہیں لیکن افسانہ یہاں بھی ختم نہیں ہوتا منٹو کلائمکس کی توسیع کر کے ایک نیا موڑ دیتے ہیں اور راوی واحد متکلم کے اس تبصرے پر افسانہ اختتام پذیر ہوتا ہے ۔

" یہ داستان سن کر مجھے بہت لطف آیا لیکن افسوس بھی ہوا اس لیے کہ شوکت اس لڑکی سلیمہ کی محبت میں بری طرح گرفتار ہے "۔

راوی کا تبصرہ نہ صرف EXTENDED CLIMAX کی مثال ہے بلکہ غیر متوقع انجام کو بھی ظاہر کرتا ہے۔

کلائمکس کی توسیع کی ایک اور مثال منٹو کا ایک افسانہ جی آیا صاحب ہے، جو بعد میں "قاسم" کے نام سے بھی شائع ہوا ہے۔ اس افسانہ میں ایک گھریلو نوکر قاسم کی کہانی بیان کی گئی ہے جو ایک ریلوے بابو کے یہاں ملازم ہے۔ قاسم کام کی زیادتی سے بہت پریشان ہے گھر کا چھوٹا بڑا ہر کام ۱۰، ۱۱ برس کے قاسم کو کرنا پڑتا ہے۔ مہمانوں کی آمد کی صورت میں کام بہت بڑھ جاتا ہے۔ قاسم کام سے عاجز آجاتا ہے ایک دن مہمان آنے والے ہوتے ہیں کام بڑھ جاتا ہے قاسم ایک ترکیب سوچ لیتا ہے وہ اپنی انگلی چاقو سے زخمی کر لیتا ہے مالک اسے ڈانٹتے ہیں مگر تھوڑی دیر کی تکلیف کے بعد وہ کام سے بچ جاتا ہے قاسم کو یہ ترکیب بہت کارآمد معلوم ہوئی اور اس نے کئی بار اپنی انگلی زخمی کی اور ایک بار جب اس نے بلیڈ سے اپنی انگلی کاٹ لی تو ریلوے بابو ضبط نہ کر سکے اور اسے ملازمت سے نکال دیا۔ اس کے آگے کی کہانی دیکھیں "وہ قاسم کو افسوس نہ ہوا بلکہ اسے خوشی محسوس ہوئی کہ چلو کام سے چھٹی مل گئی۔ گھر سے نکل کر وہ اپنی زخمی انگلی سے بے پروا سیدھا چوپاٹی پہنچا اور وہاں ساحل کے پاس ایک بینچ پر لیٹ گیا اور خوب سویا، قاسم کی کہانی کا یہ منطقی انجام لگتا ہے مگر افسانہ یہاں ختم نہیں ہوتا آگے کا قصہ ملاحظہ کریں ۔" چند دنوں کے بعد اس کی انگلی کا زخم بداحتیاطی کے باعث سپٹک ہو گیا، سارا ہاتھ سوج گیا مگر تکلیف بڑھتی گئی آخر قاسم خیراتی اسپتال میں داخل ہو گیا جہاں اس کا ہاتھ کاٹ دیا گیا۔ اب جب قاسم اپنے کٹے ہوئے ٹنڈ منڈ ہاتھ سے فلورا فاؤنٹین کے پاس لوگوں سے بھیک مانگتا ہے تو اسے وہ بلیڈ یاد آجاتا ہے جس نے اسے بہت بڑی مصیبت سے نجات دلائی۔ افسانہ یہاں بھی ختم ہو سکتا تھا لیکن مصنف نے کلائمکس کو ایک موڑ دیا اور افسانہ یوں ختم کیا۔ "اب وہ جس وقت چاہے سر کے نیچے اپنی گدڑی رکھ کر فٹ پاتھ پر سو سکتا ہے۔ اس کے پاس ٹین کا ایک چھوٹا سا ڈبہ ہے جس کو کبھی نہیں مانجھتا اس لیے کہ اسے انسپکٹر صاحب کے گھر کے برتن یاد آجاتے ہیں جو کبھی ختم ہونے میں نہیں آتے ۔۔۔"

(باقی ...)

قاسم جس کی زندگی بر آواز پر جی آیا صاحب ہتنے اور برتن مانجھنے گذرتی ہے آخر میں بالکل آزاد نظر آتا ہے وہ نہ تو کسی کے حکم کا تابع رہتا ہے اور نہ برتن مانجھنے کا کام کرتا ہے حتیٰ کہ وہ اپنا ایک ڈبہ بھی نہیں مانجھتا کہ اس سے ریلوے بابو کے برتنوں کی یاد تازہ ہو جاتی جو کبھی ختم نہیں ہوتے۔ ان متضاد احساسات کی ترسیل کی خاطر منٹو نے اس افسانہ کے کلائمکس کو EXTEND کیا تھا۔ ہتک منٹو کا ایک بہت مشہور اور نمائندہ افسانہ ہے اس افسانے میں بھی منٹو نے مذکورہ ٹیکنک فنکارانہ شعور کے ساتھ استعمال کی ہے۔ سوگندھی ایک جذباتی پیشہ ور طوائف ہے جو اپنے ہر گاہک سے پریم کرنے لگتی ہے گو کہ اسے قدم قدم پر دھوکے کھانا پڑتے ہیں لیکن وہ اپنی طبیعت سے مجبور ہے۔ ایک دن ایک سیٹھ اسے بلاتا ہے اور اس کا چہرہ دیکھ کر اونہہ کر دیتا ہے۔ یہ اونہہ ایک زبردست تازیانے کا کام کرتی ہے اور سوگندھی کا مرد ذات پر سے اعتبار اٹھ جاتا ہے وہ اپنی ہتک پر شدید ردِعمل کا اظہار کرتی ہے اور کمرے میں آویزاں اپنے چار عاشقوں کی تصویریں پھاڑ کر پھینک دیتی ہے۔ اس کا ایک پرانا عاشق ہونے کا حولدار مادھو آتا ہے تو وہ اس پر برس پڑتی ہے اور کہتی ہے "تو کون ہے ایسا بڑا گبرو جوان ہے جو میں تجھ پر عاشق ہو گئی ہوں۔ کتّے کمینے مجھ پر رُعب گانٹھتا ہے تو ہے کون چور یا گھٹ کترا۔ اس وقت تو میرے مکان میں کرنے کیا آیا ہے، بلاؤں پولیس کو، پونے میں کیس ہو یا نہ ہو یہاں تو تجھ پر ایک کیس کھڑا کر دوں گی"، مادھو سہم گیا دبے ہوئے لہجے میں وہ صرف اس قدر کہہ سکا "سوگندھی تجھے کیا ہو گیا ہے"، "تیری ماں کا سر تو ہوتا ہے کون ہے مجھ سے ایسے سوال کرنے والا۔ بھاگ یہاں سے ورنہ۔" اس کے خارش زدہ کتّے نے بھونک بھونک کر مادھو کو کمرے کے باہر نکال دیا۔ یہ سطریں کہانی کا منطقی انجام ہیں کہ سوگندھی نے ایک مرد (مادھو) کو ذلیل کر کے اپنی ہتک کا بدلہ لے لیا مگر منٹو نے کہانی آگے بڑھاتے ہوئے اور افسانہ کے لیے پیراگراف کے ان جملوں "میونسپل کمیٹی کا داروغہ صفائی جسے وہ سیٹھ کے نام سے پکارتی تھی، ابھی ابھی اس کی ہڈیاں پسلیاں جھنجھوڑ کر شراب کے نشے میں چور، گھر کو واپس گیا تھا" کی معنویت کو اجاگر کرنے کے لیے کلائمکس کی توسیع کی اور ان جملوں پر افسانہ اختتام پذیر ہوا "بہت دیر تک وہ سوگندھی بید کی کرسی پر بیٹھی رہی سوچ بچار کے بعد جب اسے اپنا دل بہلانے کا کوئی طریقہ نہ ملا تو اس نے اپنے خارش زدہ کتّے کو گود میں اٹھا لیا اور ساگوان کے چوڑے پلنگ پر اسے پہلو میں لٹا کر سو گئی"، خارش زدہ کتّے کو گود میں لٹانے سے مراد یہ ہے کہ اس سے فیض یاب ہونے والے تمام مرد بشمول داروغہ صفائی اپنے عمل میں خارش زدہ کتّے کے مماثل ہیں کہ ایک گاہک داروغہ صفائی کا عمل "ہڈیاں پسلیاں جھنجھوڑنے لگا"، ایک حیوانی فعل ہے جو اصلاً کتّے سے مختص ہے۔ منٹو نے کلائمکس کی توسیع کر کے "ہتک"، کو ایک نئی جہت دی ہے۔

ان مفروضات کی روشنی میں جو منٹو کے بعض افسانوں کے کلائمکس کے مطالعہ پر مشتمل ہے، یہ کہنا شاید بے جا نہ ہو کہ منٹو کی افسانوی عظمت کا راز صرف موضوع کے TREATMENT یا غیر متوقع انجام میں مضمر نہیں ہے بلکہ EXTENDED CLIMAX بھی ان کے فن کی ایک اہم صفت ہے۔ منٹو نے کلائمکس کی توسیع کی ٹیکنک موضوع کے مختلف ابعاد کی ترسیل کی خاطر استعمال کی ہے یہ ٹیکنک لازماً افسانہ کو بہتر بناتی ہے یا کمزوری کرتی ہے، یہ سوال سردست مطالعہ کا موضوع نہیں ہے ویسے بھی تنقید محض VALUE JUDGEMENT کا نام نہیں ہے۔

منٹو کے منتوب افسانے ۔ کالی شلوار ۔ دھواں ۔ بو ۔ ٹھنڈا گوشت اور کھول دو

منٹو کا فن اور اس کا جرم

رضی عابدی

آج سعادت حسن منٹو کی ادبی اور فنی حیثیت مسلّم ہے۔ اس کے بارے میں کوئی اختلاف رائے نہیں۔ وہ اردو کا عظیم ترین افسانہ نگار ہے۔ اور جسطرح اس کی تحریروں نے عام قاری کے شعور کو جھنجھوڑا ہے اس کی مثالیں کم ازکم اردو ادب میں بہت کم ملتی ہیں۔ اس کے باوجود لوگوں کو ہمیشہ اس کی شکائتیں رہیں۔ اس پر مقدمے چلائے گئے اور اسے ہر طرح سے مطعون کیا گیا۔ اس پر سب سے بڑا الزام یہ تھا کہ اس کی تحریریں فحش ہیں۔ منٹو نے بڑی وضاحت سے اور جم کر اس اس الزام کا جواب دیا۔ عدالت میں بھی اور ادب میں بھی۔ اپنے ایک مضمون "مجھے بھی کچھ کہنا ہے"۔ میں کالی شلوار کے حوالے سے اس نے زور دے کر یہ بات کہی کہ

افسانہ نگاری میرا پیشہ ہے۔ میں اس کے تمام آداب سے واقف ہوں۔ اس سے پیشتر میں اسی موضوع پر کئی افسانے لکھ چکا ہوں۔ ان میں سے کوئی بھی فحش نہیں، میں آئندہ بھی اس موضوع پر افسانے لکھوں گا جو فحش نہیں ہوں گے۔

اپنے اس موقف کی صراحت کے لئے اس نے "کالی شلوار" اور "سوگندھی" سے مثالیں پیش کیں۔ سوگندھی کے سلسلہ میں اس نے لکھا۔

یہ سلطانہ کی ایک بہن سوگندھی کی تصویر ہے۔ اس کے پاس خدا بخش کے بجائے ایک خارش زدہ کتا تھا۔ خدا بخش سلطانہ کا دل نہ بہلا سکا، مگر یہ خارش زدہ کتا سوگندھی کے بہت کام آیا۔ میں اس افسانے کے آخر میں لکھتا ہوں۔

کتا اپنی ٹنڈ منڈ دم ہلاتا ہوا سوگندھی کے پاس واپس آیا اور اس کے قدموں کے پاس بیٹھ کر کان پھڑپھڑانے لگا۔ سوگندھی چونکی اس نے چاروں طرف ایک ہولناک سناٹا دیکھا ایسا سناٹا جو اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہر شے خالی ہے۔ جیسے مسافروں سے بھری ریل گاڑی سب اسٹیشنوں پر مسافروں کو اتار کر اب لوہے کے شیڈ میں اکیلی کھڑی ہے یہ طوائف کے لئے منٹو کا استعارہ ہے۔ جسے اس نے "کالی شلوار" کی سلطانہ کے لئے بھی استعمال کیا ہے یہ خلا جو اچانک سوگندھی کے اندر پیدا ہو گیا تھا۔ اسے بہت تکلیف دے رہا تھا۔ اس نے کافی دیر تک اس خلا کو پُر کرنے کی کوشش کی۔ مگر بے سود۔ وہ ایک وقت میں بے شمار خیالات اپنے دماغ میں ٹھونستی تھی۔ مگر بالکل چھلنی کا حساب تھا ادھر وہ دماغ کو پُر کرتی تھی ادھر وہ خالی پڑ جاتا تھا۔

بہت دیر تک وہ بید کی کرسی پر بیٹھی رہی۔ سوچ بچار کے بعد جب اس کو اپنا دل پرچانے کا کوئی طریقہ نہ ملا تو اس نے اپنے خارش زدہ کتے کو گود میں اٹھایا اور ساگوان کے چوڑے پلنگ پر اسے پہلو میں لٹا کر سو گئی۔

ذہن جدید

"کون ہے جو یہ تصویریں دیکھ کر لذت حاصل کرنے کے واسطے ان ویشیاؤں کے کوٹھے پر جائے گا۔ میری سلطانہ اور میری سوگندھی تنہائی میں دیکھنے والی تصویریں نہیں جن کے اشتہار آئے دن اخباروں میں چھپتے رہتے ہیں۔ کوئی لچھے دار آپ بیتی نہیں سناتیں کہ شہوانی جذبات ابھر آئیں"

اس صراحت کے بعد منٹو ایک اور جسارت کرتا ہے۔ ایک اور زیادتی کا مرتکب ہوتا ہے۔ وہ درد اور مومن کی مثنویوں سے اقتباسات پیش کرتا ہے۔

"درد اور مومن ہمارے ادب کے وہ معتبر ترین نام ہیں جن کے متعلق فحاشی کے الزام کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اشتہار، ناول، اور مثنویاں کھلی فحاشی کے باوجود جائز ہیں تو پھر منٹو کا فحاشی کے خلاف نفرت اور کراہیت پیدا کرنا کیوں گردن زدنی ہے۔"

منٹو کے خلاف غصہ اور بیزاری کی تین بڑی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ ایک اس کی تحریروں کا مطمع نظر۔ اس کا مقصد دوسرے اس کے موضوعات اور تیسرے اس کا قصہ گوئی کا فن۔ جہاں تک نظریۂ فن کا تعلق ہے تو ایک بات بالکل واضح ہے وہ یہ کہ نہ منٹو مصلح ہے نہ طنز نگار کہ دونوں کا بنیادی مقصد لذت آفرینی اور دوسروں کو اپنی طرف مائل کرنا ہوتا ہے اور دونوں ہی INSTRUCTION THROUGH DELIGHT کے نظریہ پر عمل کرتے ہیں۔ وہ خود کو دوسروں سے بلند مقام پر کھڑا کر کے ان کی بیوقوفیوں اور فریبیوں پر ہنستے ہیں اور احساس برتری کے ساتھ ان کی خامیوں اور کمزوریوں کا مذاق اڑاتے ہیں۔ وہ اپنے قاری یا سامع کو بھی اپنے برابر مقام فضیلت پر بٹھا لیتے ہیں۔ یوں دونوں مل کر لوگوں پر طنز کرتے ہیں اور محظوظ ہوتے ہیں۔ PRESENT COMPANY EXCEPTED مہذب معاشرہ کا ایک اعلیٰ اصول ہے۔ وہ ایک نظام اقدار میں رہتے ہوئے اس سے انحراف یا غفلت کو لائق سزا سمجھتے ہیں لیکن وہ کبھی اس نظام اقدار کے متعلق کوئی سوال نہیں اٹھاتے جو مذہب، شرافت تہذیب یا معاشرہ کی مسلمہ اقدار ہیں۔ لیکن کیا واقعی لوگ ان کو سنجیدگی سے مانتے ہیں؟

تو وہ اس مفروضہ پر اعتقاد کا اظہار کرتا ہے کہ پردہ بہت اچھی فطری بات ہے اور بے پردگی ایک غیر فطری اور غیر شائستہ عمل ہے۔ وہ رسم و رواج کی نئی اندھی تقلید کرتا ہے سوچنے کے بجائے پیروی رسم و رہِ عام اس کا معیا ہوتا ہے منٹو اس کے برعکس سوچنے کی دعوت دیتا ہے۔ یہ سوال اٹھاتا ہے کہ کیا رسم و رواج انسانی اخوت اور رواداری کے مقابلے میں زیادہ مقدس اور لائق احترام ہیں۔ کیا عورت محض لذت آفرینی کا ذریعہ ہے۔ منٹو ان تمام مفروضہ قدروں کے متعلق سوالات اٹھاتا ہے وہ قاری سے کسی قسم کی ساز باز نہیں کرتا بلکہ اسکا پہلا شکار ہی اس کا قاری ہوتا ہے جسے وہ خود اسکی اپنی نظروں میں ذلیل کر دیتا ہے

میں نے نیویارک میں ایک چرچ دیکھا جس پر بڑا سا BINGO CLUB کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ بڑا تعجب ہوا کہ یہ چرچ جوا خانہ کیسا ہے ایک پادری سے پوچھا جواب ملا کہ لوگوں نے چرچ میں آنا چھوڑ دیا ہے BINGO کے لئے وہ کم از کم ادھر کا رخ تو کریں گے اور پھر ایک روز عبادت کے لئے بھی آجائیں گے منٹو اس قسم کی منافقت پر خاموش نہیں رہ سکتا تھا۔

جنس منٹو کا موضوع نہیں اگر ایسا ہوتا تو فحش اشتہاروں، ناولوں اور مثنویوں کی طرح اس کی تحریروں کو بھی قبول کر لیا جاتا اور اصل منٹو کا موضوع شعور کا دیوالیہ پن اور منافقت ہے اور اس نے محسوس کیا کہ ان دو انسانی کمزوریوں کا سب سے واضح اظہار لوگوں کے جنس کے متعلق رویوں سے ہوتا ہے وہ

خود جنس کو ہی بُرا سمجھتے ہیں حالانکہ برائی جنس میں نہیں جنسی رویوں میں ہے۔ اور جب آپ لوگوں کو یہ دکھائیں گے کہ انھوں نے حقیقت کی طرف سے آنکھیں بند کی ہوئی ہیں اور وہ ایک ایسی منافقانہ زندگی گذار رہے ہیں جس کی منافقت تک کا انھیں احساس نہیں تو وہ یقیناً آپ کو معاف نہیں کریں گے۔ منٹو کا انداز مصلحین کا سا نہیں ہے وہ نصیحتیں نہیں کرتا بلکہ آدمی کو خود اس کو اپنی نظروں میں ذلیل کرتا ہے اسے ننگا کر دیتا ہے آج کے مہذب معاشرہ میں جنسی موضوعات کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ نہ صرف یہ کہ اس نے نیا قانون اور ٹیٹوال کا کتا جیسے ایک طرح سے سیاسی موضوعات پر بھی افسانے لکھے ہیں اور جنسی موضوع پر لکھے جانے والے افسانے اس کی تخلیقی کاوشوں کا محض ایک حصہ ہیں لیکن اسے شہرت جنسی کہانیوں کی وجہ سے ملی اس میں اسکا کچھ زیادہ قصور نہیں اس کا معاشرہ ایسی کا سارا دوہی سخت جنس زدہ تھا اور لوگوں کا ذہن بار بار اسی طرف لوٹتا تھا عورت ان کے اعصاب پر سوار تھی منٹو نے ان کی اس کمزوری کو پکڑا اور اسے طشت از بام کر دیا عام طور سے فسادات پر اسکی تحریروں کو اغوا اور تشدد کے حوالے سے ہی دیکھا گیا ہے جبکہ اس نے اس شیطانی کھیل کے ہر پر اظہار رائے کیا ہے۔ مذہبی۔ معاشرتی۔ سیاسی اور اخلاقی توڑ پھوڑ کے منظر پیش کئے ہیں جن کا ایک بہت مؤثر اور خوبصورت نمونہ سیاہ حاشئے میں ملتا ہے لیکن منٹو کا فن اس کا سب سے بڑا دشمن ثابت ہوا وہ کہانی کو نہایت سادگی کے ساتھ بڑے واقعاتی انداز میں شروع کرتا ہے پھر اصل موضوع کو پس پشت ڈال کر قاری کو ادھر ادھر کی باتوں میں الجھا دیتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ وقفوں وقفوں سے موضوع کی طرف کچھ ایسے اشارے کرتا جاتا ہے جن سے پڑھنے والے میں ایک عجیب سا لطیف سا تجسس پیدا ہوتا ہے۔ اور یوں کہانی کا سسپنس بڑھتا جاتا ہے یہاں تک کہ کلائمکس پر پہنچ کر اسے محسوس ہوتا ہے کہ جیسے اس کو دھوکا دیا گیا ہے اور سبز باغ دکھا کر اس کو دلدل میں پھینک دیا گیا ہے مثلاً "کھول دو" ایک نہایت مختصر افسانہ ہے جو یوں شروع ہوتا ہے، امرتسر سے سپیشل ٹرین دوپہر دو بجے چلی اور آٹھ گھنٹوں کے بعد مغل پورہ پہنچی راستہ میں کئی آدمی مارے گئے۔ متعدد زخمی ہوئے اور کچھ ادھر ادھر بھٹک گئے۔ اس صحافیانہ سی خبر کے بعد مہاجروں کے کیمپ کا منظر اور چند زخمیوں کے ذکر بعد سراج الدین کی آواز آتی ہے جو اپنی بیٹی کو پکار رہا ہے "سکینہ۔ سکینہ" اس کے کہانی شروع سے چل پڑتی ہے اور سراج الدین کے گھریلو پس منظر کی کچھ تفصیلات دی جاتی ہیں اور پھر فسادات اور فرار کا بیان آتا ہے جس میں سکینہ کا دوپٹہ گر جاتا ہے۔ اور اس کا باپ اسے جیب میں ڈال لیتا ہے کہانی پھر رک جاتی ہے اور سراج الدین کی ذہنی کیفیت کا بیان شروع ہو جاتا ہے پھر آٹھ نوجوان رضاکار اسے تسلی دیتے ہیں۔ وہ انھیں دعائیں دیتا ہے اور لڑکی کا حلیہ بتاتا ہے۔ اس کا گورا رنگ ہے اور بہت ہی خوبصورت، عمر سترہ برس کے قریب ہے۔۔۔۔ آنکھیں بڑی بڑی۔۔۔ بال سیاہ۔ داہنے گال پر موٹا سا تل۔۔۔ قاری سنبھل کر بیٹھتا ہے نوجوان رضاکار کئی مردوں عورتوں اور بچوں کو نکال لاتے ہیں۔ سکینہ بھی مل جاتی ہے لیکن سراج الدین کو اسکی خبر نہیں دی جاتی قاری کو اب کسی سنسنی خیز منظر کی امید ہوتی ہے۔ مگر وہاں ایک لاش آ جاتی ہے۔ ایک لڑکی کی لاش پڑھنے والا سوچتا ہے کہ اب کچھ بات کھلے لیکن جو وہ سننا چاہتا ہے وہ نہیں ہوتا سراج الدین کمرے میں لاش کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ وہاں روشنی کم ہے۔ ڈاکٹر کہتا ہے "کھڑکی کھول دو"۔

سکینہ کے مردہ جسم میں جنبش پیدا ہوئی بوڑھا سراج الدین خوشی سے چلایا "زندہ ہے۔۔۔ میری بیٹی زندہ ہے۔ ڈاکٹر سر سے پیر تک پسینہ میں غرق ہو گیا اور قاری ایک جھلاہٹ اور بدمزگی کے احساس کے ساتھ کتاب

ذہن جدید

کو بند کردیتا ہے۔ اس آخری منظر کی اسے قطعی توقع نہیں تھی۔ وہ کچھ اور سوچ رہا تھا کہانی کا یہ انجام اسے چونکا دیتا ہے۔ منٹو کے فن کا سحر اپنا اثر دکھا گیا۔ یہ باپ اور بیٹی کا ملن ہے۔ جو قاری کو جھنجھوڑتا ہے کہ وہ بھی اس گناہ میں شریک تھا۔ اور جس مزے کو وہ ڈھونڈ رہا تھا۔ وہ کتنا ذلت آمیز تھا۔

"ٹھنڈا گوشت"، میں بات انتہا کو پہنچ جاتی ہے۔ کہانی ویسے ہی غیر جذباتی واقعاتی انداز میں شروع ہوتی ہے اسی طرح قاری بار بار کسی کلائمکس کی توقع کرتا ہے۔ اور بار بار مایوس ہوتا ہے بظاہر روایتی انداز میں بیان کی جانے والی کہانی قطعی روایتی نہیں ہے۔ قاری مسلسل دھوکے پر دھوکے کھائے جاتا ہے اور آخر میں بالکل ہی بدمزگی محسوس کرتا ہے "کھول دو"۔ کی سکینہ بظاہر مر چکی تھی۔ مگر وہ ابھی زندہ تھی۔ بلکہ زندگی اور موت کے درمیان تھی اور اس کی حرکتیں بالکل میکانکی ہو چکی تھیں لیکن "ٹھنڈا گوشت"، کی لڑکی واقعی مر چکی تھی جبکہ قاری کا جنسی ہیجان کلائمکس پر پہنچ چکا تھا۔ اور اس کے سامنے ایک نوجوان نیم برہنہ عورت تھی۔ مگر مری ہوئی ٹیٹوال کا کتا"، تعصب کو موضوع بناتا ہے۔ چونکہ تعصب آنکھوں پر پٹی باندھ دیتا ہے اس لئے اچھے برے اور صحیح غلط کی پہچان مشکل ہو جاتی ہے ایک عام آدمی کسی دوسرے شخص کو محض آدمی کی حیثیت میں نہیں دیکھتا۔ اس کی ذہنی اور جذباتی تربیت اسے انسانوں کو گروہوں کے حوالے سے دیکھنے کا عادی بنا دیتی ہے اسے آدمی نظر نہیں آتے۔ دوست یا دشمن نظر آتے ہیں۔ ہندو یا مسلمان دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن اگر ان چیزوں کو نظروں سے اوجھل کر دیا جائے جو جذبات کو بھڑکاتی ہیں تو ردِ عمل وہ نہیں ہوتا جو ہونا چاہئے۔ چونکہ کتے کے ساتھ کوئی ذہنی یا جذباتی وابستگی منسلک نہیں کی جا سکتی ہیں اس لئے اس کے حق میں یا اس کے خلاف جذبات نہیں ابھرتے اور کتے کی موت احمقانہ عمل نظر آتا ہے۔

ایسی ہی ایک کہانی "موذیل"، بھی ہے وہ ایک آزاد منش یہودی لڑکی ہے جو ایک سکھ نوجوان کے کیس اور داڑھی کا مذاق اڑاتی ہے۔ سکھ چلا اٹھتا ہے احتجاج کرتا ہے۔ کہ اس کے مذہب کا مذاق اڑایا جا رہا ہے دوسری طرف موذیل ہے جو ہر قسم کے آداب اور تکلفات سے اتنی لاتعلق ہے کہ صرف ایک لمبے چغہ سے اپنا جسم ڈھانپتی ہے۔ نیچے انڈر ویئر بھی نہیں پہنتی اور کھٹ کھٹ کھڑاویں بجاتی پھرتی ہے جب ترلوچن کی محبوبہ کرپال کور کی زندگی بچانے کا وقت آتا ہے تو سکھ عاشق اپنی داڑھی اور بالوں کو اس کی جان سے زیادہ اہمیت دیتا ہے لیکن یہ لاابالی لڑکی موذیل اسے بچانے کے لئے اپنا چغہ اتار کر پال کور کو پہنا دیتی ہے۔ اور خود بالکل ننگی فلیٹ کی سیڑھیوں پر دوڑ پڑتی ہے تاکہ بلوائی اس کا پیچھا کریں اور کرپال کور کو بچ نکلنے کا موقع مل جائے۔ تو موذیل کی کھڑاؤں پھسلتی ہے اور سخت زخمی ہو کر سیڑھیوں سے گر پڑتی ہے۔ ترلوچن اس کی ستر پوشی کے لئے پگڑی اس پر ڈال دیتا ہے۔ وہی پگڑی جسے وہ اس لئے نہیں اتارتا تھا کہ کرپال کور اس کے کٹے ہوئے کیس نہ دیکھ لے اور یہ نہ سوچے کہ اس نے مذہب چھوڑ دیا ہے۔ موذیل نزع کے عالم میں ہے لیکن وہ اپنے بدن پر سے ترلوچن کی پگڑی ہٹا دیتی ہے اور کہتی ہے، لے جاؤ اس کو۔ ادھر جاتی ہے۔

لیکن منٹو کا اس سے بھی بڑا ایک تصور ہے۔ جنس کی بات۔ لذت کیشش کی بات۔ مہذب لوگوں کی زبان سے ہی اچھی لگتی ہے۔ غیر مہذب لوگ کریں تو یہ باتیں فحش لگتی ہیں۔ ایک مرتبہ پروفیسر حمید احمد خاں کو فحش تصویروں کے ایک مقدمہ میں بطور گواہ بلایا گیا۔ ان سے پوچھا گیا کہ وہ اپنے کمرے میں وینس کا ننگا مجسمہ

باقی صفحہ ۱۰۲

خواہشوں کا غنیم

بمل کرشن اشک

میں خواہشوں کے غنیم کی آرزو کروں گا
میں اس کو چاہوں گا وہ کہے گا کہ میں نہیں ہوں
وہ ہے، وہ ہے کی صدائیں گونجیں گی ہر طرف سے
حبیب محبوب بن کے اس کو میں تن بدن میں اتار لوں گا
میں اس کو چاہوں گا اور وہ یوں نہ کہہ سکے گا کہ میں نہیں ہوں
میں اپنے ہونٹوں پہ جسم کا شہد زہر مرکوز کر کے اس کو
حیات کی طرح، مرگ کی طرح چوم لوں گا
وہ مجھ کو ہمزاد وصل کے انبساط سے روشناس کر کے
کبھی میرے جسم سے علیحدہ، کبھی میرے جسم سے ملے گا
وہ ورغلائے گا مجھ کو یہ کہہ کے خواہشیں راستے نہیں ہیں نہ منزلیں ہیں
میں سر ہلا کے کہوں گا ہاں ٹھیک کہہ رہے ہو
میں روٹھ جاؤں گا اور پھر وہ مجھے جھلائے گا بازوؤں میں
وہ میرے ہونٹوں پہ ہونٹھ رکھ کر کہے گا خواہش بُری بلا ہے
کبھی نہ کرنا — مگر مری بات دوسری ہے
میں تم سے نفور، پرے کی شئے ہوں، میں خواہشوں کا غنیم ٹھہرا
بس ایک خواہش بچی ہے مجھ میں کہ خواہشوں کو تمام کر دوں
میں ہنس کے اس سے کہوں گا خواہش کبھی نہ کرنا
مگر مری بات دوسری ہے میں خواہشوں کا بلا ہوا ہوں
یہ سن کے ہم قہقہہ اچھالیں گے یوں فضا میں
کہ جیسے ہم ایک دوسرے کو وصال کی بے حجابیوں میں اچھالتے ہیں

اختلاط

بمل کرشن اشک

نہ جانے وہ اختلاط کی کون سی کڑی ہے
یہ علم کس کو اگر وہ سوچا گیا تو عریانیوں میں کیا تھا
حقارتیں نہیں تھیں، بشارتیں نہیں تھیں کہ جسم و جاں
کی ضرورتیں تھیں
یہ عین ممکن ہے دونوں جانب کدورتیں تھیں
گو۔ درمیاں فرض آ پڑا تھا
بس اب تو سو ممکنات میں ایک سچ وہی ہے

وہ سامنے کے بدن کو ماضی بھری کنکھیوں
سے دیکھتا ہے
یہ جسم جس میں سپردگی کی صباحتیں تھیں
کھنچاؤ کی تو قباحتیں تھیں
یہ جسم جو خود سپردگی کے شعور سے بے خبر نہیں تھا
اور ایک پل جس میں گدگداہٹ کی انگلیوں
کا اثر نہیں تھا
یہ جسم جس کو قبول کرنے پہ بس نہیں تھا
اور اس کا اپنا بدن کہ جو صبح و شب سراپا
ہوس نہیں تھا
اسے بھی معلوم ہے اسے بھی
یہی بہت ہے کہ دونوں زنجیر کی کڑی ہیں
اگرچہ سچ ہے۔

ملزم

بھوک لامحدود ہے اور پیڑ کی ہر شاخ پھل کے
بوجھ سے نیچے کی جانب جھک رہی ہے
جب میں اونچا ہاتھ کر کے توڑنے کی سعی
کرتا ہوں تو شاخیں
آسمانوں کی طرف بڑھتی ہیں اور میں
راستے میں جتنی لاشیں ہیں انہیں اک دوسرے پر جوڑ کر
اپنے قد کو اور اونچا اور اونچا کر رہا ہوں

وہ مجھے الزام بھی دے گا تو کیسے
بھوک اس کی دی ہوئی ہے
شاخ اس کی فیض سے ہے
اور اگر میں زیست پر الزام ہوں تو خالق ملزم وہی ہے

حمید الماس

درد کا منظر

سمندر کی موجیں
سرِ شام
لبِ بستہ ساحل پہ آکر
سلگتی ہوئی ریت کے ذرے ذرے سے
اٹھکھیلیاں کر رہی ہیں
پرندے
جزیروں سے
اب
گھونسلوں کی طرف آ رہے ہیں
فضا
ان کے رنگین پروں سے ضیا پا رہی ہے
جھاگ
کرنوں کو پی کر بہت شاد ہے
ڈوبتے ڈوبتے
اس سے سورج نے وعدہ کیا ہے کہ
وہ بامِ فردا پہ پھر آئے گا
دودھیا چاندنی
دھیرے دھیرے اُتر کر
سمندر کو روشن کرے گی
یہ منظر
ہماری نگاہوں میں محفوظ ہوگا
مگر درد بن کر

انگلیاں بولتی ہی رہیں

سسکتی ہوئی شام کی سرحدوں پر
دھنک
میرے لفظوں میں تحلیل ہو کر
مجھے اپنے شفاف جوہر عطا کر رہی تھی
اچانک
بھیانک پرندے نے آکر
مجھے اپنے کالے پروں میں سمیٹا
ہوئی آنکھ محرومِ وصفِ بصارت
لرزتا رہا جسم
ہونٹوں سے حرفِ دعا بھی نہ نکلا
مگر
ہالۂ تیرگی میں
رہا فکر کی روشنی کا گذر
رات بھر
انگلیاں بولتی ہی رہیں حالتِ وجد میں
روشنی دور سے سن رہی تھی

تو نہ چاہے . . . .

مصحف اقبال توصیفی

تو نہ چاہے تو یہ ممکن ہی نہیں
میں کبھی تیری تمنا بھی کروں
اس طرح خود سے بچھڑ جاؤں میں
کسی زنجیر کے نغمے میں
کسی سائے کی سرگوشی میں
اپنی پلکوں پہ لرزتے ہوئے اک آنسو میں
تجھے دیکھوں بھی تو پہچان نہیں پاؤں میں
اس طرح خود سے بچھڑ جاؤں میں

اس قدر دور چلا جاؤں میں
اس قدر دور کہ جی گھبرائے
اس قدر دور زمیں گھٹتے ہوئے دائروں میں
ایک موہوم سا نقطہ بن جائے
اس قدر دور کہ یہ رات کا سارا منظر
ایک تاریک ستارہ بن جائے
اور تری آنکھ کی اشکوں بھری تنہائی میں
آسمانوں کا دھواں رہ جائے
اس قدر دور چلا جاؤں میں

زرد پتوں کی طرح
رات کی شاخ سے ٹوٹے ہوئے کچھ خواب مرے
سرد تاریک ہواؤں میں انہیں بہنے دو
یہ خد و خال میرے
اپنی پہچان کو ترسے ہیں بہت
اور کچھ دیر مرے
عکس کا زخم انہیں سہنے دو
شور کیسا ہے یہ خاموشی کا
مری آواز کا ماتم ہے کہیں
مری پلکوں پہ یہ مٹی کی تہیں رہنے دو

چوہدری ابن النصیر

بدن سے گفتگو

بدن سے گفتگو کرتے وقت
مبتلائے حیرت نہ ہو جانا
مضطرب احساس موج موج پھیلتا ہوا
کسی وجود کے مرکز تک پہنچتے پہنچتے خلاء
نہ ہو جائے
اتنا دھیان رہے
درد اور موت کی برہنگی بعید رابطوں
تک وسیع ہو جائے
اور کائنات پر پھیل جائے
سانسوں کی مستقل آمد و رفت کی
بے مہر ساعتوں پہ اپنی گرفت مضبوط رکھنا
بے شرم پسندیدگی ظاہر نہ کرنا
یہ سچ ہے کہ
یہ کائنات ایک وسیع نظام ہے
علامتوں کا
اور بدن اظہارِ علامت ہے
اس لیے
منزلِ آگہی کو پانے کی خاطر
بدن سے گفتگو کرتے وقت
تحمل لازمی ہے

دکھ سے بدن کی لذت تک

انسانی بدن سے صحبتیں اور
زندگی کی ضرورتیں
دو راستے ہیں
اور ان راستوں پر
تری موجودگی کا اقرار اور
دائمی عدم موجودگی کا احساس
ایک دستخط بن کر کندہ ہے
زیادہ سوچنا وقت ضائع کرنا ہے
بے کار آمد ساعتوں سے ڈرنا ہے
زیادہ دکھ میں رہنا
بے معنی سوالوں میں جینے کی عادت ہے
جو لا انسان کی علامت ہے
بدن کی لذت میں جینے کے خوشگوار لمحوں کو ڈھونڈا کرو تم
میں یہی کہتا ہوں، یہی کیا کرو تم
ہر حال تو ماضی بن جانا ہے
پھر کون کس کو یاد رکھ پاتا ہے
بدن کی صحبت، بدن کی لذت، بدن کی گرمی
ہی زندگی ہے، یہ روشنی ہے
باقی ہے جو سب موت ہے
تیرگی ہے
بدن زندگی ہے
اور زندگی سانس لینے کی جد و جہد ہے
جد و جہد کو ایمان سمجھو
آگہی سمجھو، عرفان سمجھو

بلقیس ظفیر الحسن

نظم

(کشور ناہید کے نام)

ہاں — دروازے پر چڑھی کنڈی اُتار لی گئی
لیکن — بند دروازے کے پٹ تو
خود چل کر ہی کھولے جا سکیں گے
آنکھوں کی پٹی کھل جانے پر — بینائی کو نگاہ کی عادت
دھیرے دھیرے ہی پڑتی ہے
ہونٹوں کی مہریں ٹوٹ گئی ہیں
اب بولنے کے لیے — زبان کو
الفاظ کی مشق کرانی ہوگی
آزاد تو دماغ کو ہونا ہے
جسم کی آزادی کوئی معنی نہیں رکھتی
سر کی چادر اُتار کر اپنی برہنگی ڈھکنے کے لیے
ہاتھوں کا استعمال ضروری ہے
سر پر تاج ہے اور پیروں میں بیڑیاں
کیا — عجیب نہیں لگتا
زنا سے لے کر آدھی گواہی تک
ہاں! یہ چارج شیٹ بہت لمبی ہے
لیکن مجھے اس کے بارے میں سوچنے کی
نہ فرصت ہے نہ — ضرورت
(ویسے بھی یہ چارج شیٹ میری غیر موجودگی میں
تیار کی گئی تھی)

دشنام ملیں یا انعام
مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا
مجھے تو
اپنے پیروں کی بیڑیاں — اپنے آزاد ہاتھوں سے ہٹا کر
اس ملگجے اندھیرے کو اپنی پلکوں سے بٹور کر
کنارے لگانا ہے
دروازے تک جانا ہے
ان بند پٹوں سے باہر — ایک کھلی فضا
میرا انتظار کر رہی ہے
جہاں کم از کم میں آزادی سے سانس تو لے سکوں گی
ہاں! میں شہر میں داخل ہونے والی
پہلی عورت ہوں
کہیں بھی پہنچنے کے لیے اٹھایا ہوا
پہلا قدم!

فصیح اکمل

●

واپسی مشکل ہے لیکن آسرا رکھ جائیو !
پھول سے ہونٹوں پہ رخصت کی دُعا رکھ جائیو

ناشناسی کا سفر بے چہرگی پر ختم ہے
وقت کے ہاتھوں پہ اندھا آئینہ رکھ جائیو

کیا خبر کیسے مسافران جلے شہروں میں آئیں
کچھ نشانی کل کی خاطر اے ہوا رکھ جائیو

دو محبت آشنا جسموں کا مقتل ہے یہ گھر
پھول موسم کے یہاں بادِ صبا رکھ جائیو

ریت کے صحرا میں پیاسے قافلوں کی بھیڑ ہے
دوش پر موسم کے بارش کی دعا رکھ جائیو

●

مجھے تشنہ یوں ہی نہ چھوڑ یو کبھی دیکھنے کو بھی آئیو
مرے خواب راکھ کا ڈھیر ہیں جو شرر ملیں تو بچائیو

یہ اندھیری رات کی داوری یہ غنیم وقت کے لشکری
کبھی ساحلوں پہ جو ٹھہریو تو سفینے پہلے جلائیو !

مری رات جاگ کے کٹ گئی، مری عمر دھوپ میں بٹ گئی
کسی پیڑ کی گھنی چھاؤں میں مجھے چین کی نیند سلائیو

یہ دھواں یہ شہر کی خامشی یہ دلوں میں خوف کی تھرتھری
یہ لہو میں ڈوبتی شام ہے اسے دوسروں سے چھپائیو

میں قتیل اپنی اَنا کا ہوں میں جو کشتۂ تیغ جفا کا ہوں
مرے بعد مجھ کو نہ روئیو مری داستان ہی سنائیو

عبدالاحد ساز

●

موت سے آگے سوچ کے آنا پھر جی لینا
چھوٹی چھوٹی باتوں میں دلچسپی لینا

نرم نظر سے چھونا منظر کی سختی کو
تُند ہوا سے چہرے کی شادابی لینا

جذبوں کے دو گھونٹ عقیدوں کے دو لقمے
آگے سوچ کا صحرا ہے، کچھ کھا پی لینا

آوازوں کے شہر سے بابا کیا ملنا ہے
اپنے اپنے حصّے کی خاموشی لینا

مہنگے سستے دام، ہزاروں نام یہ جیون
سوچ سمجھ کر چیز کوئی اچھی سی لینا

دل پر شور اہیں کھولیں انکار نے جس کے
سازؔ اب اس کا نام تشکر سے ہی لینا

●

اک ایما، اک اشارہ مَر رہا ہے
اُفق پر دل کے تارہ مَر رہا ہے

جو میرے بعد سب پیدا ہوا تھا
وہ مجھ سے پہلے سارا مَر رہا ہے

کئی موجوں نے دم توڑا تھا جس پر
سنا ہے وہ کنارا مَر رہا ہے

خِرد تحلیلِ صحرا کر رہی ہے
جنوں کا اِستعارہ مَر رہا ہے

اَزل پیما یہی مقیاسِ دل تھی
مگر اب اُس کا پارہ مَر رہا ہے

کہاں مانگی ہوئی سانسیں، کہاں دل
جِلایا تھا، دوبارہ مر رہا ہے

فاروق شفق

•

کسی کا جبہ و دستار چھین لیتے ہیں
یہاں کے لوگ تو کردار چھین لیتے ہیں

مزاج شہر کا سننے پہ جب بھی آتا ہے
وہ ہم سے جینے کا معیار چھین لیتے ہیں

پڑوسیوں میں مرے جنگ ہے وہ سائے کی
ملے نہ سایہ تو دیوار چھین لیتے ہیں

گھٹن بہت ہے پہ طوفان سے تو بہتر ہے
پلک جھپکتے جو گھر بار چھین لیتے ہیں

وہ سوئے کوچہ و بازار یوں نکلتے ہیں
تمام رونق بازار چھین لیتے ہیں

وہ چاہتے ہیں کہ پردے پڑے رہیں یونہی
ہمارے ہاتھ سے اخبار چھین لیتے ہیں

مصحف اقبال توصیفی

•

وہ تری ہمسائگی تھی، میں نہ تھا
اک ندی تھی تشنگی تھی، میں نہ تھا

میں نے تجھ کو چھو کے دیکھا، تو نہ تھی
جانے تو کیا کہہ رہی تھی میں نہ تھا

تو نہیں تھی حسن کا سایہ تھا وہ
آنکھ کی دیوار سی تھی میں نہ تھا

رات، بے بس رات، بستر پر مرے
کروٹیں لیتی رہی تھی میں نہ تھا

لے گئی مجھ کو کہاں شام فراق
وصل کی شب آگئی تھی، میں نہ تھا

آگ سی اک آگ تھی میرا وجود
روشنی ہی روشنی تھی، میں نہ تھا

آئینے میں ہنس رہا تھا میرا عکس
میز پر تصویر بھی تھی، میں نہ تھا

ابراہیم اشک

●

یہ مانا ہم نے دشواری بہت تھی
دل و جاں کی بھی تیاری بہت تھی

بھری جو بھی اُڑان ہم نے جہاں میں
پر پرواز پر بھاری بہت تھی

عجب ہے جی رہا ہے شہر سارا
فضاؤں میں تو بیماری بہت تھی

خود اپنی سادگی پر لٹ گئے ہم
کہ بازی جان کر ہاری بہت تھی

کسی کا مسکرا کر دیکھ لینا
ہمیں یہ ایک پھلواری بہت تھی

خلوص و مہر سے گر محبت آئے
ملائم ضرب بھی کاری بہت تھی

یہ ہے وجہِ عروجِ نسلِ انساں
ذرا سی جاں میں جی داری بہت تھی

شبیر احمد فراز

●

سب سے ہنس کر ہاتھ ملانا سیکھ لیا
جینا کیا سیکھا مر جانا سیکھ لیا

دیواروں پر بستی کی اوقات کھُلی
بچوں نے تصویر بنانا سیکھ لیا

کالی پیلی تفسیروں کی زد پر ہوں
خاموشی نے شور مچانا سیکھ لیا

لکڑی کی تلوار کہاں میدان کہاں
شہزادے نے جان بچانا سیکھ لیا

سورج طعنے مارے چند اشرمائے
راتوں نے کاجل پھیلانا سیکھ لیا

عامر صدیقی

•

تم ہو میرے نہ یہ دنیائے دنی میری ہے
اس خرابے میں عجب بے وطنی میری ہے

دامنِ صبح پہ بکھرا ہوں میں شبنم شبنم
ہر چمکتے ہوئے نیزے کی انی میری ہے

لطف یہ ہے کہ سرِ دست تہی دست ہوں میں
اور دکھ یہ کہ طبیعت بھی غنی میری ہے

طشت از بام کروں اور چھپاؤں بھی اسے
کتنی شائستۂ غم کم سخنی میری ہے

سبزۂ مالِ غنیمت میں کنول ہے اُس کا
کچھ اگر ہے تو فقط ناگ پھنی میری ہے

تیز آندھی میں کوئی پیڑ سلامت ہی نہیں
کون ایسے میں کہے چھاؤں گھنی میری ہے

نظام ہاتف

•

نیم بالغ سا عتوہ، یہ نخل بے برگ و ثمر بھی کم نہیں ہے
بیج سے پھوٹا ہوا انکر ہے آئندہ شجر بھی کم نہیں ہے

کیوں نواحِ جاں میں روشن ہیں، چراغوں کی زنوں کی اصطلا جیں
پھونکنے کے واسطے قصرِ گماں حرفِ شرر بھی کم نہیں ہے

مطلعِ غبر ابر آلودہ عجب تشویش کا باعث بنے گا
اِس برس شاید ہماری چھت نہ ٹپکے گی یہ ڈر بھی کم نہیں ہے

وہ گذشتہ کل تھا دو خانوں میں جس نے منقسم ہم کو کیا تھا
آنے والے کل سے ہم کو پھر اسی دیوار میں امکان در بھی کم نہیں ہے

اک سیاسی منفعت ہی اپنا نصب العین ٹھہرا ہے تو ہاتف
بے سروں کے شہر میں یہ شوشۂ دستار و سر بھی کم نہیں ہے

ارشد نظر

●

سناٹا ہے باہر باہر
شور ہے کتنا میرے اندر

خوشبو، تتلی، شیشہ، پتھر
منظر منظر روشن پیکر

میں کیا ڈوبوں تیرے اندر
میرے اندر سات سمندر

جس بستی میں آگ لگی تھی
اُس بستی میں تھا میرا گھر

لمحہ لمحہ ڈوب رہا ہے
جو سورج ہے میرے اندر

آئینوں نے رکھ دی آخر
سنگ زنی کی تہمت مجھ پر

ایم. قمرالدین

●

تمام عمر یہی زندگی، جہان کا ناپ
جو ختم ہونے پہ، ایک آدھ ہی بیان کا ناپ

دراصل یہ تری تحریر، وہ تری تقریر
قلم کا ناپ ہے یہ اور وہ زبان کا ناپ

وہ گردشوں نے دکھایا جو دیکھتے نہ کبھی
کہیں زمان کا دیکھا کہیں مکان کا ناپ

کسی کے ساتھ ہی بس، نام یا نشان کی دھن
کسی کے بعد کہاں نام یا نشان کا ناپ

تمام عمر گذرتی ہے، ناپتے ہی فقط
یقین کا ناپ کبھی یا کبھی گمان کا ناپ

انور ندیم

بہت اکیلا ہوں، سوچتا ہوں کسی کو اپنے قریب کرلوں
میں اپنے من کو اچھال پھینکوں، میں زندگی کو صلیب کرلوں

عجیب پاگل ہے، دل لگا کے وہ ایسی باتیں بھی سوچتا ہے
تمام دنیا کی راحتوں کو مجنونوں کا نصیب کرلوں

یہی مناسب ہے آج ایسا کروں کہ دل کا غبار نکلے
زباں تو کچھ بھی نہ کہہ سکے گی نظر کو لیکن خطیب کرلوں

بھٹک رہا ہے بہت دنوں سے بہ درد کس کا نگر نگر میں
میں سوچتا ہوں اسی کی خاطر میں اس کو اپنے قریب کرلوں

بہت دنوں سے سکوں ہے لیکن بہت گراں ہے یہ زندگانی
کسی سے الجھوں کسی بہانے، کسی کو اپنا رقیب کرلوں

ذاکرہ شبنم

سوال

تم مجھے کس موڑ پر
چھوڑ گئے ہو
یہاں تو
دور تک
خوف ناک سناٹا ہے
جذبوں کی ناآسودہ جلن
اور بے نام الجھنوں کا
جنگل ہے
میں مایوسی کی
ریت کو کب تک
مٹھی میں بھرتی رہوں
اور اپنے
خواب کی تعبیروں
کی خوش فہمی میں
غالب کا دیوان
پڑھتی رہوں


جوانی کی گم گشتہ اُمنگیں دوبارہ حاصل کریں
آپ نئے سرے سے خود کو جوان محسوس کر سکتے ہیں۔
اتنا ہی جوان، جتنا آپ جوانی کے دنوں میں تھے۔
اس مقصد کے لیے آپ کو ضرورت ہے، ہمدوجین کی۔
یہ آپ کے بڑھاپے کو آپ سے دُور رکھتی ہے، جسمانی
طاقت کو بحال رکھتی ہے اور آپ کو تھکاوٹ اور
کوفت سے بچاتی ہے۔ بے مثال ٹانک جسے ہمدرد نے
زندگی بخش قدرتی اجزار، جیسے سلاجیت، جائفل،
زعفران، دارچینی اور عنبر وغیرہ سے تیار کیا ہے۔
یہ آپ کے ایامِ جوانی کی واپسی اور قوت و توانائی کی
بحالی کی ضامن ہے۔
استعمال کیجیے اور سال بھر چُست رہیے۔
Hamdogen
Hamdogen
ہمدوجین
جب آپ خود کو جوان محسوس کرنا چاہیں۔
ہمدرد
ہر گھر کا جانا پہچانا نام

نامحرم

مسعود اشعر

دروازہ پر دستک ہوئی۔ دستک اس وقت ہوئی جب وہ اپنے فلیٹ میں ہی تھا۔ وہ اپنے فلیٹ میں اس وقت ہوتا جب بہت مجبوری ہوتی۔ جب اسے کہیں جانا نہ ہوتا۔ وہ صبح میں دفتر اور شام ہوٹل میں گذارتا کہ تمام دوست احباب ہوٹل ہی میں آجاتے تھے۔ اسے دوسرے ایسے شوق نہیں تھے کہ ان کے لیے اسے اپنے کمرے میں رہنا پڑتا۔ اس کی وجہ وہ اپنے آپ کو یہ بتایا کرتا تھا کہ اپنے محلے میں کاسان کو شریف بن کر رہنا چاہیئے۔ کہ سانپ ہر جگہ لہرا لہرا کر چلتا ہے لیکن اپنے بل میں ہمیشہ سیدھا گھستا ہے۔ البتہ اس کے دوست اسے کوئی اور ہی معنی پہناتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ شوق پالنے کے لیے ہمت اور حوصلہ چاہیئے جو بازار میں نہیں ملتا۔

دراصل یہ عصمت بی بی انبیے چارگی والی بات ہے" ایک منہ پھٹ نے ایک دن کہہ بھی دیا تھا۔

"تو گویا یہ میر صاحب ہیں؟" ایک اور نے اپنا علم بگھارا تھا۔

"میر صاحب؟ کسی کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی تھی۔

ہاں میر صاحب" اس شخص نے وضاحت کی تھی۔ "ہمارے گھر ایک صاحب کام کرتے تھے۔ ہم انہیں میر صاحب کہتے تھے۔ اچھی خاصی عمر کے آدمی تھے۔ بلیے چوڑے ہٹے کٹے۔ لیکن چہرے پر داڑھی مونچھ نہیں تھی۔ ہم انہیں چھیڑتے تو نہیں تھے لیکن ہماری باتوں سے انہوں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ ہمیں ان کی مردانگی پر شبہ ہے۔ اور ہو سکتا ہے باہر گلی محلے کے بچے انہیں چھیڑتے بھی ہوں۔ شاید اس لیے ایک دن بڑی رازداری کے ساتھ کہنے لگے۔ خان صاحب بس میرے داڑھی مونچھ نہیں ہے، ویسے اللہ کا فضل ہے۔" اس کے بعد ہمارا شبہ اور بڑھ گیا تھا۔

اس پر سب نے قہقہہ لگایا تھا اور اس کی طرف دیکھنے لگے تھے۔ لیکن قبل اس کے کہ کسی اور کی طرف سے فقرہ آتا اس نے خود ہی کہہ دیا تھا۔ ہاں، یہاں بھی اللہ کا فضل ہے۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ کون ہو سکتا ہے؟ وہ جھنجلا گیا وہ ہوٹل جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس نے بیزاری کے ساتھ دروازہ کھولا۔ وہ کھڑی تھی۔ وہ گھبرا گیا۔ یہ یہاں کیسے آگئی؟ یہ اور اس کے دروازے پر؟!

"آیئے آیئے.... آپ نے تو حیران کر دیا...." وہ اور کیا کہتا۔ وہ پیچھے ہٹا۔ اسے اندر آنے کا راستہ دیا۔ وہ اندر آئی۔ نظریں گھما کر کمرے کا جائزہ لیا۔ پھر معنی خیز انداز میں مسکرائی۔ وہ اور بھی گھبرا گیا پتہ نہیں کیا فقرہ چست کر دے۔ فلیٹ کا یہ کمرہ جو لِونگ روم یا ڈرائنگ روم تھا اس کی اپنی طرح بے ترتیب اور الٹ پلٹ تھا۔ وہ رکی اور ایک صوفے کی طرف بڑھی۔ شاید بیٹھنا چاہتی تھی۔ لیکن اُس صوفے پر کتابیں اور رسالے بکھرے پڑے تھے۔

"سنا تھا بیچلرز کا کمرہ بہت صاف ستھرا ہوتا ہے؟" وہ اپنے لئے جگہ بنانے لگی۔ لیکن اس نے خود ہی آگے بڑھ کر وہ سب کچھ وہاں سے ہٹا دیا۔ وہ بیٹھ گئی اور رسالے اُٹھا اُٹھا کر دیکھنے لگی۔ وہ بھی ایک کرسی پر ٹک گیا تھا اور

اس کے چہرے پر نظریں جمائے اپنی خاموشی سے اسے اکسا رہا تھا کہ وہ کچھ بولے۔ کچھ بتائے کہ وہ کیوں آئی ہے اسے کیا کام ہے اس سے؟ کسی وجہ کے بغیر تو وہ آ نہیں سکتی۔ لیکن اسے کیا کام ہو سکتا ہے اس سے؟

وہ خاموشی سے رسالے اور کتابیں کھنگال رہی تھی، جیسے وہ اسی کام سے وہاں آئی ہو۔

"در اصل وہ لڑکا جو یہاں کام کرتا ہے اس وقت چلا جاتا ہے" اس نے محض کچھ کہنے کے لیے کہا۔ آخر کسی کو کچھ بولنا چاہیئے تھا۔ اس طرح خاموش رہنا تو نہایت بدتمیزی ہے۔ اور پھر اس کا گھر تھا اس کا فرض تھا کہ وہ بات کرے۔

"تو پھر چائے نہیں مل سکتی؟" اسی لمحہ وہ بھی چائے کا پوچھنا چاہتا تھا لیکن وہ پہل کر گئی تھی۔

"ہاں ہاں، کیوں نہیں مل سکتی" یہ کہہ کر وہ اٹھا اور باورچی خانہ میں گھس گیا۔

"آپ سے تو چائے بنانا بھی نہیں آتی ہوگی لائیے میں بنائے دیتی ہوں" وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے آگئی تھی اور اس کے ہاتھ سے سارا سامان لے لیا تھا۔

وہ اسی اشتہاری ادارے میں کام کرتی تھی جہاں وہ ملازم تھا۔ اس لڑکی نے یا اس خاتون نے ——

—— اب یہ بھی بڑا مسئلہ ہے کہ اس قسم کی عورتوں کو کیا کہا جائے۔ چونکہ شادی نہیں ہوئی اس لیے لڑکی ہے۔ لیکن عمر تیس کے قریب ہے اس لیے خاتون ہے۔ ہم اپنا دل خوش کرنے کے لیے اسے لڑکی ہی کہہ دیتے تھے۔ خیر، تو اس لڑکی نے اپنے کھلے ڈلے پن، اپنے بے دھڑک انداز اور مردوں سے زیادہ بے تکلف زبان کی وجہ سے ہر شخص کو اپنے پیچھے لگا لیا تھا۔ لوگوں کی یہ گرویدگی بھی عجب تھی۔ ہر شخص اس کی طرف کھنچتا بھی تھا اور اسے برا بھلا بھی کہتا تھا۔ اس کے سامنے کسی کی مجال نہیں تھی کہ اس کے ساتھ ذرا سی بھی بے تکلفی کو یا اس کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کر دے۔ اس کے پیچھے سب اسے خدا جانے کن کن ناموں سے پکارتے تھے۔

وہ بھی اس کی بے باکی سے ڈرتا تھا لیکن اس کے قریب جانے کی کوشش بھی کرتا تھا۔ البتہ ایک بات اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ اس کے بہت ہی پیارے دوست کی بہت ہی گہری دوست ہے۔ وہ دونوں فلم میکنگ سیکشن میں تھے اور ایک ہی کمرہ میں بیٹھا کرتے تھے۔ لوگ ان دونوں کے بارے میں بہت سی باتیں بنایا کرتے تھے جو شاید.. صحیح بھی تھیں۔

ایک بار اس کے ساتھ اس کی لڑائی بھی ہو چکی تھی۔ لیکن یہ شروع کی بات ہے جب وہ نیا نیا اس دفتر میں آگیا تھا۔ خدا جانے کیا بات ہو رہی تھی کہ اس لڑکی کی بے دھڑک حرکتوں کا ذکر آگیا۔ جیسا کہ اکثر آجایا کرتا تھا۔ اس کے منھ سے نکل گیا۔ "عورتوں میں مردانہ پن اور مردوں میں زنانہ پن اچھا لگتا ہے مگر تھوڑا تھوڑا۔"

اسے علم نہیں تھا کہ وہ بھی کمرے آچکی ہے اور اس کے پیچھے کھڑی ہے۔ اسے اپنی غلطی کا احساس اس وقت ہوا جب وہ۔ "اچھا..." کہہ کر اس کے سامنے آگئی۔ "ذرا آپ کی شکل تو دیکھوں۔" یہ کہہ کر وہ اس کے اوپر جھکی تھی اور اپنا چہرہ اس کے چہرے کے قریب لاکر ناک سے سوں سوں کیا تھا۔ "اماں سے کہنا منھ دھلا دیں ابھی تک دودھ کی بساندھ آرہی ہے۔" پھر وہ سیدھی کھڑی ہوئی تھی اور دوسروں کو مخاطب کر کے کہا تھا۔ "ان سے کہو اپنی عمر سے بڑی باتیں نہ کیا کریں۔"

یہ کہہ کر وہ چلی گئی تھی اور وہ پسینہ میں نہا گیا تھا۔

"یار عورت ہے اس سے کیا لڑنا۔" اس نے شرمندگی مٹانے کے لیے کہا تھا اور سب ہنس پڑے تھے۔

اس نے چائے بنالی تھی اور وہ دونوں اپنے اپنے کپ اٹھا کر لے آئے تھے۔

وہ خاموشی سے چائے پی رہے تھے اور اس کے دل میں ہول اٹھ رہا تھا۔ یہ بولتی کیوں نہیں؟ کیوں آئی ہے میرے پاس؟ کیا میں اس سے پوچھ لوں؟

یک لخت اس کے چہرے سے ظاہر ہوا جیسے وہ کچھ سوچ رہی ہے، جیسے وہ بات کرنا چاہتی ہے لیکن سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ بات کس طرح شروع کرے۔ کیا وہ اس کی مدد کرے؟ لیکن کیسے۔؟

"آپ کے دوست نے بہت تنگ کیا ہے۔" آخر وہ بولی۔ اب وہ اس کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔ اس کی نگاہیں کھڑکی سے باہر کچھ دیکھ رہی تھیں۔

"میرے دوست نے؟" اس نے حیرت سے سوال کیا۔

"وہ آپ کا دوست نہیں ہے؟" اس نے دوست کا نام لیا۔

"ہاں، ہاں وہ میرا دوست ہے، لیکن آپ کو اس نے کیسے تنگ کیا۔۔ آپ دونوں کی تو۔۔۔۔"

"ہاں ہم دونوں کی بہت دوستی ہے اور ہم شادی بھی کرنا چاہتے ہیں۔۔۔۔"

"یہ تو بہت خوشی کی بات ہے۔" اس نے بات کاٹی۔

"خوشی کی بات تو ہے مگر وہ گڑبڑ کر رہا ہے۔" اس لڑکی نے جلدی سے کہا کہ کہیں وہ پھر بات نہ کاٹ دے "وہ کہتا ہے ابھی وہ شادی نہیں کرے گا۔"

"تو پھر؟" اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔

"میرے ماں باپ کینیڈا جا رہے ہیں وہاں سیٹل ہونے۔ اگلے مہینے وہ چلے جائیں گے۔ سارے کاغذات مکمل ہو چکے ہیں۔ میرے بھائی نے انہیں اسپانسر کیا ہے۔۔۔۔" وہ خاموش ہو گئی اور اس کی سمجھ میں اب بھی نہیں آیا کہ آخر مسئلہ کیا ہے۔

"آپ ان کے ساتھ نہیں جا رہی ہیں؟ سوال کرنے کے بعد اسے خیال آیا کہ بے تکا سوال ہو گیا ہے۔

"کیا بات کر رہے ہیں آپ؟ میں شادی کی بات کر رہی ہوں اور آپ کینیڈا جانے کی کہہ رہے ہیں۔" وہ غصہ میں بولی۔ "میں اس سے کہہ رہی ہوں اسی مہینے شادی کر لیتے ہیں۔ میرے ابو بھی یہی چاہتے ہیں۔"

اس کے دل میں ہول اٹھ رہا تھا یہ بولتی کیوں نہیں؟ کیوں آئی ہے میرے پاس؟ کیا میں اس سے پوچھ لوں؟

"مگر وہ تو جرمنی جا رہا ہے۔" اس نے اس لڑکی کو یاد دلایا۔

"یہی میں آپ سے کہنے آئی ہوں کہ آپ اسے سمجھائیں کہ وہ جرمنی جانے سے پہلے شادی کر لے۔"

"وہ چھ مہینے کے لیے جا رہا ہے۔" یہ بات اس نے جیسے اپنے آپ سے کہی تھی۔

"ہاں مجھے معلوم ہے۔" اس نے غصے میں کہا۔ "لیکن زیادہ دن بھی لگ سکتے ہیں۔"

"جی زیادہ دن بھی لگ سکتے ہیں وہاں اس کا کچھ اور کرنے کا ارادہ بھی ہے۔"

"یہی تو میں کہہ رہی ہوں۔ وہ شادی کے بعد چلا جائے ورنہ مجھے خطرہ ہے کہ میرے ماں باپ مجھے بھی ساتھ لے جائیں گے۔ میرا ویزا بھی بن چکا ہے۔"

ذہن جدید

"اچھا... تو آپ اتنی سیریس ہیں اس کے لیے؟" یہ بات شاید اس نے اپنی طرف سے مذاق میں کی تھی لیکن وہ سچ مچ بُرا مان گئی تھی۔

"ہاں میں اتنی ہی سیریس ہوں سمجھے آپ —"

"تو میں کیا کر سکتا ہوں۔" وہ ڈر گیا تھا۔ "وہ بھلا میری بات کیوں مانے گا۔"

"وہ صرف آپ کی ہی بات مانے گا۔ آپ اسے سمجھائیے شادی کے بعد آرام سے چلا جائے میرے ماں باپ کی خوشی بھی ہو جائے گی اور میں بھی یہاں رہ جاؤں گی" ۔

"اچھا میں کوشش کرتا ہوں" اس نے بے یقینی کے ساتھ کہا لیکن اس لڑکی کو یقین آ گیا۔ اور اس نے سوچا اس عمر اور اس زمانے میں بھی لوگ اتنے سیریس ہو سکتے ہیں کس کے لیے۔ اور پھر یہ لڑکی؟

اس شام وہ ہوٹل نہیں گیا۔ اپنے دوست کے گھر گیا۔ اسے سمجھانے کہ اتنی اچھی لڑکی کیوں چھوڑتا ہے۔ اس کے دوست نے اس کی بات نہیں مانی لیکن بڑے زور شور سے اعلان کیا کہ شادی کرے گا تو اس کے ساتھ ورنہ شادی نہیں کرے گا۔"

"تو پھر کر لو شادی۔"

"یار یہ بھی کوئی گڈے گڑیا کا کھیل ہے۔ میں اپنے جانے کی تیاری میں لگا ہوں اور پھر میری بہن انگلینڈ میں ہیں۔ وہ بھی اتنی جلدی نہیں آ سکتیں وہ تو تماشہ سمجھتی ہے شادی کو..."

"لیکن اس کے ماں باپ کینیڈا جا رہے ہیں..."

"تو کیا ہوا میں نے سوچ رکھا ہے کہ جرمنی سے واپس آ کر شادی کریں گے پھر کینیڈا بھی ہو آئیں گے۔"

"یعنی تمہاری بہن کا تو شادی میں شرکت کرنا ضروری ہے اور اس کے ماں باپ کی شرکت ضروری نہیں ہے؟" اسے غصہ آ گیا۔ کیا بک رہے ہو۔

"میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں۔ میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ سب کچھ جلدی میں ہو رہا ہے۔ میرا جرمنی جانا بھی اچانک ہو گیا ہے اور اس کے گھر والے بھی اچانک جا رہے ہیں۔"

"پھر؟"

"پھر یہ کہ میری سمجھ میں بھی نہیں آ رہا ہے میں کیا کروں۔ میرے ماں باپ اتنی جلدی تیار نہیں ہیں۔"

"تو پھر وہ کینیڈا چلی جائے گی۔"

"نہیں، اسے کینیڈا نہیں جانا چاہیئے۔ تم میرے لیے اتنا نہیں کر سکتے کہ اسے روک لو۔ میں وعدہ کرتا ہوں جلد سے جلد واپس آنے کی کوشش کروں گا۔ اسے کینیڈا نہیں جانا چاہیئے میرے پیارے بھائی تم اسے روک سکتے ہو نا؟ میرے ماں باپ بہت ہی پرانے خیال کے لوگ ہیں انہیں منانے کے لیے بہت محنت کرنی پڑے گی۔"

"تو اصل قصہ یہ ہے؟" اس نے محسوس کیا جیسے اس کے اپنے ساتھ دھوکا کیا جا رہا ہے۔ "تو پھر اسے دھوکا کیوں دے رہے ہو؟"

"تمہاری قسم میں دھوکا نہیں دے رہا ہوں۔ میں اسے جی جان سے چاہتا ہوں میں اس کے بغیر اپنا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ لیکن میری سمجھ میں بھی نہیں آتا میں کیا کروں۔ اسے بھی سچی بات نہیں بتا سکتا۔ پھر میں نے طے کر لیا ہے شادی کروں گا تو اس سے۔"

"تو کیسے کرو گے؟"

"تم میری مدد کرو، میرے پیارے بھائی۔ اس کے ماں باپ بہت روشن خیال ہیں۔ ان کی بیٹی اگر یہاں رہ جائے اور اپنی مرضی سے شادی کرلے تو انہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

"لیکن وہ تو آج بھی تیار ہیں شادی پر۔"

"ہاں میں جانتا ہوں۔ میں ان سے ملتا رہتا ہوں۔ وہ بہت اچھے لوگ ہیں۔"

"تم نے عجیب الجھن میں ڈال دیا ہے۔ میں کیا کر سکتا ہوں؟"

"تم اکیلے نہیں ہم دونوں مل کر کوشش کریں گے"

پھر دونوں نے مل کر کوشش کی اور وہ لڑکی اور اس کے والدین اس پر رضامند ہوگئے۔ طے یہ ہوا کہ وہ لڑکی چھ مہینہ اپنے ایک رشتے کے ماموں کے پاس رہے گی اس کے دوست کی واپسی پر شادی ہوجائے گی اور پھر وہ دونوں بھی کینیڈا جائیں گے۔

دوسرے دن کا سورج مغرب سے طلوع ہوا تھا۔ انہونی ہو چکی تھی۔ سب دھوکہ کھا چکے تھے سب دھوکہ دے چکے تھے۔

"میرے پیارے بھائی۔" اس دوست نے چلتے وقت ائیرپورٹ پر اس کے گلے میں ہاتھ ڈال کر کہا۔ "اب تم اس کا خیال رکھو گے میری طرف سے اسے کوئی تکلیف نہ ہونے پائے۔"

"وہ کسی کے خیال رکھنے کی محتاج ہے؟ وہ تو دوسروں کا خیال رکھ سکتی ہے۔" اس نے اپنے دوست کو خوش رکھنے کے لیے کہا۔

"ارے تم اسے نہیں جانتے۔ اس کی ساری مردانگی اوپر اوپر ہی ہے۔ اندر سے وہ عورت ہی ہے۔ بڑی کمزور عورت۔ ذرا سی بات پر رونا شروع کرتی ہے تو لگتا ہے جیسے ابھی ساری کی ساری پگھل جائے گی۔"

"یہ تمہارے اندر کا مرد بول رہا ہے۔" اس نے اپنی روشن خیالی کا اظہار کیا۔

"بس تم اس کا خیال رکھنا" اور وہ چلا گیا۔

اس لڑکی کے ماں باپ بھی کینیڈا چلے گئے اور وہ اپنے ماموں کے ہاں رہنے لگی۔

اب وہ اس کا اس طرح خیال رکھتا کہ کسی نہ کسی بہانے اس کے گھر میں چلا جاتا۔ اس کے ماں باپ اور اس دوست کی باتیں کرتا رہتا۔ اسے خوش کرنے کی کوشش کرتا وہ چاہتا تھا کہ وہ لڑکی کسی قسم کی کمی محسوس نہ کرے اس لیے اس نے اسے اپنے ساتھ تقریبوں میں بھی لے جانا شروع کر دیا۔ پہلے بھی وہ تقریبوں میں جانے کی بہت شوقین تھی لیکن اب وہ یہ اہتمام کرتا کہ وہ اس کے ساتھ ہی جائے۔

اس کے دوست کے خط بھی آتے تھے۔ اس کے پاس بھی اور اس لڑکی کے پاس بھی۔ کبھی کبھی وہ فون بھی کرتا تھا لیکن یہ فون اس لڑکی کے لیے ہوتے تھے اس کے لیے نہیں۔ اس کے پاس جو خط آتے اس میں بھی اس لڑکی کا ہی زیادہ ذکر ہوتا کہ اس کا تم خیال رکھتے ہو یا نہیں۔ اگر اسے ذرا سی بھی تکلیف ہوئی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا، وغیرہ وغیرہ۔ وہ لڑکی تو اپنے خط اسے نہیں دکھاتی تھی لیکن وہ اپنے خط اس لڑکی کو ضرور دکھا دیتا تھا کہ اسے اطمینان رہے۔

پھر ملک اندر بھاری بوٹوں کی دھمک اپنے عروج پر پہنچ گئی ڈیڑھ دو سال سے لوگ جن مکروہ شکل

.بونوں کو ایک عارضی عذاب سمجھ کر برداشت کر رہے تھے۔ ان بونوں نے قد نکالنا شروع کر دیئے۔ ساری دنیا اتھل پتھل ہو گئی نوے دن نوے برسوں میں بدلنے لگے۔ بڑی بڑی سیسہ پلائی دیواریں گرنے لگیں۔ اب جس شخص کا قد بھی ان بونوں سے ذرا سا بھی نکلتا نظر آتا ان کے سر قلم کیے جانے لگے۔ آنکھوں کانوں اور زبان پر قفل لگنے لگے اور دماغوں پر شکنجہ سخت کیا جانے لگا۔

اب ہر شخص ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکتا، کچھ بولنا چاہتا لیکن دوسرے شخص کی کٹی زبان دیکھ کر خاموش ہو جاتا۔

نہ جانے کیا ہوا کہ اُس کا فلیٹ اچانک ان سر پھروں کی پناہ گاہ بن گیا جن کے ہاتھ پاؤں ناک کان اور زبان سلامت رہ گئی تھی۔ اور جو انہیں سلامت رکھنا چاہتے تھے۔ جو تازہ ہوا میں سانس لینے کو بے چین تھے۔ جو اپنی زبانوں پر پھپھوندی نہیں لگنے دینا چاہتے تھے۔ — جو اپنے آپ کو یہ یقین دلانا چاہتے تھے کہ ابھی وہ زندہ ہیں اور زندہ انسانوں کی طرح اِس دنیا میں رہنا چاہتے ہیں۔

وہ دن بھر اپنا منھ اپنے کان اور اپنی آنکھیں بند رکھتے اور شام ہوتے ہی اُس کے فلیٹ کی طرف دوڑتے۔ اُن سب کے اپنے خیالات تھے، اپنے نظریات تھے، اپنے فلسفے تھے، لیکن وہ سب اس بات پر متفق تھے کہ اگر بولیں گے نہیں تو گھٹ کر مر جائیں گے۔ اور وہ مرنا نہیں چاہتے تھے۔

خوب باتیں ہوتیں، خوب بحثیں ہوتیں، خوب شور مچایا جاتا۔ ایک دوسرے کو لپٹ لپٹ کر پیار کیے جاتے ایک دوسرے کے سر پر اینٹ بڑے توڑنے کی کوشش کی جاتی۔ ایک دوسرے کے منھ نوچے جاتے۔

جب سب لوگ بول بول کر اور چیخ چیخ کر تھک جاتے تو بولنے کا کام روشن آرا بیگم، امانت علی خاں، نزاکت سلامت بھیم سین جوشی یا جون ایئز اور کلف رچرڈ کے سپرد کر دیا جاتا۔ اب یہ فلیٹ اس کا نہیں تھا سب کا تھا کہ ہر اس شخص کا تھا جو بولنا چاہتا تھا، جو کچھ کرنا چاہتا تھا، صرف بول کر، صرف چیخ کر اور گلا پھاڑ کر۔

وہ بھی اس فلیٹ میں آنے لگی تھی۔ آتی وہ پہلے بھی تھی لیکن اب وہ شام کے ہنگاموں میں بھی شریک ہوتی۔ پہلی بار وہ آئی تھی اسے اچھا نہیں لگا وہ نہیں چاہتا کہ ان لوگوں میں وہ بیٹھے اور ان کی واہی تباہی سنے کئی دن وہ پریشان رہا۔ وہ چاہتا کہ اپنی پریشانی کا اظہار اس کے سامنے بھی کر دے لیکن اس سے ڈرتا تھا۔ کیسے کہے اس سے؟ کیا کہے؟

تیسرے دن پتہ نہیں کس رَو میں اس کے منھ سے وہ بات نکل گئی۔ بس پھر کیا تھا۔ وہ بھڑک اٹھی۔ "آخر مرد ہو نا۔ وہی بدبودار اور گھناؤنے مرد جو عورت کو کمزور سمجھتے ہیں۔ جو سمجھتے ہیں کہ عورت خراب ہو جائے گی مرد کی حفاظت کے بغیر عورت اپنے آپ کو نہیں بچا سکتی....."

"نہیں میرا مطلب یہ نہیں تھا...." اس نے کہنے کی کوشش کی مگر اس نے ایک نہیں سنی بولے گئی۔

"ننھے میاں میں اپنی حفاظت کرنا خوب جانتی ہوں۔ تھینک یو ویری مچ فار یور کنسرن...."

وہ شرم کے مارے کچھ کہہ بھی نہیں سکتا تھا وہ تو صرف اس کے ناراض ہونے سے ڈرتا تھا۔

وہ ناراض تو ہوئی لیکن اس نے غصہ میں اور بھی شام کو آنا شروع کر دیا اور اب وہ زیادہ دیر تک بیٹھتی تھی۔ اتنی دیر کہ رات کو اسے ہی اس کے گھر چھوڑ کر آنا پڑتا۔

در اصل ابھی تک وہ اسے سمجھ نہیں پایا تھا۔ یعنی اسے اس کے مزاج کا پتہ نہیں چلتا تھا۔ کبھی تو بڑی سے بڑی

بے تکلفی پر بھی خوش ہوتی تھی اور کبھی ذرا سی بات پر تن فن ہو جاتی تھی۔

ایک شام ٹیلی وژن پر مہدی حسن کوئی غزل گا رہا تھا جس کا قافیہ تھا تنہائی، ہرجائی وغیرہ۔ اسے شرارت سوجھی۔ غزل ختم ہوئی تو اس نے خاص طور سے اس لڑکی کو مخاطب کر کے کہا "ایک شعر ہو گیا ہے"۔

اس نے تو کوئی جواب نہیں دیا دوسروں کی طرف سے آواز آئی۔ "ارشاد"

اس نے اس لڑکی کی طرف دیکھا۔ وہ بھی شوق کے ساتھ اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

اس نے شعر پڑھا۔

جب بھی شوہر سے وہ روٹھی تو میرے پاس آئی
بس یہی بات ہے اچھی مری ہمسائی کی

اس کا خیال تھا کہ اس کا قہقہہ بلند ہو گا جو سب کے قہقہوں پر چھا جائے گا اور وہ اس کی تعریف کرے گی۔

لیکن وہ ناراض ہو گئی تھی۔ "واہ واہ۔" اس نے زہر بھرے لہجے میں۔ "بہت اچھے لگتے ہیں آپ ایسی باتیں کرتے آپ کی مردانگی اسی میں ہے کہ اس طرح کی گندگی اچھالتے رہیں۔ آپ لوگ بس اسی سہارے جیتے ہیں کہ اومی کسی سے ناراض ہو کر گئے اور آپ کے کندھے پر سر رکھ کر رونے لگے۔"

"شرم کرو اتنی اچھی غزل خراب کر دی، افسوس"۔

"اوہ، یہ تو مذاق کی بات تھی۔ آپ تو سچ مچ ناراض ہو گئیں۔" کسی نے کہا۔

"میں بھی مذاق کی بات ہی کر رہی ہوں آپ لوگوں کے مذاق کی۔ اور آپ لوگوں کی ذہنیت کی۔"

اور پھر وہ اٹھ کر چلی گئی۔ اس نے بہت روکنے کی کوشش کی مگر وہ نہ مانی۔ اس دن وہ اس کے ساتھ بھی نہ ہنسیں گئی۔

عجیب عورت ہے۔ اپنے منھ میں جو آتا ہے بکے جاتی ہے۔ دوسرا ایسی بات کہہ دے تو ناراض ہو جاتی ہے کسی نے کہا۔

"ہنتہ بنتی ہے سالی" کسی اور نے کہا اور اسے غصہ آگیا۔

"بکواس نہ کرو۔ اس کے سامنے بات کرتے جان نکلتی ہے۔ اب بک بک کر رہے ہو۔" وہ کھڑا ہو گیا۔

"اپنے عورت ہونے کا فائدہ اٹھاتی ہے سالی۔ یہ عورتیں بھی بس۔۔۔۔" پہلا شخص اور کچھ بولنے لگا تھا کہ اس سے جھڑک دیا۔

"منھ سنبھال کر بات کرو۔ تمہیں بھی کوئی گالی دے سکتا ہے۔ بک بک کئے چلے جا رہے ہو۔"

"اچھا تو۔۔۔۔ تو یہ بات ہے؟ معاملہ اب یہاں تک پہنچ گیا ہے؟!" اس ان سب نے معنی خیز انداز میں قہقہہ لگایا۔

"کچھ نہیں کچھ نہیں۔ ہم تو کچھ نہیں کہہ رہے ہیں۔ ہم تو صرف یہ کہہ رہے ہیں کہ وہ تمہارے دوست کی دوست ہے۔ اور دوست کے دوست ہی ہوتے ہیں۔ تمہارا حق ہے تم جو چاہو کرو۔۔۔۔۔"

"اگر تم نے بکواس بند نہ کی تو میں تم سب کو کمرے سے باہر نکال دوں گا بکواس کئے چلے جا رہے ہو۔ شرم نہیں آتی تمہیں۔۔۔۔۔" اب اسے اپنے غصے پر حیرت ہونے لگی تھی۔ وہ اتنا ناراض کیوں ہو رہا ہے؟ آخر وہ آپ سے باہر کیوں ہوا جا رہا ہے؟ عام حالات میں تو وہ ایسی باتوں پر خود بھی قہقہہ لگا دیتا تھا ہنسنے والوں کے ساتھ

خود بھی ہنس دیتا تھا آج اسے کیا ہوا ہے؟ لیکن یہ لوگ بھی تو زیادتی کر رہے ہیں۔ انہیں کیا حق پہنچتا ہے ایسی باتیں کرنے کا!

دوسرے دن صبح ہی صبح وہ اس کے گھر گیا۔ بہانہ یہ بنایا کہ کسی کام سے ادھر آیا تھا سوچا تمہیں بھی ساتھ ہی دفتر لیتا چلوں۔ وہ رات کی بات شاید بھول چکی تھی۔

پھر وہ قیامت کی رات آگئی جس کی آخری ساعتوں میں پوری تاریخ سولی پر چڑھ گئی۔ جس کی آخری گھڑیوں میں تاریخ کا چلتا دھارا واپس مڑ گیا۔ وہ رات جس کے بعد یوم نشور تھا۔ ایک طویل اور نہ ختم ہونے والا یوم نشور۔

دو دن پہلے سے عجیب سی افواہیں گشت کر رہی ہیں۔ کوئی کہتا پھانسی ہوگی، کوئی کہتا نہیں ہوگی۔ جو کہتے پھانسی ہوگی ان کے پاس کافی وزنی دلائل تھے اور جو کہتے پھانسی نہیں ہوگی ان کے سامنے بھی چند معقول شواہد تھے۔ یہ دونوں راتیں اس فلیٹ میں لڑائی جھگڑے کی راتیں تھی، ایک دوسرے سے گلے ملنے اور ایک دوسرے کا منھ نوچنے کی راتیں تھیں۔

اس رات اس کا فلیٹ ایک مہیب سناٹے کی زد میں تھا سب لوگ شام سے ہی آگئے تھے لیکن خاموش تھے۔ جیسے سب کسی کا انتظار کر رہے ہوں۔ کسی بولنے والے کا انتظار۔ ایسا بولنے والا جو ان کے دل کی بات کہہ دے جو ان کی خواہش کے مطابق بات کرے۔

وہ بھی سہ پہر سے وہاں تھی اور ایک کونے میں بیٹھی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی سب سے الگ تھلگ، اپنے آپ میں گم پچھلے چند دنوں سے وہ سب سے زیادہ پریشان تھی۔ ہر ایک سے پوچھتی پھرتی تھی۔ کیا ہوگا؟ اور ان کا جواب سننے کے بعد ان سے لڑ پڑتی تھی سیاست سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ کبھی اس نے کسی سیاست داں کے بارے میں کلمۂ خیر نہیں کہا تھا۔ لیکن پھانسی کی خبر دینے کے بعد اچانک اسے سیاست سے دلچسپی ہوگئی تھی اور وہ ہر وقت سیاست کی باتیں ہی کرتی رہتی تھی۔ اٹھتے بیٹھتے ان سب کو منھ بھر کے گالیاں دیتی جو اس ڈرامہ میں شریک تھے جنھوں نے یہ ساری بساط بچھائی تھی اور جو اس خونی بساط کے بے جان مہرے تھے۔

"آج کی رات خیریت سے گذر گئی تو پھر کچھ نہیں ہوگا۔" کسی نے ہمت کر کے خاموشی کی موٹی دیوار کو توڑا کہنے والا خاصا معتبر آدمی تھا۔

"وہ اسے نہیں چھوڑیں گے" اتنے ہی ایک اور معتبر شخص نے اپنی رائے دی۔ "وہ ان کی موت ہے۔"

اس لڑکی نے کتاب پر نظر اٹھائیں۔ بولنے والوں کو ایک ایک کر کے دیکھا اور پھر کتاب پر نظریں جھکا لیں اب سب کی زبانیں کھل گئی تھیں ہر شخص قیاس آرائیاں کر رہا تھا۔ سیاسی اور تاریخی تجزیہ کے نام پر اپنی خواہشات بیان کر رہا تھا— "ایسا ہو ہی نہیں سکتا—" "ایسا ہی ہوگا۔" "کوئی انسان اتنا کمینہ نہیں ہو سکتا" "انسان اتنا ہی کمینہ اور اتنا ہی خبیث ہوتا ہے۔"

اب وہ اٹھی۔ کتاب ایک طرف رکھی اور دوسرے کمرے میں جا کر بستر پر لیٹ گئی۔ وہ بھی کسی بہانے اٹھا اس کمرے میں گیا۔ سوچا معلوم کرے طبیعت تو خراب نہیں ہے۔ لیکن اس کی آنکھیں بند تھیں وہ کروٹ لیے لیٹی تھی جیسے وہ نہیں چاہتی کہ اس سے کوئی بات کرے۔ وہ خاموشی سے واپس آگیا۔

ابھی وہ واپس آیا ہی تھا کہ پیچھے پیچھے وہ بھی تیزی کے ساتھ آئی اور اس کا کندھا ہلا کر بولی۔ "دیوان حافظ ہے تمہارے پاس؟"

"دیوان حافظ؟" وہ حیران ہوا۔ "دیوان حافظ کا کیا کرو گی؟"

"فال نکالیں گے"۔ وہ گھبرا گھبرا کر بول رہی تھی جیسے وہ بہت جلدی میں ہو۔

"کیا۔۔۔؟!" سب جیسے اس کی عقل پر شبہ کر رہے تھے۔ "ہم فال نکالیں گے؟"

"یہ تم کہہ رہی ہو؟" اس نے تعجب سے اس کے منھ کو دیکھا۔

"کیوں؟ میں نہیں کہہ سکتی، میں اس سوسائٹی میں نہیں رہتی؟" اس نے پھر اس کا کندھا پکڑ کر زور سے ہلایا۔ "بتاؤ دیوان حافظ کہاں ہے"

"یہ ہماری مایوسی اور بے ہمتی کی انتہا ہے۔" ایک صاحب نے نہایت افسردہ آواز بنا کر کہا۔

"آپ خاموش رہیئے۔" اس لڑکی نے ڈانٹ دیا۔

پھر وہ خود ہی دوسرے کمرے میں گئی اور دیوان حافظ اٹھا لائی پھر نہایت خضوع وخشوع کے ساتھ بیٹھ گئی۔ اب سب کی نظریں اس پر لگی ہوئی تھیں۔ اس نے آنکھیں بند کر کے کچھ پڑھا۔ پھر یک دم آنکھیں کھول کر دیوان کو بیچ میں سے کھول دیا۔ ایک شعر پر انگلی رکھی اور اس کی طرف دیوان بڑھایا۔۔۔ "پڑھو کیا شعر ہے" اب سب سنجیدہ تھے۔ کسی کی مجال نہیں تھی کہ ذرا سی بھی مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر لائے۔ شاید سب اپنے دل میں لسان الغیب کی غیب دانی کے قائل تھے۔ سب ہی مانتے تھے کہ لسان الغیب جھوٹ نہیں بولیں گے۔ اب سب انتظار میں تھے کہ انہیں شعر سنایا جائے۔ اور شعر کا مطلب بیان کیا جائے۔

اس نے پہلے ہونٹوں میں شعر پڑھا۔ پھر بے ساختہ نعرہ لگایا۔ "لو، کام آسان ہو گیا۔"

"کیا شعر ہے؟" سب نے بیک آواز کہا۔"

"مطلب بتاؤ" اس لڑکی نے ان کے ساتھ ہی کہا۔

اس نے شعر پڑھا۔

رسید مژدہ کہ ایام غم نخواہد ماند
چنیں نہ ماند وچناں نیز ہم نخواہد ماند

اس نے اس شعر کا مطلب بیان کیا تو سب کے منھ سے ایک ہی آواز نکلی — واہ۔۔۔ اور سب کے چہرے کھل اٹھے ہوں لگا جیسے سب کو عمر قید سے رہائی مل گئی ہو۔ جیسے سب پھانسی کے تختے سے زندہ سلامت اتار لئے گئے ہوں۔ پھر سب بولنے لگے۔

ہاں یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے۔

اتنا آسان نہیں ہے ایسا کرنا۔

ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ دروازہ کھلا اور ایک شخص نمودار ہوا۔ وہ ان لوگوں کے لیے اجنبی نہیں تھا لیکن اتنا مانوس بھی نہیں تھا۔ کبھی کبھی آتا تھا اور وہ بھی ایسی خبریں سنانے جن کے بارے میں وہ تاثر یہ دیتا تھا کہ وہ اندر کی خبریں ہیں۔ وہ کسی سفارتی دفتر میں کام کرتا تھا۔

"واہ کیا موقع پر آتے ہو" کسی نے پورے فلیٹ کی ترجمانی کی۔ "کیا خبر لائے ہو جلدی بتاؤ۔"

وہ پہلے مسکرایا پھر ایک خالی جگہ دیکھ کر بیٹھنے لگا۔ لیکن پھر کچھ سوچا اور دروازے کی چوکھٹ سے

ہی لگ کر کھڑا ہو گیا۔

"بولو بھئی،" بولتے کیوں نہیں۔"

"خوش خبری لایا ہوں" اس نے اپنا لہجہ پر اسرار بناتے ہوئے کہا اور پھر مسکرا دیا۔

"خوش خبری؟" وہ لڑکی جو ابھی تک دیوان حافظ میں گم تھی اچانک اچھلی اور اس شخص کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔ "کیا خوشخبری ہے بتاؤ نا۔ بتاتے کیوں نہیں۔"

"پھانسی نہیں ہو رہی ہے" اس نے اپنا لہجہ اور بھی پر اسرار کر لیا۔ آواز اتنی دھیمی کر لی جیسے سرگوشی کر رہا ہو۔"

"کہاں سے ملی یہ خبر؟" اب اس لڑکی نے اپنے دونوں ہاتھوں میں اس کا بازو بھینچ لیا تھا۔

"ظاہر ہے اس کے سفارت خانے سے ملی ہو گی اور کہاں سے ملی گی۔ ایک شخص نے جو اپنے آپ کو بہت بقراط سمجھتا تھا طنز کے ساتھ کہا۔

"چپ رہو۔ بات کرنے دو" اس لڑکی نے ان صاحب کی بزرگی کا کوئی خیال نہیں کیا۔

"نہیں میرے سفارت خانے سے نہیں ملی ہے۔۔۔۔"

"تو پھر کہاں سے ملی ہے؟" وہ لڑکی چاہتی تھی کہ جلد سے جلد اس کی تسلی ہو جائے۔ اسے اطمینان ہو جائے کہ لسان الغیب نے سچ ہی کہا ہے اور وہ شخص اس کے ساتھ کھیل رہا تھا۔

"ابھی فرنچ سفارت خانے کا آنریری کونسل آیا تھا۔ وہ بتا رہا تھا۔۔۔"

"کیا بتا رہا تھا؟" اس لڑکی کی بے چینی دور نہیں ہوئی تھی۔

"وہ کہہ رہا تھا اس کے سفارت خانے کو یقین دلایا گیا ہے کہ پھانسی نہیں ہو گی"

"کس نے یقین دلایا ہے؟" اس لڑکی کے خیال میں بات ابھی پوری نہیں ہوئی تھی۔

"کیسی باتیں کر رہی ہو۔" وہ بقراط پھر بولا۔ "کون یقین دلا سکتا ہے۔"

"میں آپ سے بات نہیں کر رہی ہوں۔ میں ان سے پوچھ رہی ہوں" اس نے خبر لانے والے شخص کے بازو چھوڑ دیے اور ان صاحب کی طرف بڑھی، وہ صاحب جھینپ کر پیچھے ہٹ گئے۔

"جی آپ بتا رہے تھے۔۔۔۔" وہ خود خبر لانے والے شخص کی طرف مڑی لیکن وہ جا چکا تھا وہ جس خاموشی سے آیا تھا اسی خاموشی سے واپس چلا گیا تھا۔ شاید اس کا کام ختم ہو گیا تھا۔

ویسے اب کسی کو اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ انہیں وہ خبر مل چکی تھی جو وہ چاہتے تھے۔ جس کی وہ آرزو کر رہے تھے۔ اب سب خوشیاں منا رہے تھے۔ خوب ہنگامے کر رہے تھے۔ اور جب خوب دھت ہو گئے تو گاتے گنگناتے ہوئے باہر نکل گئے۔

"چلو تمہیں گھر چھوڑ آؤں۔" اس نے اس لڑکی سے اسی طرح کہا جیسے روز کہتا تھا۔ لیکن وہ اسی طرح بیٹھی اسے گھورتی رہی پھر انگڑائی لے کر فرش پر پاؤں پھیلائے اور دیوار سے پیٹھ لگا کر پسر گئی۔۔۔۔" بہت تھک گئی ہوں۔ اٹھنے کو جی نہیں چاہ رہا ہے۔

"اچھا چلو مذاق نہیں کرتے۔ بہت دیر ہو گئی ہے" اس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھانے کی کوشش کی۔ "میں یہیں قالین پر سو جاؤں گی تم سے کچھ نہیں کہوں گی۔ سچ کہہ رہی ہوں میرا اٹھنے کو بالکل جی نہیں چاہ رہا ہے

وہ اور بھی نیچے کو کھسک گئی۔

"تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہوا ہے۔ چلو اٹھو۔ . . ." اس نے اس کا ہاتھ اور زور سے کھینچا۔

"افوہ تم تو میرا ہاتھ ہی توڑ ڈالو گے۔" اس نے اپنی ٹانگیں سیکڑ لیں مگر دیوار سے لگی بیٹھی رہی۔

"عورتوں اور مردوں کے درمیان وہ دوستی نہیں ہو سکتی جو مردوں مردوں کے درمیان ہوتی ہے؟" اس نے نہایت سنجیدگی سے سوال کیا۔

"کیوں نہیں ہو سکتی" اس نے بھی اسی سنجیدگی سے جواب دیا۔ "بلکہ عورت اور مرد کی دوستی ــــ یہ جسے دوستی کہتے ہیں اور کچھ نہیں کہتے ــــ ہوتی ہی اس وقت ہے جب ان کے درمیان کسی دوسری خواہش کا پردہ حائل نہ ہو۔"

"یہ مانتے ہو نا؟" وہ تھوڑی سی سیدھی ہو گئی۔

"ہاں ہاں مانتا ہوں۔ لیکن . . . ."

"لیکن کیا؟"

"لیکن یہ کہ آخر بندہ بشر ہے نیت میں فتور آ سکتا ہے۔" یہ بات اس نے اس لڑکی کو ڈرانے کے لیے کہی جو خواہ مخواہ اسے مصیبت میں ڈال رہی تھی۔ اگر اس شخص کو پتہ چل گیا جو جرمنی میں بیٹھا ہے تو قیامت آ جائے گی۔

"یہ نیت میں فتور کیا ہوتا ہے؟" وہ ماننے والی نہیں تھی۔

"نیت میں فتور؟" اس نے کچھ سوچا۔

"ہوں . . . .؟"

"لوگ اچھی چیزوں کو بڑا نام دیتے ہیں۔" "اب کیا کیا جائے۔" وہ اسے اچھی طرح ڈرانا چاہتا تھا۔

"میں تمہیں اچھی طرح جان گئی ہوں۔ تم صرف لوگوں سے ڈرتے ہو۔ چڑیا کا سا دل ہے تمہارا۔"

"ہاں، دراصل میں شماتت ہمسایہ سے ڈرتا ہوں۔"

"یہ کون ہے؟"

"ہمسایہ کی اماں . . . ." اس نے کہا اور اسے کھینچ کو کھڑا کر دیا۔

"تمہیں اپنے ہمسایوں کا بہت خیال رہتا ہے۔ کبھی ان کی بیویوں کا ذکر کرتے ہو اور کبھی ان کی اماں کا۔" وہ بھی چلنے کو تیار ہو گئی تھی۔ "چلو، تم بھی کیا یاد کرو گے۔ چلے جاتے ہیں یہاں سے۔ ڈر کے مارے تمہیں رات بھر نیند نہیں آئے گی۔ صبح کو اکڑے پڑے ہو گے تم یہاں۔ فائر بریگیڈ منگانا پڑے گا بستر سے نیچے اتارنے کے لیے۔"

راستے بھر دونوں خاموش رہے تھے۔ وہ کیا سوچ رہی تھی؟ اسے نہیں معلوم لیکن وہ سوچ رہا تھا ہماری اخلاقیات بھی کتنی منافقانہ ہیں۔

اور جب اس نے اس کے دروازے پر اسے اتارا تو اس لڑکی نے اس کا کندھا تھپ تھپاتے ہوئے کہا "زیادہ نہ سوچا کرو۔" اور اس نے اس کے سر پر ہلکا سا چپت لگا دیا۔

دوسرے دن کا سورج مغرب سے طلوع ہوا تھا۔ انہونی ہو چکی تھی۔ سب دھوکا کھا چکے تھے۔ سب دھوکا دے چکے تھے۔ لسان الغیب، فرانسیسی سفارت خانہ، سارے فلسفے، ساری منطق اور ساری سیاسی

اخلاقیات، سب کے سر نیچے ہو گئے تھے۔ منافقت، ریاکاری، فریب اور جھوٹ سر بلند ہو گئے تھے اور شیطانی قہقہے لگا رہے تھے۔

اسے صبح ہی صبح خبر مل گئی تھی۔ اور وہ سیدھا اس کے گھر کی طرف دوڑا تھا۔ اسے سب سے پہلے اس کا خیال آیا تھا۔ اس نے کس دل سے یہ خبر سنی ہوگی ؟ اس وقت اس کے پاس کسی کو ہونا چاہیئے تھا۔

لیکن وہ گھر پر نہیں تھی ــ کہاں گئی ؟ کچھ پتہ نہیں۔ کسی کے ساتھ گئی ہے ؟ نہیں، اکیلی ہی گئی ہے اس نے ناشتہ بھی نہیں کیا۔ کچھ کہے بغیر ہی چلی گئی۔ کہاں جا سکتی ہے اتنی صبح ہی صبح ؟ ــ "وہ کسی کو بتا کر تھوڑی ہی جاتی ہے۔ اپنی مرضی کی مالک ہے جب چاہتی ہے آتی ہے۔ جب چاہتی ہے چلی جاتی ہے۔ اس نے تو ہوٹل سمجھ رکھا ہے اس گھر کو۔

اس وقت وہ رشتے داروں کی شکایت سننے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اسے تو فکر یہ تھی کہ اس وقت وہ کہاں گئی ہوگی۔ اس پر کیا بیت رہی ہوگی ــ وہ اس کی دو تین سہیلیوں کا گھر جانتا تھا۔ وہاں گیا مگر وہ وہاں بھی نہیں تھی۔

وہ ادھر ادھر چکر لگاتا دفتر پہنچ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ دفتر تو ضرور آئے گی۔ وہ انتظار کرتا رہا۔ لوگ آنے لگے تھے۔ ہر ایک اپنی اپنی بات کہہ رہا تھا۔ اپنی رائے ظاہر کر رہا تھا۔ ہر ایک اپنی خواہش کے مطابق اس واقعہ کا تجزیہ کر رہا تھا۔ کچھ ایسے بھی تھے جو اس پر خوش تھے اور اپنی خوشی کی وجہ بیان کر رہے تھے۔ اور کچھ لوگ ان سے مرنے مارنے پر تلے ہوئے تھے۔ کچھ ایسے بھی تھے جنہیں چپ لگ گئی تھی۔ وہ خاموشی سے سب کی باتیں سن رہے تھے۔ وہ انہیں میں شامل تھا۔ لیکن اس کی وجہ کوئی اور بھی تھی۔ وہ دوپہر تک نہیں آئی تھی۔ اس کا کوئی فون بھی نہیں آیا تھا۔

وہ سر درد کا بہانہ کر کے دفتر سے جلد اٹھ آیا۔ اس کے گھر کا ایک چکر اور لگایا۔ وہ نہیں تھی۔ اس کا کوئی پتہ بھی نہیں تھا۔ اب کیا کرے ؟ اس نے سوچا اور اپنے فلیٹ لوٹ آیا۔

اپنے کمرے میں پہنچتے ہی بستر پر گر گیا۔ لڑکے نے کھانے کو پوچھا تو اسے بھی ڈانٹ دیا پھر لڑکے نے بتایا کہ وہ آئی تھی تو بے ساختہ اس کے منھ پر تھپڑ مار دیا۔ "تو نے پہلے کیوں نہیں بتایا ؟"

"جی ... وہ ابھی تو آپ آئے ہیں۔ وہ تو دو مرتبہ آئی تھیں ..."

"کیا کہہ گئی ہیں ؟"

"کچھ بھی نہیں کہا۔ دونوں مرتبہ آپ کو پوچھ کر چلی گئیں۔" وہ لڑکا اپنا گال سہلاتا چلا گیا۔

اس نے لڑکے کو کیوں مارا ؟ اسے کیا ہو گیا ہے ؟ کیسی حرکتیں کر رہا ہے ؟ اس نے لڑکے کو بلایا۔ اسے پیسے دیئے۔ "جا فلم دیکھ آ۔"

پھر وہ بستر پر گر گیا۔ نہ جانے کیسے اسے نیند آگئی۔ اتنی گہری نیند کہ دروازے پر ہونے والی کھٹ کھٹ سے بھی آنکھ نہ کھلی۔ جب مکوں اور گھونسوں سے دروازہ توڑنے کی آواز آئی تو وہ گھبرا کر اٹھا۔

"کہاں تھیں تم ...."

"کہاں تھے تم ...." دونوں نے بیک وقت کہا۔

"میں کہاں کہاں تمہیں ڈھونڈتا پھرا ...."

"تم فلیٹ میں کیوں نہیں تھے؟ میں نے کتنے چکر لگائے یہاں . . ."

"تم دفتر کیوں نہیں آئیں؟ . . . ."

"آج دفتر جانے کا دن تھا . . .؟"

"میں تمہیں دیکھنے گیا تھا۔"

میں شہر میں گھوم گھوم کر تھک گئی۔

میں سارے شہر میں گھومتی پھری۔ ایک ایک چیز کو دیکھتی رہی۔ ایک ایک شخص کا چہرہ ٹٹولتی۔ ایک ایک کی آنکھوں میں جھانکتی۔ وہاں کچھ بھی تو نہیں تھا۔ کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا۔ سب کچھ ویسا ہی تھا۔ کوئی چیز اپنی جگہ سے نہیں ہلی تھی . . . " وہ خاموش ہوئی اور بیٹھ گئی۔ اس کے بالوں اس کے چہرے اور کپڑوں سے لگتا تھا کہ وہ دھولوں اور مٹیوں میں بھاگی پھری ہے۔ اس کے ہونٹ بتا رہے تھے کہ اس نے صبح سے پانی بھی نہیں پیا ہے۔

وہ جلدی سے اس کے لیے پانی لایا۔ وہ پوری بوتل پی گئی۔ پھر کھڑی ہوئی اور ادھر ٹہلنا شروع کر دیا۔ ایک ایک چیز کو ہاتھ لگا لگا کر دیکھتی رہی۔ پھر اس کی طرف پلٹی۔ "دیکھو ذرا اپنی طرف دیکھو۔ مجھے دیکھو۔ ہم بھی تو نہیں بدلے۔ ہم سب ویسے کے ویسے ہی ہیں . . . . ویسے کے ویسے ہی . . . ."

یہ کہہ کر وہ اس کے ساتھ لیٹ گئی۔ اب وہ بھی رو رہا تھا۔ وہ شخص جو بڑے سے بڑے حادثے پر بھی نہیں رویا تھا آج رو رہا تھا۔ وہ دونوں رو رہے تھے۔

اور اس رات وہ اس کے فلیٹ میں ہی رہی۔ اس رات اس کے فلیٹ میں اور کوئی نہیں آیا۔

اور اس کے بعد وہ اس فلیٹ میں ہی آ گئی — " ایسی تیسی ان حرام زادوں اور کتوں کی . . . کمینے خبیث . . . بدمعاش . . . بے غیرت . . . ."

دوسرے دن اس نے پہلا کام یہ کیا کہ کسی دوسرے علاقے میں مکان تلاش کرنا شروع کر دیا۔ ایسے علاقے میں جہاں لوگ اسے نہ جانتے ہوں۔ اور ایک ہفتے کے اندر اس نے مکان تلاش بھی کر لیا اور وہاں چلا بھی گیا۔ یہ سب اتنی جلدی میں ہو گیا تھا کہ اسے سوچنے کی مہلت ہی نہیں ملی تھی۔ اس کے لیے تو ماضی حال اور مستقبل سارے زمانے گڈمڈ ہو گئے تھے۔ اور وہ ان میں الجھا اپنے پاؤں نکالنے کی جگہ تلاش کر رہا تھا۔

اب اسے خیال آیا کہ یہ کیا ہو گیا؟ یہ کیسے ہو گیا؟ اب آگے کیا ہو گا؟ ایک شخص جرمنی میں ہی بیٹھا ہے جو واپس بھی آئے گا۔

یہ سب ایسا ہی ہونا چاہیئے تھا۔ " وہ اسے تسلی دیتی ہے۔" کوئی نئی بات نہیں ہوئی مگر۔

"مگر . . . . ."

"مگر وگر کچھ نہیں۔ کوئی کسی کی ملکیت نہیں ہوتا۔ شاید وہ جو تھا وہ دھوکا تھا۔ الیوژن . . . . ."

"لیکن اگر یہ دھوکا ہوا . . . فریب نظر؟" یہ بات وہ اپنے باپ سے کہنا ہے۔ اس سے نہیں کہتا کہ وہ اب بھی اس سے ڈرتا ہے۔

"میرا خیال ہے اب ہمیں شادی کر لینی چاہیئے۔" ایک رات اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"کیوں؟" اس نے روکھا سا منھ بنا کر سوال کر دیا۔

"بس . . . " اس کی سمجھ میں نہیں آیا کیا وجہ بیان کرے۔

"ہماری شادی تو ہو چکی ہے... شادی کیا ہوتی ہے، سب کے سامنے اعلان کرنا اور بتانا کہ ہم نے میاں بیوی بن کر رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ وہ ہم سب کو بتا چکے ہیں۔"

"کہاں بتایا ہے ہم نے؟"

"ہم ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔ سب دوستوں کو معلوم ہے یہ بتانا نہیں تو اور کیا ہے۔"

تھوڑی دیر وہ خاموش رہے۔ پھر وہ بولی۔ "میں جانتی ہوں تم لوگوں سے ڈرتے ہو۔

"لوگوں سے بھی، اور اس شخص سے بھی جو جرمنی میں بیٹھا ہے۔" اس نے ڈرتے ڈرتے کہا کہ کہیں اس کی یہ بزدلی پھر اس کے مذاق کا ہدف نہ بن جائے۔

"اس سے تو مجھے ڈرنا چاہیئے۔" اس نے جواب اُس کے ساتھ رہ رہی تھی جواب دیا۔ تم کیوں ڈرتے ہو اور میں نے اسے لکھ دیا ہے۔"

"تم نے اسے لکھ دیا ہے؟ کیا لکھا ہے؟" وہ گھبرا گیا۔

"وہی لکھا ہے جو لکھنا چاہیئے تھا۔"

"کیا لکھنا چاہیئے تھا؟" اس کی سمجھ میں ابھی تک نہیں آیا تھا کہ اگر کبھی اس نے اس دوست کو خط لکھا تو وہ کیا لکھے گا۔

"یہی کہ ہم شادی کر رہے ہیں۔" اس لڑکی نے اطمینان سے جواب دیا۔

"یہی تو میں کہہ رہا ہوں ہمیں شادی کر لینی چاہیئے۔"

کچھ دن بعد وہ راضی ہو گئی اور باقاعدہ نکاح ہو گیا۔

"اب تمہارا خوف دور ہو گیا؟" اس رات اس لڑکی نے جواب اس کی منکوحہ تھی اسے گھیر لیا۔

"کیسا خوف؟" وہ ڈر گیا کہ خدا جانے وہ اور کون سا حملہ کرنا چاہتی ہے۔

"یہ خوف کہ کہیں وہ جرمنی سے واپس آئے اور میں اس کے ساتھ چلی جاؤں۔"

"نہیں مجھے تمہاری طرف سے کوئی ڈر نہیں ہے۔" اس نے بہادر بننے کی کوشش کی۔

"جھوٹ مت بولو۔" میں جانتی ہوں تمہیں ہر وقت یہی خوف کھائے جاتا ہے۔

"تو تم... مجھے چھوڑ کر جاؤ گی تو نہیں..." نہ جانے وہ بچہ کیوں بن گیا تھا۔ اس نے اپنا یہ روپ پہلی بار دیکھا۔ اتنا کمزور اتنا بزدل وہ ایسا تو نہیں تھا۔ وہ ایسا کیوں ہو گیا؟ کیسے ہو گیا؟

اس لڑکی نے شاید اس کے دل کی بات جان لی تھی۔ وہ شرارت بھری نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اتنی دیر تک وہ اسی طرح دیکھتی رہی کہ وہ جھینپ گیا۔ "کیا دیکھ رہی ہو؟"

"نہ جانے کیوں تم سامنے آتے ہو تو میرے اندر کی ماں جاگ اٹھتی ہے۔"

"کیا بکواس کر رہی ہو؟" وہ اور بھی جھینپ گیا۔

"سچ کہہ رہی ہوں۔ تمہیں دیکھ کر دودھ اترنے لگتا ہے۔"

"اب بند کرتی ہو اپنی بک بک یا ماروں تمہیں۔" اس نے اس کا کان پکڑ لیا۔

"ارے کیا کرتے ہو چھوڑو میرا کان، تکلیف ہو رہی ہے۔ میں تو محاورہ بول رہی ہوں۔ ہماری امی یہی کہتی ہیں۔ تم تو صحیح زبان بھی نہیں جانتے۔"

وہ واقعی اس کی زبان نہیں سمجھتا تھا۔ ابھی تک اس کی زبان نہیں سمجھ پایا تھا۔ کیا وہ اپنے آپ کو بھی سمجھ سکا تھا۔

وہ پھر اس شخص کو بھول گیا تھا جو جرمنی میں تھا جو اس کا بہت گہرا دوست تھا اور جو اس لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا جو آج اس کی بیوی تھی۔ مگر کیا واقعی اسے بھول گیا تھا۔

(۲)

وہ دوست تین ہفتے بعد واپس آرہا تھا۔ یہ اطلاع اسے دفتر میں ملی اور اس وقت ملی جب وہ لڑکی جواب اس کی بیوی تھی پہلے ہی دفتر سے جا چکی تھی۔ وہ اپنی کسی سہیلی کے ساتھ کہیں گئی تھی۔ وہ اکیلا ہی گھر پہنچا۔ اب کیا کرنا چاہیئے؟ وہ اس کا سامنا کیسے کرے گا؟ کیا کہے گا اس سے؟

وہ ایک کمرے سے دوسرے کمرے اور پھر لان میں ٹہلتا رہا۔

"صاحب جی"، اس نے مڑ کر دیکھا نوکر کھڑا تھا۔"

"کیا بات ہے؟"

"جی گاؤں جانا ہے"۔

"ابھی تو گئے تھے"،

"جی وہ میرے بھائی نے اپنی بیوی اور ایک آدمی کو مار ڈالا ہے"۔

"تمہارے بھائی نے مار ڈالا ہے کیوں؟"

"جی وہ .... اس کی بیوی کسی کے ساتھ چلی گئی تھی اس نے دونوں کو مار دیا۔

"کیا ...؟" اس نے اتنی زور سے کہا کہ اسے خود اپنے اوپر حیرت ہوئی۔ "ٹھیک ہے ٹھیک ہے جاؤ جاؤ"

پھر وہ غسل خانے میں گھس گیا۔ آئینے پر نظر پڑی تو ڈر گیا۔ اس کا چہرہ سفید ہو رہا تھا۔ بالکل سفید جیسے خون کا ایک قطرہ بھی نہ ہو۔ پھر اس کے دماغ میں ایک کوندا سا لپکا اور وہ باہر آگیا۔ اب وہ اپنے ایک دوست کو اسلام آباد فون کر رہا تھا۔ "کینیڈا کے دو ویزوں کا بندوبست کر دو۔ میں اسلام آباد آرہا ہوں پاسپورٹ لے کر"۔

وہ واپس آئی تو اس نے نہیں بتایا کہ لڑکا گاؤں کیوں گیا ہے۔ پھر سوچتا رہا کہ کینیڈا جانے کی بات کیسے کرے۔ سوچتا رہا۔ اپنے اندر ہمت پیدا کرنے کی کوشش کرتا رہا۔

"چلو کینیڈا چلتے ہیں سیر کرنے۔ نہیں ... ہنی مون منانے۔" اس نے حوصلہ کر کے کہہ ڈالا۔

وہ کلوزٹ میں کپڑے رکھ رہی تھی "کینیڈا؟" وہ ہنسی۔ اچھے وقت ہنی مون منانے کی سوجھی ہے۔

وہ ڈر گیا۔ کہیں اسے اس دوست کے واپس آنے کا علم تو نہیں ہو گیا وہ تو یہ چاہتا تھا کہ دوسرے دن اسے بتائے کہ دوست کی واپسی کی اطلاع سے پہلے ہی اس نے پروگرام بنایا تھا۔ اچھے وقت سے کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ اچانک یہ پروگرام کیسے بن گیا۔" وہ اس کی طرف پیٹھ پھیرے کپڑے رکھتی رہی۔

"میں نے پروگرام تو پہلے سے بنا یا ہوا تھا۔ بس پوری تیاری کے بعد تمہیں سرپرائز دینا چاہتا تھا۔

"اچھا ...؟ سرپرائز؟" وہ پھر خاموش ہو گئی۔

"میں کل اسلام آباد جا رہا ہوں ویزے لینے"
"ہمیں تو کینیڈا اطلاع کرنا چاہیے تھا۔"
"ویزے ملتے ہی انہیں بھی اطلاع کر دیں گے۔" انہیں بھی سرپرائز دیں گے نا" اس نے تو اپنی طرف سے پورے یقین کے ساتھ کہا لیکن وہ جانتا تھا کہ وہ اس خاتون کو یقین نہیں دلا پا رہا ہے۔ لیکن وہ اور کر بھی کیا سکتا تھا۔

"ہوں۔ واٹ اے سرپرائز......" وہ پھر اپنے کاموں میں مصروف ہو گئی۔

کراچی سے روانگی تک اسے وہ پریشان رہا کہ اس عورت نے اب تک اس شخص کا ذکر کیوں نہیں کیا جو بہت جلدی واپس آ رہا ہے۔ ظاہر ہے اسے اطلاع مل گئی ہو گی۔ لیکن اس نے یہ ظاہر کیوں نہیں ہونے دیا کہ وہ جانتی ہے؟۔"

وہ اس کی خاموشی سے ڈر رہا تھا وہ خاموش کیوں ہے؟ وہ ادھر ادھر کی باتیں کر رہی تھی اس دوست کا ذکر نہیں کر رہی تھی۔

آخر فرینکفوٹ سے جہاز روانہ ہوا تو وہ بولی۔" اب تو خوش ہو؟"

"کس بات سے؟" وہ سمجھ گیا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہتی ہے۔ مگر ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"اب تو ہم پاکستان سے دور نکل آئے ہیں اور کافی عرصے کے لیے دور نکل آئے ہیں"

"وہ خاموش۔ کچھ نہیں بولا اسے کہنے دیا۔

"تم بہت بھولے ہو۔ بہت ہی معصوم بالکل ننھے بچے۔ میں تو اسی دن سمجھ گئی تھی۔ چل کینیڈا چلتے ہیں ہنی مون منانے......" اس نے اس کی نقل اتاری۔

"تو...... تم نے اس وقت کیوں نہیں بتایا؟" اس نے ڈرتے ڈرتے کہا "میں خواہ مخواہ خون خشک کرتا رہا اپنا" وہ صرف اتنا کہہ سکا۔

"یہی تو تمہارا بھولا پن ہے منے میاں۔ اور یہی ادا تو ہمیں پسند ہے تمہاری۔" وہ یہ کہہ کر وہ اس کی طرف اس طرح بڑھی جیسے ابھی اسے پیار کرے گی۔ شکر ہے وہ دونوں کھڑکی کے ساتھ والی اس قطار میں بیٹھے تھے جس میں صرف دو نشستیں ہوتی ہیں، اگر وہاں تیسری نشست بھی ہوتی تو تیسرے آدمی کو مفت میں مزہ آ جاتا۔

"چلو بھول جاؤ کچھ نہیں ہوا۔" اس عورت نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

نیویارک سے جہاز بدل کر وہ ٹورانٹو روانہ ہوئے۔ ایک رات جین اینڈریو میں اپنے ایک دوست کے اپارٹمنٹ میں ٹھہرے دوسری صبح وینکوور روانہ ہو گئے کہ اس کے ماں باپ وینکوور کے نواح میں ایک سرسبز و شاداب علاقے سری میں رہتے تھے۔

انہوں نے دس بارہ گھنٹے کا سفر کیا کہ وینکوور اور ٹورنٹو کے درمیان کئی ہزار میل کا فاصلہ ہے وہاں پہنچنے کے بعد اس کی حالت ایسی ہو رہی تھی کہ جی چاہتا فوراً بستر پر گر جائے۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کوئی کیا کہہ رہا ہے۔ لیکن وہ بالکل ٹھیک ٹھاک تھی۔ اسے کچھ نہیں ہوا تھا۔

اس کے ماں باپ اس کے ساتھ بہت محبت سے ملے غالباً انہیں اسے کوئی غرض نہیں تھی کہ ان کی بیٹی نے کس سے شادی کی ہے۔ اور جس نوجوان کو پہلے اس نے ملایا تھا اس کی جگہ یہ دوسرا شخص کیوں نظر

آرہا ہے۔ خیر، وہ خط میں انہیں بتا بھی چکی تھی۔

"یہ میرے اتنے پیارے پیارے میاں ہیں کہ انہیں پاکر میں سب کچھ بھول گئی ہوں...." وہ اس کا تعارف کرا رہی تھی اور اس کی آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں۔ آخر وہ بہانہ بنا کر اٹھا اور سامنے جو بھی کمرہ نظر آیا اس میں جاکر بستر پر ڈھیر ہو گیا۔

"تم تو خوب سوئے۔" اس کی آنکھ کھلی تو ابھی رات تھی اور وہ اس کے قریب بیٹھی ہوئی تھی۔

"تم نہیں سوئیں؟"

"میں تو امی ابو سے باتیں کرتی رہی"

"کیا وقت ہوا ہے؟" اس نے اٹھنے کی کوشش کی۔

"لیٹے رہو۔ ابھی تو آدھی رات ہوئی ہے۔ تم دوپہر سے سو رہے تھے۔ (صبح کو ٹورنٹو سے چل کر ہزاروں میل کا فاصلہ طے کرنے کے باوجود دن ہی دن میں ہم یہاں پہنچ گئے تھے۔)"

"ہاں ہاں، مجھے معلوم ہے ان دونوں علاقوں میں وقت کا کتنا فرق ہے"

"امی ابو تمہیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے" اس نے اپنی آواز میں منوں پیار بھر کر کہا اور اس سے لپٹ گئی۔ صبح کو اس نے ناشتہ کیا اور گھر سے نکل کھڑا ہوا کیونکہ امی ابو کے ساتھ اس لڑکی کی باتیں ابھی ختم نہیں ہوئی تھیں۔ اور پھر ایبرڈینشن سے اس کے بھائی اور ان کے بچے بھی آنے والے تھے۔ اس نے یہتر یہی سمجھا کہ خود ہی گھر سے نکل پڑے۔ راستے میں اسے جو بھی بس نظر آئی اس میں بیٹھ گیا۔ اتفاق سے وہ بس اس پارک کی طرف جاتی تھی جہاں ریڈ انڈینز کی نمائش لگائی گئی ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ ان کا تماشہ بنایا گیا ہے۔ ان کی جھونپڑیاں ان کی سواریاں، ان کے لباس، ان کے ہتھیار سب اس طرح سجائے گئے ہیں جیسے سچ مچ وہ وہاں رہتے ہوں۔ اور زمانہ بھی ایک دن آگے نہ بڑھا ہو۔ ابھی پچھلی صدی ہی وہاں تھمی کھڑی ہو۔ یہ لوگ بھی کاروبار کرنا خوب جانتے ہیں۔ پہلے ایک قوم، ایک تہذیب کو مٹاتے ہیں پھر اس کی نمائش لگا کر پیسے کماتے ہیں۔

پھر وہ نہ جانے کہاں کہاں گھومتا پھرتا شام کے قریب گھر پہنچا۔

"کہاں چلے گئے تھے تم۔ بھائی جان اور بھابی سب تمہیں پوچھ رہے تھے۔ اس نے اسے پکڑ کر اپنے بھائی جان کے سامنے پیش کیا۔ "یہ ہیں میرے میاں۔ آپ ان سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔"

بھائی جان اور ان کی بیگم جلد ہی اس کے ساتھ بے تکلف ہو گئے۔ اور پھر وہ دنیا جہان کی باتیں کرتے رہے۔ پھر اس نے ان سے وہ بات پوچھی جس کے لیے وہ بہت بے چین تھا۔ "کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ وہ کینیڈا میں ہی آجائے؟"

"کیوں نہیں ہو سکتا۔ بہت سے طریقے ہیں یہاں آنے کے۔ آپ لوگ تیار ہو جائیں ہم کوئی انتظام کر لیں گے" اس کے بھائی نے اسے یقین دلایا۔

لیکن وہ ناراض ہو گئی۔ "کیا بچوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ ابھی ہم پاکستان ہی واپس جائیں گے۔ پھر کبھی یہاں آنے کی سوچ سکتے ہیں۔ میں تمہارا ڈر نکالنا چاہتی ہوں" اور وہ خاموش ہو گیا۔ اس کے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکتا تھا۔

دو دن رہنے کے بعد اس کے بھائی واپس چلے گئے۔ اور انہوں نے وینکوور کے آس پاس گھومتا

شروع کیا۔ پہلے وہ وکٹوریہ گئے۔ جہاں پھولوں اور خوشبوؤں نے ان کا استقبال کیا۔ پھر وہ دو تین سو میل دور ریڈ انڈینز کے ایک ریزرو علاقے میں گئے جہاں ٹوٹے شیشے والے مکانوں اور شراب کے نشے میں دھت بوڑھے ریڈ انڈینز نے انہیں خوش آمدید کہا۔ یہ ریڈ انڈینز مفت کا وظیفہ پاتے ہیں کہ ان علاقوں سے باہر نہ نکلیں اور ان کی لڑکیاں حرام کے بچے پیدا کرتی ہیں کہ بن باپ کے بچوں کو وظیفہ زیادہ ملتا ہے۔

وہاں سے لوٹے تو ایک دن کے لیے امریکہ شہر سیاٹل بھی گئے۔ کہ وہ سرحد کے ساتھ ہی ہے۔ پھر واپس ٹورنٹو آگئے۔ اور اوٹاوہ، مونٹریال اور تھاؤزنڈ آئی لینڈز تک دیکھ آئے۔ آخری رات نیاگرا فال کے ساتھ ایک ہوٹل میں گذاری۔

"ایک مہینہ کی اور چھٹی لے کر امریکہ بھی نہ دیکھ لیں؟" اس نے ہوٹل کو بند کھڑکیوں سے آتی نیاگرا فال کی ہلکی موسیقی میں اس عورت کو سوتے سے جگایا جو اس کی بیوی تھی اور جو اس سے پہلے اس کے دوست کی بیوی بننے والی تھی۔

"چپ ہو کر سو جاؤ۔ میں بہت تھک گئی ہوں" یہ کہہ کر اس نے کروٹ لی اور سو گئی۔ وہ رات بھر جاگتا رہا۔ اس کی نیند کہیں پاکستان میں کھو چکی تھی۔

اور پھر وہ واپس پاکستان آگئے۔

وہ دوست بھی واپس آچکا تھا۔ بلکہ بہت پہلے آچکا تھا۔ اور دفتر آ رہا تھا۔ دفتر میں کوئی نئی بات نہیں ہوئی تھی۔ سب کچھ ویسا ہی تھا جیسے وہ چھوڑ گئے تھے۔

"ہم صبح ساتھ ساتھ دفتر جائیں گے۔" اس عورت نے کہا اور اس نے اسے حیرت سے دیکھا۔ اچھا تو یہ بھی ڈرتی ہے؟

"ہم ساتھ ساتھ ہی جاتے ہیں" اس نے کہا حالانکہ اس کا ارادہ یہ تھا کہ وہ اکیلا ہی چلا جائے۔ کہ اس کے ساتھ جو کچھ ہونا ہے وہ تنہائی میں ہو جائے۔ اس لڑکی کو پتہ نہ چلے۔ لیکن اب وہ پھنس چکا تھا۔

"نہیں، ایسے نہیں۔ ہم ساتھ ساتھ جائیں گے۔ اور سیدھے اس کے کمرے میں پہنچیں گے۔ دھڑاک سے دروازہ کھولیں گے اور اس کے سامنے کھڑے ہو جائیں گے۔ لو ہمیں مبارک باد دو۔ ہم نے شادی کر لی ہے"

وہ خاموش رہا۔ شاید وہ چاہتی تھی کہ وہ بھی کوئی بات کرے۔ کوئی سوال کرے۔ مگر وہ کچھ نہیں بولا۔ اس عورت نے پھر کہنا شروع کیا۔ "اس طرح اس پر اچانک حملہ کر کے ہم اسے نہتا کر دیں گے۔

"نہتا کر دیں گے؟ تم بھی ڈھونڈ ڈھونڈ کر نئے نئے لفظ نکالتی ہو"

"کیوں؟ یہ انگریزی کا صحیح ٹرانسلیشن نہیں ہے؟"

"اور اگر اس نے ہمیں نہتا کر دیا؟"

"تو ہو جائیں گے نہتے یعنی بے شرم ہو جائیں گے اور جیسے کو تیسا کر دیں گے۔ آخر ہم کسی سے کیوں ڈریں؟

"وہ کسی نہیں ہے۔ ہمارا دوست ہے"

"ہاں ... دوست تو ہے وہ ..." اس نے سوچتے ہوئے کہا اور وہ دونوں خاموش ہو گئے۔

دوسری صبح سے وہ دیر سے دفتر گئے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ ایسے وقت پہنچیں جب وہ دوست اپنے کمرے میں پہلے سے موجود ہو ٹھیک ہے۔ جو ہونا ہے آج ہی ہو جائے۔ اسے جتنی گالیاں دینا ہیں آج ہی دے لے

اپنے دل کا سارا غبار وہ آج ہی نکال لے۔ اگر وہ ہمیں کمرے سے باہر بھی نکال دے تو ہم منھ سے ایک لفظ بھی نہیں نکالیں گے۔

اس کے کمرے میں داخل ہوتے وقت اس نے یہ احتیاط کی کہ اس عورت کو آگے کر دیا جو پہلے اس دوست کی سب سے عزیز دوست تھی اور آج اس کی اپنی بیوی تھی۔

"ہیلو۔۔۔" وہ دوست انہیں دیکھ کر ایسے اچھلا جیسے انہیں کا انتظار کر رہا تھا۔ کب آئے؟ مبارک ہو۔۔۔۔ دولہا میاں تم کیوں پیچھے کھڑے ہو؟ آگے آؤ بھئی۔ مبارک باد تو وصول کرو۔" یہ کہہ کر وہ اس کے ساتھ چمٹ لیا۔ پھر اس عورت کی طرف پلٹا۔ "تمہاری تو میں اچھی طرح خبر لیتا مگر خیر اب تم میری بھابھی ہو۔ آؤ! مبارک باد تو لے لو۔" یہ کہہ کر اس نے اسے بھی اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا۔۔۔ "اجازت؟" یہ بات اس نے اس عورت سے کندھے پر سے جھانکتے ہوئے کہی۔ وہ عورت بھی شرمندہ شرمندہ سی اپنی گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

پھر وہ ان کے لیے چائے منگا رہا تھا۔ بسکٹ اور مٹھائی منگا رہا تھا۔ اور وہ ششدر اس کی طرف دیکھ رہا تھا یہ کیا ہوا؟ اس نے ایسا تو نہیں سوچا تھا۔ ایسا تو نہیں ہونا چاہیے تھا؟۔ اب وہ کیا کرے گا؟۔

وہ دوست بول رہا تھا اور خدا جانے کیا کیا سوال کر رہا تھا جن کے جواب وہ عورت دے رہی تھی۔ اس کے جسم کا سارا خون اس کے دماغ میں بھر گیا تھا۔ اس کا سر پھٹا جا رہا تھا۔

قبل اس کے اس کا دماغ ریزہ ریزہ ہو جاتا وہ اٹھا اور گھر بھاگ آیا۔ اکیلا۔ تنہا۔ کہ وہ ابھی دفتر میں ہی تھی۔ اس دوست کے کمرے میں جو اس کا کمرہ بھی تھا۔

رونے کا حق

رتن سنگھ

اسے اپنی بے بسی پر رونا آرہا تھا۔ وہ رونا چاہتا ہے اور رو نہیں پا رہا ہے۔ اب وہ دوسروں کے سامنے روئے بھی تو کیسے؟ کیا وہ خود کو کمزور اور کائر ثابت کر دے؟ ایسا کرنے سے اس کے ذاتی وقار کو ٹھیس پہنچتی ہے۔ اور اگر وہ نہیں روتا تو اسے لگتا ہے جیسے وہ ایک فطری جذبے سے محروم ہو رہا ہے۔

ڈاکٹر اس کی ٹانگ کو سُن کئے بغیر اس کے زخم کو کاٹ رہا ہے، صاف کر رہا ہے۔ ٹانکے لگا رہا ہے اور وہ قینچی کی کاٹ سے پیدا ہونے والے درد کو اپنی جان پر یوں جھیل رہا ہے کہ اس کے پنجے کے دباؤ سے چارپائی کی دونوں پائیاں چرچر کرنے لگتی ہیں۔ مگر کیا مجال کہ اس کے ہونٹوں سے "سی" "ہائے" کی آواز نکل جائے۔ یوں درد کی لہر اس کے جسم میں دوڑتی ہے تو اسے لگتا ہے جیسے آگ کا شعلہ اس کی ہڈیوں کو جلاتا ہوا آگے بڑھ رہا ہے۔ اس کے چہرے پر کتنی رنگ آتے ہیں۔ کئی رنگ جاتے ہیں۔ ہونٹ بل کھاتی ہوئی رسّی کی طرح ٹیڑھے میڑھے ہو جاتے ہیں، مگر اس کے دل سے اٹھتی ہوئی ہائے کی آواز اس کے گلے میں یوں اٹک جاتی ہے جیسے اس کی بندوق کی گولی اس کی میگزین میں بند ہو کر رہ جاتی ہے۔

اس کے ارد گرد اس کے کتنے ہی ساتھی کھڑے ہیں۔ وہ ساتھی جو اس کے ایک اشارے پر بھیڑ والی جگہوں پر، بسوں اور ریل گاڑیوں میں، جہاں بھی موقع ملے، تڑاتڑ گولیاں چلا کر آئے دن خون کی ہولی کھیلتے رہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے سامنے تو اسے اپنے آپ کو مضبوط، پتھر دل، اور سخت جان قسم کا آدمی ثابت کرنا ہے، ورنہ وہ اس کا حکم کیوں ماننے لگے۔ اسی لئے وہ اپنا سارا درد اپنی جان پر جھیل رہا ہے۔ دو ایک مرتبہ تو اس نے مسکرانے کی کوشش بھی کی ہے یہ اور بات ہے کہ وہ مسکرا نہیں پایا۔ ہر بار درد کی شدّت غالب آجاتی ہے، اور اس کی مسکرانے کی خواہش ہونٹوں پر بکھرنے سے پہلے ہی کہیں دم توڑ دیتی ہے۔

پھر بھی اس نے ہمّت نہیں ہاری۔ ڈاکٹر زخم صاف کر رہا ہے، سڑے گلے حصے کو کاٹ کر وہ ایک ٹرے میں رکھتا جا رہا ہے۔ وہ دیکھ رہا ہے کہ اس کے جسم کا کتنا ہی گوشت ٹرے میں جمع ہو گیا ہے اور ڈاکٹر اب بھی کچھ نہ کچھ نکالتا ہی جا رہا ہے۔ "کتنا خراب ہو گیا ہے یہ زخم۔ جسم کا جو حصہ سڑ گل جائے اسے کاٹ کر پھینک دینا ہی اچھا ہے"۔ ڈاکٹر کہہ رہا ہے۔

دیکھتے ہی دیکھتے ایک ہفتے کے اندر اندر اس کی ٹانگ کالی پڑنی شروع ہو گئی تھی۔ پہلے دن بہت ہی معمولی سا زخم سمجھا تھا اس نے۔ اس کی اپنی ہی تلوار کی نوک ذرا سی لگ گئی تھی۔ لیکن زخم ایسا بگڑا کہ روز بروز گہرا ہوتا چلا گیا۔ اب معمولی سے زخم کے لئے ڈاکٹر کو بلانا مناسب نہیں تھا۔ نہ ہی وہ خود کسی ڈاکٹر کے پاس جا سکتا تھا۔ جگہ جگہ تو اس کے فوٹو لگے ہوئے ہیں۔ اسے زندہ یا مُردہ پکڑنے کے لئے سرکار نے دس لاکھ کا انعام مقرر کر رکھا ہے۔ اسی لئے اس کے ساتھیوں نے خود ہی اس کی مرہم پٹی کر دی تھی۔ آخر زخم جب خراب ہونے لگا تو مجبوری میں اس کے ساتھی ایک ڈاکٹر کو زبردستی پکڑ لائے۔ ڈاکٹر نے زخم دیکھ کر کہا کہ اس کا آپریشن نہ کیا گیا تو ٹانگ کاٹنے کی نوبت آسکتی ہے۔ اسی لئے جو کچھ اس کے پاس تھا اسی سے اس نے آپریشن کر دیا تھا۔

آپریشن کے بعد ڈاکٹر نے اسے نیند کی گولیاں دیں اور ہدایت کی کہ وہ سو جائے۔ اس سے اس کے جسم کو آرام

ملے گا اور درد کی شدت بھی کم ہو گی۔

ڈاکٹر کے جانے کے بعد اس کے ساتھی اس کے صبر، ہمت اور حوصلے کی داد دے رہے تھے۔ مگر اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے ان کی تعریف کے الفاظ اس کے تبسم وجاں میں، اس کے دل کی گہرائیوں میں تیر بن کر چبھ رہے تھے۔ اسے اپنی اس مجبوری پر ترس آرہا تھا کہ وہ رونا چاہ رہا ہے اور رو نہیں پا رہا ہے۔ اسے درد ہو رہا تھا اور برداشت سے باہر ہو رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کم از کم ایک دفعہ اس کے ہونٹوں سے ہائے کی آواز نکل جائے تو اسے کچھ راحت مل جائے اس کی آنکھوں کے پیچھے رُکے ہوتے آنسو بہہ نکلیں تو شاید اسے کچھ سکون میسّر ہو۔

اس نے اپنے سب ساتھیوں کو حکم دیا کہ وہ اسے اکیلا چھوڑ دیں۔

ساتھیوں کے جانے کے بعد اس کے درد نے شدت اختیار کی۔ اس کے دل کا درد "ہائے" کے الفاظ میں ڈھل کر بار باریوں اٹھنے لگا جیسے بوتل میں پانی کے بلبلے بن کر اوپر آتے ہیں۔ اس کی یادداشت نے کئی نئے پرانے واقعات اس کی آنکھوں کے سامنے تصویروں کی طرح لاکر کھڑے کر دیئے۔ اس کی گولیوں کا شکار ہوئے لوگوں کی چیخیں، کراہیں، مرنے والوں کی لاشوں سے لپٹ کر روتے ہوئے لوگ، زخمی ہو کر کراہتے ہوئے، مدد کے لئے پکارتے بچے، بوڑھے اور جوان، آنسوؤں سے بھری آنکھیں، درد سے بلبلاتے ہوتے ہونٹ، یہ سب کچھ دیکھ کر سن کر کبھی اسے اپنی کامیابیوں پر خوشی ہوئی تھی لیکن اس وقت درد کی یہ سبھی تصویریں اس کے اپنے درد میں ڈھل کر اس میں اضافہ کر رہی تھیں۔ ان سب کا درد جیسے اس کا اپنا درد بن گیا تھا۔

اس کی ٹانگ سے درد کی ٹیس اٹھی۔ اس نے چاہا کہ وہ ٹانگ اٹھا کر ذرا دوسری طرف ہی کر دے۔ لیکن اس کی ٹانگ تو جیسے لوہے کی ٹانگ ہو گئی تھی۔ اور اس سے اس کا بوجھ اٹھانا مشکل ہو رہا تھا۔

ایک مرتبہ پھر اس کے سینے میں درد کی لہر اٹھی۔

اس نے روکنے کی بہت کوشش کی مگر آنسو ہیں کہ آنکھوں سے چھلک ہی پڑے۔ ایک۔ دو۔ ٹپ ٹپ آنسوؤں کی جیسے لڑی بندھ گئی ہے۔ اسے لگا جیسے وہ اپنی رائفل سے گولیوں کی بوچھار کو روکنا چاہتا ہے مگر روک نہیں پا رہا۔

"نہیں مجھے رونے کا کوئی حق نہیں،" آخر اس کے دل کی آواز ہونٹوں پر آ ہی گئی۔ "جس نے دوسروں کو اتنے آنسو دیئے ہیں۔ اسے خود رونے کا کوئی حق نہیں۔"

اس کے ہونٹوں سے بار بار یہ الفاظ نکل رہے ہیں اور اس کی آنکھیں! انھوں نے تو ایسی جھڑی لگا دی ہے کہ اس کا سارا وجود بھیگا جا رہا ہے۔

لکیر

کنور سین

سڑک خالی تھی، پھر بھی گولی چل رہی تھی. لوگ چیخ رہے تھے. خون بہہ رہا تھا. لاشیں بچھی جا رہی تھیں. گلیاں سنسان تھیں پھر بھی آہیں پگھلے ہوئے سیسے کی طرح کانوں میں اُتر رہی تھیں. خاموش سسکیاں، پیچھا کر رہی تھیں. گھر ویران تھے لیکن رونے والے موجود تھے. ان کی آواز فضا میں پھیلی دہشت کو بڑھائے جا رہے تھی. ایسے میں مجھے طعنے دیے جا رہے تھے. مجھ سے گلہ کیا جا رہا تھا. میری شکایت کبھی منھ زبانی کبھی لکھ کر کی جا رہی تھی.

وہ بھی بے سچ تھے. میں بھی جھوٹ نہیں بول رہا تھا.

دراصل بات یہیں تک نہیں تھی. بات بہت پیچھے جاتی تھی. وہ صدیوں کو پار کرتی تھی اور آنے والی صدیوں پر چھا جانے کے لیے بضد تھی. وہ بے بنیاد نہیں تھی. اس کا اپنا وجود تھا اور وجود کی اپنی مانگ تھی. مجھے یہی بات کھائے جا رہی تھی. اسی پر سوچتے ہوئے میں خاموش تھا اور سامنے پھیلے خاکے میں رنگ بھرنے سے ڈر رہا تھا.

بات یہ نہیں تھی کہ میں جان بوجھ کر بت بنا بیٹھا تھا اور اپنے سامنے ہو رہے ہولناک تماشے کو یونہی دیکھے جا رہا تھا.

میں گوشت پوست کا پتلا۔ تعلیم یافتہ — سوچتا ہوا ذہن — انسان کی فطرت سے واقف ۔ اتہاس کی نبض پر انگلی رکھ کر دوز تک سمجھ جانے والا — صدیوں کو کُریدتے ہوئے اُن کے گلے میں باہیں ڈال کر انہیں چومتا ہوا اُن کے دل کی دھڑکنوں کے راز جان لینے والا — ان کا کیا دھرا انہیں ہی دکھا کر مسکراتے چلے جانے والا.

میں کیا کروں. مجھے اس آدمی کی بات نہیں بھولتی.

میں نے کہا تو ہے کہ بات اتنی ہی نہیں. نہ وہ یہیں تک ہے. لیکن تم اس سے آگے بڑھتے ہو نہ سمجھے جاتے ہو.

وہ آدمی صرف یہی نہیں کہتا.

دراصل بات ایک دوسرے کو مجرم گردانتے یا جرم کا اقبال کر لینے سے ختم نہیں ہو جاتی. آئینے کے سامنے کھڑے ہو جانے سے خواہ مخواہ خود کو کھوجتے چلے جانا سوائے فرسودگی کے اور کچھ نہیں ہے. لیکن جیب خالی ہو تو سامنے کھڑے بھکاری کے کشکول کا پیٹ ایسے ہی بجتا رہتا ہے. کچھ ایسا ہی لحاف میں زندگی کے ساتھ لپٹے لپٹے خیالوں کے کبوتر اڑاتے رہنے سے ہوتا ہے.

میں نہیں مانتا کہ ہم جانتے نہیں کہ بات کیا ہے. پھر آئینے کے روبرو کھڑے ہوتا یا ایک دوسرے کے ہاتھ میں پکڑی دوائی کی پڑیا کو کھول کر بیماری کا میلان کرنا! ایسی باتیں بہت ہو چکیں. حالانکہ ایسا کرنے یا ایسا کہنے میں کوئی حرج بھی نہیں. درد کا اظہار کرنا کوئی جرم تو نہیں. پھر بھی . . . .

بے شک وہ آدمی ایک انتہائی معمولی آدمی تھا. سیدھا سادہ. نہ کوئی ٹیڑھ نہ ترچھا پن. ہر لحاظ سے سپاٹ پھر بھی جو کچھ اس نے کہا وہ بھولتا نہیں.

اِکائی کو توڑ دینا کوئی معمولی حادثہ نہیں ہوتا۔ لکیر کھینچ دینا اور خواہ مخواہ کا آر پار قائم کر دینا کوئی عام واقعہ نہیں ہوتا۔

تم نے نہیں دیکھا وہ منظر۔ جنہوں نے دیکھا ہے وہ شاید بھول گئے ہیں۔ زندگی کی دھول بہت کچھ دُھندلا دیتی ہے۔ ایک فراموشی، ایک عجیب بھلکڑپن جو قدرتی بھی ہو سکتا ہے اور اوڑھا ہوا بھی۔ یادوں کی گرد کا بوجھ برداشت کرنا آسان بات نہیں ہوتی۔ لیکن یہ سب تو لفظوں میں ڈھل سکنے کے قابل ہے۔ وہ بات تو لفظوں کا لباس نہیں پہن سکتی۔

شاید تم ہڑبڑاہٹ کا شکار ہونے لگے۔ میں کوئی دُور کی بات نہیں کر رہا۔ بہت قریب کا واقعہ ہے۔ ہمارے ساتھ ہوا ہے۔ ہم بھاگ نہیں سکتے، بھلا نہیں سکتے۔ یاد بھی نہیں رکھنا چاہتے۔ لیکن کوئی بھولنے بھی تو دے

سرحدیں قدرت پیدا کرتی ہے۔ ایسی سرحدوں پر ہریالی ہوتی ہے اور خوشحالی اور امن کی ضمانت۔ آدمی کی کھینچی ہوئی لکیر اس کا خون پی کر ابھرتی ہے۔ اس کی سرخی میں درندگی کی باس ہوتی ہے۔ وہ مفت میں نہیں مل جاتی۔ لاشوں کے انبار، مُنڈیوں کے مینار اور لہو کی ندیاں۔ چھوٹی موٹی قیمت چکانے سے بات ختم نہیں ہو جاتی

میں نے دیکھا ہے خونی تماشہ۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اپنے احساس پر جھیلا ہے اسے۔ ابھی کل کی بات ہے۔ میری عمر کوئی اتنی زیادہ نہیں ہے۔ تبھی تو مجھے اتنا یاد ہے۔

لوگ نہیں جانتے تھے رات وں رات ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ وہ تو ہمیشہ کی طرح بے فکری کے عالم میں اپنے بچھونوں پر لیٹے ہوئے صبح ہونے کا خواب دیکھ رہے تھے۔ دن بھر کی مشقت، رزالت، ذلالت اور تھکن جھاڑ کر بس دو پل بھو گئے میں مست تھے۔ روٹی کپڑے کے بعد یہی دو پل ان کی قیمتی دولت تھے لوگ نہیں جانتے تھے۔ وہ جان بھی کیسے سکتے تھے۔ غریب، نادار، مفلس، مست لوگ لفظ 'مفادات' سے ناواقف۔ کسی بھی گہری چال سے بے بہرہ۔ میں اس کی بات کے ساتھ ساتھ اس کی نیم خوابی مسکراہٹ کو بھی نہیں بھول سکتا۔ اس میں ہراس اور سفاکیت ایک دوسرے میں خلط ملط ہو رہے تھے۔ انہونی کے ہو جانے سے پہلے کی مسکراہٹ!

ہم سب عام لوگ تھے۔ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر رہنے والے۔ ایک دوسرے کا بھروسہ کرنے والے ایک دوسرے کا انتظار کر کے ساتھ لے کر چلنے والے۔ ماتم اور خوشی میں ساتھ دینے والے۔ دکھ دے کر بھی دکھ میں شریک ہونے والے۔ روٹھنے کے ساتھ منائے جانے کی چاہ کرنے والے۔ ڈرے ڈرے سے خوش خوش۔ متوسط زندگی گذارنے والے۔ انتہا سے ناواقف۔ آغاز اور انجام سے بے خبر درمیان کے لوگ۔ تہواروں کا انتظار کرنے والے تہواروں پر ہونے والے خرچ سے خوف زدہ ہو جانے والے۔ چاہتے اور چاہے جانے کے بیچ ڈولنے والے صرف خوشگوار زندگی کے تمنائی۔ معمولی سی بات پر حیران ہو جانے والے اتنا کچھ جان بھی کیسے سکتے تھے۔ کوئی معمولی سازش نہیں تھی۔

نعرے۔ میں مانتا ہوں نعرے لگانے والے بھی لوگ ہی ہوتے ہیں لیکن میں نہیں مانتا کہ نعرے لگوانے والے نعرے لگانے والوں سے الگ نہیں ہوتے۔ تبھی تو ...

مجھے اس کے لیے میں یہی مایوس اداسی بھی نہیں بھولتی۔

بڑے منحوس دن تھے۔ رات کو اکٹھے سونے والے۔ صبح اٹھے تو ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ پیار محبت

مروت ـــ سب مر چکا تھا صرف موت زندہ ہو اٹھی تھی.

اس بوڑھی عورت نے اپنے سامنے اپنے شوہر اور دو بیٹوں کا قتل ہوتے ہوئے دیکھا پھر بھی اسے یقین نہیں ہو رہا تھا کہ اس کا سب کچھ لٹ چکا ہے، اپنی آنکھوں میں اتری سفیدی سے لال خون کو دیکھتے ہوئے اور اپنے کنبے کے بچے کھچے لوگوں کو ساتھ لے جاتے ہوئے بولی.

میں شام تک لوٹ آؤں گی. تم لوگ لاشوں کا خیال رکھنا. بکری کو آنگن میں کھلا چھوڑے جا رہی ہوں. اسی لیے باہر کے دروازے پر تالا نہیں ڈال رہی.... اُدھر...

ہم جلد لوٹ آئیں گے. شام تو بہت دور کی بات ہے. گائے کھیتوں میں چرنے گئی ہے، اندر اپلوں پر دودھ کڑھنے کے لیے رکھا ہے. دیکھنا اُبل نہ جائے...

دونوں طرح کے لوگ اپنے بچے کھچے گھروں کے متعلق یقین سے پُر تھے. وہ زمین کے خطے کے متعلق بھی یقین سے بھرے ہوئے تھے. وہ ابھی تک دوست اور دشمن میں تمیز کرنے سے گریز کر رہے تھے. عجیب امید تھی. ان کے چاروں طرف پولیس کا گھیرا تھا اور گھیرے سے باہر ان کے خون کا پیاسا ہتھیاروں سے لیس ہجوم تھا.

میں نہیں جانتا تھا کہ انسان اس حد تک بے وقوف ہو سکتا ہے. ایسی مُور کھتا....!

قصبے کا خاص حصہ پوری طرح آگ کی لپیٹ میں تھا. گھروں کے اندر قید لوگ صرف چلّا سکتے تھے. اپنے کو آگ میں بھسم جانے سے بچا نہیں سکتے تھے. جانور رسی تڑا سکتے تھے. کھونٹا اکھاڑ سکتے تھے. ادھر ادھر بھاگ سکتے تھے لیکن آگ کے دائرے سے باہر نہیں نکل سکتے تھے. بچوں، بوڑھوں، جوانوں، لڑکیوں، اور عورتوں کی لاشیں ان گنت تھیں. آس پاس دلخراش چیخوں میں لپٹا ہوا تھا. پھر بھی جو بچ رہے تھے وہ پولیس اور ملٹری کی حفاظت میں کھڑے تھے. انہیں سب کچھ اپنے سامنے ہوتے دیکھ کر بھی اس حقیقت پر یقین نہیں آ رہا تھا. وہ مرنے والوں کو بھول کر شام ہونے سے پہلے لوٹنے کا برملا اعلان کر رہے تھے. بڑی عجیب بات تھی شاید ان کے قاتل جو ابھی تھوڑی دیر پہلے ان کے دوست اور ہمسائے اور غم خوار تھے وہ بھی حیران تھے کہ ان سے یہ اثر تھا کیسے ہو گا اور ان کے اندر سب کچھ مرنے کے بعد موت کیسے زندہ ہو اٹھی.

عجیب ماحول تھا. لیکن ایسا عجیب ماحول کون سے یگ میں نہیں تھا یا کب نہیں....

اس کی بات کے وزن کو بھولنا آسان بات نہیں.

آبادیوں کے ہر تبادلے کو ہجرت کا تقدس نہیں بخشا جا سکتا.

لوگ اُجڑتے بچھڑتے لوگ، اپنوں سے بچھڑتے، اپنوں کو کھوتے لوگ. اپنے آپ میں ہر لحاظ سے کم ہوتے ہوئے لوگ. گاؤں گاؤں سے اکھڑ کر ایک گاؤں میں اکٹھے ہو کر تحفظ کی امید میں مزید حملوں کا شکار ہوتے ہوئے لوگ قانون توڑنے والوں کے ساتھ ساتھ قانون کے محافظوں کی گولیوں کا شکار ہوتے ہوئے تڑپتے، چلّاتے کراہتے اور موت کے منھ میں اترتے ہوئے لوگ.

جنگلی جانوروں کا شکار بھی اتنی بے رحمی سے نہیں کیا جاتا.

شاید تم نے انسانوں کی بے پناہ بھیڑ کو بیک وقت اتہاس کے منھ میں چبائے جانے والا نوالہ بنتے ہوئے نہیں دیکھا.

میں نے دیکھا ہے۔
لوگوں کو روتے ہوئے۔ آپس میں ایک دوسرے کو روتے ہوئے۔ ایک دوسرے کا بیا پا کرتے ہوئے۔ لیکن میں نے آج تک نہیں دیکھا کو گوں کو اس پر روتے ہوئے، اس کا بیا پا کرتے ہوئے جوان کے دماغ منجمد کر دیتا ہے۔ ان کی سوچ سلب کر لیتا ہے۔ ان کی آنکھوں کی بینائی چھین لیتا ہے۔ ان کی زبان پر تالا لگا دیتا ہے۔ انہیں پالتو جانوروں کی طرح ہانکتا ہے اور انہیں اپنا تماشہ خود ہی کرتے اور خود ہی دیکھنے پر مجبور کر دیتا ہے۔

تم نے نہیں دیکھے وہ فوجی کیمپ! آج کل؟ آج کل کے یہ کیمپ تو کچھ بھی نہیں۔

لاکھوں لوگوں۔ لاکھوں بے سروسامان لوگوں کا۔ نہتے بے سروسامان لوگوں کا اپنے بچے کھچے سامان اور لٹی پٹی آبرو کے ساتھ ایک خاص جگہ اکٹھے ہو کر زمین کو فرش اور آسمان کو سائبان مان کر سردی گرمی کی مار سے بچنے کے لیے اپنے آپ کو صرف مقدر کے حوالے کر دینا۔ بے درو دیوار مکانوں کو اندر اور باہر سے بند کر کے اپنے سامنے ہی اپنی بہو بیٹیوں کی عزت اجتماعی ڈھنگ سے لٹتی ہوئی دیکھنا خود کو ان کے پستان اپنے ہاتھوں سے کاٹ کر ان کے اور اپنے منھ میں ٹھونسنے کے لیے مجبور ہوتے ہوئے دیکھنا احتجاج کے لیے کھولی گئی زبان پر خنجر کی تیز دھار چلتے ہوئے دیکھنا۔ معصوم بچے کی معصوم کلکاری کا حشر! نیزے کی انی پر وصول ہوتا ہوا معصوم جسم۔ یہ تو کچھ بھی نہیں۔ باقی سب کو بیان کرنے کے لیے حوصلہ اور الفاظ کہاں ہیں۔

اپنے ہاتھوں اپنی بربادی اوڑھنا اور پھر بھی سمجھ نہ پاتا۔

ہر کسی ہجرت کو مقدس نہیں مانا جا سکتا۔

رفیوجی کیمپوں میں آنے۔ دو تی، چوتی میں بکنے، لٹنے، پٹنے، مرنے کے بعد بھی ہجرت کے تقدس کا خواب دیکھنا، لکیر کے پار کی فرضی جنت کا تصور کرنا۔ پیدل چلتے ہوئے، گاڑی میں سفر کرتے ہوئے کبھی موسم کی سفاکی کبھی انسان کی سفاکیت کا مزید شکار ہوتے جانا۔ بچے کھچے کو سنبھالتے سمٹتے ہوئے اس میں سے بھی بہت کچھ کھو دینا اور مصنوعی سرحد کی سرخی۔

کوئی دریا نہیں، پہاڑ نہیں، درہ نہیں، جنگل نہیں۔ مختلف رنگ کی زمین نہیں۔ الگ ڈھنگ کی تہذیب نہیں۔ جنسی تمدن نہیں تو پھر کیا تھا؟ کیوں تھا؟ کس لیے تھا؟

کیوں کا جواب ہے۔ کس لیے تھا اس کا بھی جواب ہے۔ لیکن کوئی مانے بھی۔

وہ لکیر پر پہنچ کر بٹ گئے۔ اپنے آپ سے کٹ گئے۔ شاید وہ جانا نہیں چاہتے تھے۔ وہ تو محض نعرے بازی تھی۔ اور وہ جو جانا چاہتے تھے لکیر کھینچنے میں پیش پیش تھے اور نہیں جا سکے۔ ان کا مقدر؟

یہ نہیں کہ وہ قتل نہیں ہوئے بے گھر نہیں ہوئے، دائمی دہشت کا شکار نہیں ہوئے، مسلسل عذاب کے چکر میں نہیں پڑے یہ بھی نہیں کہ لکیر کے ادھر یہ سب نہیں ہوا۔ شاید اس سے کسی طرح کم نہیں ہوا۔ پاکیزگی ادھر رہی نہ ادھر۔ اس کی مسکراہٹ کا تیزاب زیادہ تند ہوتا جا رہا تھا۔

کون سنتا ہے؟ کوئی نہیں مانتا؟ لوگ وہیں کھڑے ہیں، وہی عام لوگ! ووٹ بینک میں پڑے بے جان نوٹ! نعرے لگانے اور نعرے لگوانے میں بڑا فرق ہے لیکن ---۔ اگرانے اور بنانے بیچ کے پیچھے اقتدار کی ہوس۔ سازشیں! پانچ ہزار برس پرانی اور پراچین سبھیتا کے دعوے دار پتہ نہیں کہاں کہاں تک اپنا ادھیکار جتانے لگے ہیں سات سو سال تک جوان رہنے والی تہذیب اپنے کھوئے ہوئے حسن اور شباب کا واسطہ دے کر پتہ نہیں کیا کچھ کر گذرنے

کے لیے اپنے آپ کو ورغلا رہی ہے۔ دو سو سال کی عمر بھوگ کر لوٹ جانے والی بھی اپنے شروع کیے ہوئے تماشے کو ابھی تک جاری دیکھ کر . . . . لیکن جو آج ہو رہا ہے پہلے کبھی نہیں ہوا جو بھی جہاں سے بھی آیا، جتنی دیر رہا لکیروں مٹانے میں ہی سب کی سلامتی مانتا رہا۔ اکائی کو پکا کرنے، ٹوٹے ہوئے کو جوڑنے، اسے سالم بنانے، اسے نئی طاقت دینے میں ہی اپنی اور دوسروں کی بھلائی سمجھتا رہا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آج ہم پاشان یگ میں جی رہے ہوتے۔ یہ انتظامیہ، رسل و رسائل یہ منکوں کی مالا، یہ ایک سرے سے دوسرے سرے تک . . . . وہ پھر بولنے لگا ہے۔

میں اپنے اس دوست کی کہانی نہیں بھول سکتا۔ کسی وجہ سے اس کا ایک بازو کاٹ دیا گیا تھا۔ ساری عمر وہ کٹے ہوئے بازو کو دوبارہ اپنے جسم پر اگے ہوئے دیکھنے کے لیے بے چین رہا۔ کیسا تشدد بھرا احساس کمتری پیدا ہو گیا تھا اس میں . . . . کٹ کر جینے کے المیے کی ہولناکی کا اندازہ تم نہیں لگا سکتے۔

وہ چیخ اٹھا ہے۔

دھرتی کی بانٹ انسانوں کو بھی بانٹ دیتی ہے۔ تم نہیں دیکھ رہے دونوں طرف نئی لکیریں کھینچنے کے لیے کیا کچھ نہیں کیا جا رہا۔ ابھی تو پرانی لکیر اپنی سیرابی کے لیے خون مانگنے سے باز نہیں آئی۔ ابھی کل ہی تو اتنا کچھ ہوا تھا۔ کسی نے لنگوٹی کی پرواہ کی تھی نہ فردار ٹوپی کی۔ اب تو وہ دونوں بھی نہیں رہے۔

اب اس کی چیخ دوبارہ بھیانک ہنسی میں تبدیل ہونے لگی ہے۔

دیوار گر سکتی ہے تو لکیر بھی مٹ سکتی ہے۔ لیکن ادھر تو . . . .

پرانی لکیر ہی نئی لکیروں کو جنم دے رہی ہے۔ دونوں طرف لوگ مر رہے ہیں۔ لوگ خوش ہو رہے ہیں۔ اخبار پڑھنے کا مقصد محض یہ دیکھنا رہ گیا ہے کہ اس میں چھپی خبروں میں مرنے والوں کے نام کیا تھے۔ لوگوں کی خوشی اور غم کا بیرومیٹر، لکیروں کی مانگ کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوا یا نہیں۔

رہی بات عام آدمی کے عام آدمی سے شکوے کی، گلے کی، شکایت کی اور عام آدمی کے عام آدمی کی گردن کی طرف بڑھتے ہوئے ہاتھوں کی۔ سب ایک دوسرے کو روتے ہیں۔ اسے کوئی نہیں روتا، اُسے کوئی نہیں پیٹتا . . . . اس کا سیاپا کوئی نہیں کرتا جو عام آدمی کو ضیافت کے لیے کاٹے جانے والی بکری سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتا۔ وہی لکیر کھینچتا ہے۔ اتہاس میں وہ کچھ ڈھونڈتا اور پڑھتا ہے جو لکیر کو گہرا کرتا چلا جائے چاہے اس کے لیے اسے کتنا ہی خون کیوں نہ بہانا پڑے۔

باہر قتل و غارت کا بازار گرم ہے۔ عصمت لٹ رہی ہے۔ آبرو ذلیل و خوار ہو رہی ہے اور ہم زندگی کے ساتھ گرم لحاف میں لیٹے بہکی بہکی باتیں کر رہے ہیں۔ بھول بھلیاں پیدا کر کے ایک مقدس فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ اور . . . .

میں کیا کروں۔ میں ایک ٹوبہ ٹیک سنگھ لکھ سکتا ہوں۔ ایک بشن سنگھ پیدا کر سکتا ہوں جو لکیر کے ایک طرف ایک دوسری طرف دوسرا پاؤں ٹکا کر لکیر کو رد کرے۔ لاتعداد بشن سنگھ پیدا کرنا میری اوقات میں بھی نہیں جبکہ دوسرے سب لکیر . . . .

پیغامبر

انور خاں

فلک بوس عمارتوں کے درمیان، سویرے سویرے نہ جانے کہاں سے ایک سفید سی گل اڑتا ہوا آیا اور ٹریفک آئی لینڈ پر بیٹھ گیا۔

— سی گل کے پروں سے پانی ٹپک رہا تھا۔

— چہرے پر ایک لمبے سفر کی تکان جیسے رات سینکڑوں میل کا سفر طے کیا ہو۔

— اونچی اونچی بے رنگ عمارتوں، اداس مشینی چہروں کو دیکھ کر اُس کا دل بیٹھ گیا۔

شہر ایک سی آوازوں سے گونج رہا تھا۔ مشینی آوازیں جن میں مل کر انسانی آوازیں بھی مشینی آوازیں معلوم ہو رہی تھیں۔ سڑکیں لوگوں سے پٹی پڑی تھیں۔ زرد، سوکھے، بے جان چہرے اسے اپنی طرف گھورتے نظر آئے۔ جیسے ننھے ننھے بلب یکایک چمکنے لگیں۔

اس نے آنکھیں موند لیں۔

آس پاس منڈلاتے کوے اُس کے اور نزدیک آ گئے۔ لیکن بالکل قریب جانے کی انہیں ہمت نہ ہوئی یقیناً وہ سمجھ رہے تھے کہ یہ بحری پرندہ راہ بھٹک کر یہاں آن پہنچا ہے۔ اب ان دیو قامت سیمنٹ اور لوہے کے پنجروں کے درمیان اس کا دم توڑ دینا یقینی ہے۔

کچھ دیر کے بعد سی گل نے آنکھیں کھولیں اور اپنی لمبی چونچ کھول کر زور سے چیخا۔

اس کی تیز چنگھاڑتی آواز سارے میں پھیل گئی۔

کوے ڈر کر اڑے اور چھتوں، ٹی۔وی۔ اینٹنا، پانی کی ٹنکیوں پر جا بیٹھے۔

سی گل کی آواز نے پورے ماحول کو چونکا دیا۔

دھڑا دھڑ کھڑکیاں کھلیں اور کھڑکیوں میں زرد چہرے نمودار ہوتے چلے گئے۔

— انہوں نے سی گل کو دیکھا۔

— سی گل ہلکے ہلکے کانپ رہا تھا۔

— انہوں نے اُس کے اُجلے پروں کو دیکھا اور اس کی لمبی چونچ کو۔

— سی گل! وہ خوشی سے چلائے۔

کہتے ہیں کہ سمندر کبھی شہر کے بالکل پہلو میں تھا۔ اس قدر نزدیک کہ اپنی نیندوں میں وہ اسے سانس لیتے محسوس کرتے تھے۔ رات گئے وہ شہر میں داخل ہو جاتا۔ بچوں کے خوابوں میں آ کر انہیں گدگداتا وہ ہنس پڑتے۔ کبھی ڈراؤنی آوازیں نکال کر انہیں ڈرا دیتا۔ اور وہ چیخ کر اٹھ بیٹھتے۔ شہریوں کو سوتے میں محسوس ہوتا کہ گلی محلوں میں سمندر کی موجیں لہر لے رہی ہیں۔ مکانوں کی دیواروں سے ٹکرا رہی ہیں۔ پانی ان کے آنگنوں میں لہرا رہا ہے۔ رفتہ رفتہ اس کا جوش ٹوٹ جاتا۔ اور دھیمے دھیمے واپس چلا جاتا۔

ذہن جدید

ہر شئے پھر پہلے کی طرح پُرسکون ہو جاتی۔ پورنیما کی رات سمندر کا جوش دیکھنے کے لائق ہوتا۔ اِدھر چاند نمودار ہوتا، اُدھر سمندر کی آسمان سے باتیں کرتیں جنونی موجیں ان کے کچے مکانوں سے ایسے ٹکراتیں کہ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھتے۔ ان کے آنگن چاندنی سے بھرے نظر آتے۔ سمندر انہیں اپنے جسم کی لاکھوں شریانوں میں لہراتا ہوا محسوس ہوتا۔ عورتیں اپنے پہلو میں لیٹے شوہروں کے سینوں میں منھ چھپا لیتیں اور سمندر رات بھر پورے جلال کے ساتھ ان کے مکانوں کی دیواروں سے ٹکراتا ہر شئے کو تہس نہس کرتا گذر جاتا۔

سمندر کی دراز دستیوں سے پریشان ہو کر کسی کو پکے مکان بنانے کا خیال آیا۔ اور پھر پکے مکان بنتے چلے گئے۔ سمندر کو ہٹنا پڑا۔ شہر سے شہر جڑتے چلے گئے۔ سمندر اتنی دور چلا گیا کہ دن کا شور تو الگ رہا رات کے سناٹے میں بھی اس کو سننا ممکن نہ رہا بستی کے بوڑھے اپنے کم سن پوتے پوتیوں سے سمندر کا ذکر کرتے تو وہ حیرت سے منھ کھولے ان کی باتیں سنتے۔ پھر وہ بوڑھے بھی بستی سے غائب ہو گئے۔ سمندر بس ایک تصور رہ گیا۔ ایک واہمہ جسے تسلیم کرنے کے لیے کچھ نوجوان تیار نہ تھے۔ لیکن آج بھی کبھی کبھار کوئی شہری خواب دیکھتا ہے کہ سمندر شہر میں داخل ہو گیا ہے۔ گلی، محلے، شجر، حجر سب پانی میں تیر رہے ہیں۔ پانی مکانوں میں داخل ہو گیا ہے۔ پھر وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھتا ہے۔

— اچانک سی گل اُڑا اس نے فلک بوس عمارتوں کے اوپر کئی چکر لگائے۔ ہر شخص نے اسے اُڑتے ہوئے دیکھا۔ وہ دوبارہ ٹریفک آئی لینڈ پر آ بیٹھا۔

— اسے اڑتے دیکھ کر بچے خوش ہوئے۔ انہوں نے خوب تالیاں بجائی تھیں

— وہاں کھڑے تمام مرد، عورتوں نے بچوں کا ساتھ دیا۔ ان کے زرد چہرے کھل اٹھے۔

— سی گل بچوں کو ہنستے دیکھ کر خوش ہوا۔ اس نے خوشی سے کلکاریاں ماریں۔ سب ہنس پڑے۔

— وہ بچوں کی طرح ہنس رہے تھے۔ ان کے اندر خوشی کے جھرنے جو نہ جانے کب سے سوکھے پڑے تھے۔ پھوٹ پڑے۔

سارا شہر خوشی سے ناچ اٹھا۔

سی گل کو دیکھنے کے بعد انہوں نے سوچا سمندر واہمہ نہیں۔ سچائی ہے ایک عظیم سچائی۔

سی گل شہر میں تین دن، تین رات رہا۔

شہر کے ہر فرد نے سمندر کے وجود کا اقرار کیا۔

چوتھے دن جب وہ جاگے۔ انہوں نے سی گل کو ٹریفک آئی لینڈ پر نہیں پایا۔

سی گل نے انہیں اُمنگ سے بھر دیا تھا۔

انہوں نے سی گل کی تصویروں سے پورے شہر کو ڈھک دیا۔ بچوں نے اپنی کاپیوں میں سی گل کی تصویریں بنائیں۔ ہر تصویر کو خوبصورت رنگوں سے سجایا۔ ان کا سی گل نیلا بھی تھا، زرد بھی اور سُرخ بھی۔

جس آئی لینڈ پر وہ ٹھہرا تھا۔ وہاں انہوں نے سی گل کا ایک بڑا سا مجسمہ کھڑا کیا جیسے وہ اُڑ رہا ہو۔ آئی لینڈ کو سمندر کے نیلے رنگ سے پینٹ کیا گیا۔ اس کے گرد ایک تالاب جس میں جا بجا فواروں سے پانی گرتا رہتا۔

عمارتوں کو خوبصورت رنگوں سے مزین کیا گیا۔ ایک بار پھر شہر کے اُفق پر پرندے منڈلاتے

نظر آنے لگے۔

اب وہ چیونٹیوں کے شور کے ساتھ اپنے دل کی دھڑکن بھی سن سکتے تھے۔

بہت دنوں بعد۔

سبی گل کا ایک جھنڈ آسمان پر نمودار ہوا۔ دیکھتے دیکھتے وہ زمین پر اتر آیا۔ کبھی وہ نالاب میں تیرتے کبھی کناروں پر منڈلاتے اُن کی چہکار سے فضا گونج اٹھی۔ انہیں دیکھ کر لوگ گھروں سے نکل آئے۔ اور سڑکوں پر رقص کرنے لگے۔

سبی گل اُڑانیں بھر رہے تھے۔ اور لوگ چلا رہے تھے۔

سمندر!

وشال نیلے سمندر!!

عظیم الشان سمندر!!!

ہم نے تیسرے سیفبروں کی شہادت قبول کی۔

ہم گواہی دیتے ہیں کہ تو ہے! تو ہے!! تو ہے!!!

سمندر کے سیفروں نے اُن کی بات سنی اور دیکھتے ہی دیکھتے اونچی اونچی عمارتوں پر سے پرواز کرتے ہوئے اُفق میں گم ہوگئے!

فارم حسب قاعدہ ۸

بابت ذہن جدید : پوسٹ بکس ۷۰۴۲ نئی دلی ۱۱۰۰۰۲

۱۔ مقام اشاعت	:	نئی دلی
۲۔ وقفہ اشاعت	:	سہ ماہی
۳۔ پرنٹر کا نام	:	جمشید جہاں
پتہ	:	ون ڈی۔ ٹائپ فور منٹو روڈ کمپلیکس نئی دلی ۲
قومیت	:	ہندوستانی
۴۔ پبلشر کا نام	:	جمشید جہاں
پتہ	:	ون ڈی۔ ٹائپ فور منٹو روڈ کمپلیکس نئی دلی ۲
قومیت	:	ہندوستانی
۵۔ ایڈیٹر کا نام	:	جمشید جہاں
پتہ	:	ون ڈی۔ ٹائپ فور منٹو روڈ کمپلیکس نئی دلی ۲
قومیت	:	ہندوستانی
مالک	:	جمشید جہاں

میں جمشید جہاں تصدیق کرتی ہوں کہ مذکورہ بالا اطلاعات میرے علم اور یقین کے مطابق درست ہیں۔

دستخط

۳۰ر مارچ ۱۹۹۲ — جمشید جہاں

ذہن جدید

کالی زبان

مرزا حامد بیگ

میں نے ایک شخص کو دیکھا، جس کی کمر اتفاق سے میرے سامنے ننگی ہوئی اور اس کی کمر پر ایسے نشانات تھے، جیسے گھوڑے کے جوڑوں کو، بچھنے سے رہ جاتے ہیں۔

جب اس کا سبب، پوچھا تو اس نے بتایا کہ میں اپنے سگے چچا کی بیٹی پر فریفتہ تھا۔ سو جان سے فدا، لیکن جب میں نے نکاح کا پیغام بھیجا تو میرے چچا نے ایک شرط رکھی — اور وہ شرط یہ تھی کہ میں بنی بکر کی سب سے تیز رفتار مشکی گھوڑی، "شبکہ" کو مہر میں دوں۔

میں نے بخوشی اس شرط کو قبول کیا اور اس فکر میں گھر سے نکلا کہ جس طرح بھی ہو شبکہ کو اس کے مالک کے گھر سے نکال لاؤں۔ سو، میں نے لمبا سفر کیا اور بنی بکر کی آبادی تک پہنچا۔

اس وقت عشار کی اذانیں ہو رہی تھیں اور میری خوش قسمتی کہ آبادی کے صدر دروازے پر مسافروں کو اپنے ہاں مہمان کرنے کو صرف ایک شخص رہ گیا تھا، اور وہ شخص وہی تھا، جس کے گھر کو میں سیندھ لگانے نکلا تھا۔ میں نے درویشانہ لباس پہن رکھا تھا اور کسی کو شک بھی نہ گذر سکتا تھا کہ اس آبادی تک میں کس نیت سے آیا ہوں۔

وہ ابی طاہر تھا، جو مجھ سے بہت اخلاص کے ساتھ پیش آیا۔ میرا سفری تھیلا اس نے اپنے کندھے پر ڈال لیا اور خوشی سے جھومتا ہوا، میرے آگے آگے چلا۔ راستے میں اسی سے معلوم ہوا کہ گھر میں کل تین افراد ہیں ایک وہ خود، ایک اس کی بیوی اور ایک غلام۔

وہ مجھے خوشی خوشی اپنے گھر کی طرف لیے جاتا تھا اور میں اس سوچ میں غلطاں کہ کس طور اس کی مشکی گھوڑی پر قبضہ کروں۔ اس کے گھر پہنچا تو دیکھا کہ دو کمرے ہیں۔ ایک میں میاں بیوی رات کو پڑے رہتے تھے اور دوسرے میں ان کا حبشی غلام، لیکن سب سے بڑھ کر یہ گھر کے صحن میں، چھپتر کے نیچے میں نے پہلی بار شبکہ کو کھڑے دیکھا، چاند کی مدھم روشنی میں اس کا سیاہ تاب رنگ لش لش کر رہا تھا۔ اس کے قریب ہی ایک مشکی رنگ کی بچھیری بندھی تھی اور چند بکریاں۔

ابی طاہر کی بیوی نے خوش دلی سے میرا استقبال کیا، پھر اس نیک بخت نے اپنے ہاتھوں سے میرے لیے بستر درست کیا اور گرم پانی سے منھ ہاتھ دھلوا کر میرے سامنے کھانا چن دیا۔ اس وقت مجھے سخت بھوک لگی ہوئی تھی اور میں نے جی بھر کر کھایا تھا۔

کھانا کھانے کے بعد ابی طاہر کے ساتھ قہوہ پیتے ہوئے میں بہت جلدی میں تھا، اور میرا میزبان میرے سفر کی روداد سننے کا متمنی، لیکن مجھے اپنے مقصد کے حصول کے لیے وقت درکار تھا۔ اس لیے میں نے نیند کا بہانہ کیا اور آنکھ موند کر لیٹ گیا۔ ابی طاہر نے میرے آرام کا خیال کرتے ہوئے بادلِ ناخواستہ شب بخیر کہا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

اس کے کمرے سے نکلتے ہی میں نے پھونک مار کر چراغ بجھا دیا اور دروازے کی اوٹ میں ہو گیا۔ چاند کی مدھم روشنی میں، میں نے دیکھا کہ دونوں میاں بیوی نے صحن میں بیٹھ کر، مجھ سے بچے بچائے کھانے کے تین حصے لگائے۔ ایک حصہ غلام کے حوالے کیا اور بقیہ کھانا کھا کر برابر والے کمرے میں آرام کرنے کی غرض سے چلے گئے۔۔

غلام دن بھر کا تھکا ماندہ تھا، صحن میں چھپر کے نیچے پڑ کر سو رہا۔ میں نے موقع کو غنیمت جانا۔ دو ایک کنکریاں غلام کی طرف اچھالیں، تاکہ معلوم ہو جائے کہ سوتا ہے یا جاگ رہا ہے۔ لیکن وہ بے خبر پڑا سو رہا تھا۔

اب میں نے اپنے سفری تھیلے میں گھوڑے کی ایال سے بنی ہوئی لگام نکالی اور صحن میں آ گیا۔ گھوڑی کو آرام سے تھپکی دیتے ہوئے لگام پہنائی اور چور قدموں کے ساتھ اسے گھر سے باہر نکال لایا۔

اس وقت آسمان پر چھدرے بادلوں کی آوارہ ٹکریاں اٹھکیلیاں کر رہی تھیں اور پورا چاند روشن تھا۔

پھر میں نے دیر نہیں کی۔ تنبکہ پر بیٹھا اور ہوا ہو گیا۔

میں نے جب ایڑ لگائی ہے تو پیچھے ایک نسوانی چیخ سنائی دی اور اس کے بعد پوری آبادی کا شور کسکارا۔ شاید میرے میزبان کی بیوی جاگ رہی تھی اور اس نے مجھے نکلتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

اس وقت میرے تعاقب میں ایک مخلوق نکلی لیکن میں تو اس وقت تنبکہ کی پیٹھ پر سوار تھا اور وہ ہوا سے باتیں کر رہی تھی۔ ایسے میں کون مائی کا لال مجھے روک سکتا تھا۔

صبح کے آثار جاگنے تک میرے پیچھے آنے والے اکثر سوار ہانپ کر رہ گئے۔ ان میں صرف ایک ایسا تھا جو مسلسل میرا پیچھا کر رہا تھا اور رہ رہ کر مجھے للکارتا تھا۔ میں سخت حیران، کہ ایسا جی دار اور برق رفتار آخر کون ہے۔ تا اینکہ اس نے میرے قریب پہنچ کر نیزے کا پہلا وار میری کمر پر کیا۔ اس کے بعد نہ تو وہ مجھ سے اتنا قریب ہو پایا کہ اس کے نیزے کا ایک ہی بھرپور وار میرا کام تمام کر دیتا، اور نہ میری گھوڑی اس سے اتنی آگے نکل سکی کہ اس کا نیزہ مجھے چھو نہ سکتا۔ ایسے میں وہ مجھ پر مسلسل وار کرتا چلا گیا۔ میری کمر پر یہ نشانات انہی کچوکوں کے ہیں۔

دوپہر رات اس سے بچ کر نکلنے کے جتن میں گذر گئی۔ تاوقتیکہ ہم دونوں ایک گہری کھڈ کے کنارے جا پہنچے۔

میں نے ہمت کر تنبکہ کو ایڑ لگائی تو وہ بڑی زقند بھرتے ہوئے پلک جھپکنے میں مجھے پار اتار لے گئی جب کہ میرے پیچھے آنے والا سوار، وہیں ٹھہر گیا تھا۔

جب میرے اوسان بحال ہوئے تو میں نے دوسرے کنارے کی طرف مڑ کر دیکھا۔ گہری کھڈ کے اس جانب میرا میزبان، ابی طاہر کھڑا تھا۔ میں سخت محجوب ہوا اور میں نے اپنی چادر سے چہرے کو ڈھانپ لینا چاہا تو اس نے باآوازِ بلند میرا نام لے کر کہا۔

"ابو نواس، بے جتن نہ کر۔ میں نے تجھے پہچان لیا۔ میں اس گھوڑی کا اصل مالک ہوں جو اس وقت تیرے نیچے ہے اور یہ اسی گھوڑی کی کوکھ سے پیدا ہوئی ہے، جس پر میں اس وقت سوار ہوں۔ یاد رکھ

میں تجھے بھاگ کر جانے نہیں دوں گا۔

اس کے باوجود کہ میں نے شبکہ کی پیٹھ پر بیٹھ کر جس کسی کو پکڑنا چاہا اس سے جا ملا اور جس کسی نے بھی میرا پیچھا کیا، میں اس کے ہاتھ نہیں آیا۔ لیکن آج، خدا کی قسم تو مجھ سے بچ کر نہیں جا سکتا۔

دیکھ، میری شبکہ مجھے لوٹا دے۔"

اس وقت سورج پوری طرح نکل آیا تھا۔ ہم دونوں کے درمیان وہ گہری کھڈ حائل تھی اور وہ مشکی پچھیری پر سوار، ہاتھ میں نیزہ تھامے میرے جواب کا منتظر۔

دو پہر رات کی اس دوڑ کے بعد میں نے اس پچھیری کے بلنے سانس کا اندازہ لگا لیا تھا اور ابی طاہر کے دم خم کا بھی۔ بے شک وہ سچا تھا اور اس بات کا مجھے یقین ہو چلا تھا کہ اس نے مجھے اپنی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دینا۔

میں نے صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے بہت غور کیا، اور مکر کا ایک نیا جال بنا۔ میں نے اسے مخاطب کر کے کہا۔

"ابی طاہر، تو میرا محسن ہے لیکن یقین کر کہ تو اس گھوڑی کے قابل نہیں"،

اس نے استفسار کیا۔

"کیسے؟"

میں نے کہا۔

"گھوڑی اور عورت اس کی، جس کے نیچے۔ رہنے دے۔ ناگفتنی ہے"،

اس نے بہت اصرار کیا تو میں نے کہا۔

"رات کو برابر والے کمرے میں تیری بیوی تیرے پاس تھی لیکن میں تو جاگ رہا تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ تیرے غلام نے اُدھر ایک کنکر اچھالا، اور جب تو گہری نیند سو گیا تو تیری بیوی تجھے وہیں سوتا چھوڑ کر چپکے سے نکلی، اس حبشی کے پہلو میں آ گئی۔ تو سو رہا تھا اور وہ دونوں غیر حالت میں تھے۔ تب میں نے تیرے گھر کے صحن سے اس گھوڑی کو کھولا۔"

میری یہ بات سن کر ابی طاہر کو چپ لگ گئی۔ اس نے گردن جھکا لی اور نیزہ زمین پر ٹیک دیا۔ تا دیر خاموش رہا، پھر کچھ سوچ کر کہنے لگا۔

"نامراد، تو نے میرا سارا دم خم توڑ کر رکھ دیا۔ خدا کی قسم، آج تو بچ کر نہ جاتا، لیکن جو بات میں نے اب تیری زبان سے سُنی، اس سے میں ڈھے گیا۔

آج سے تو میری گھوڑی پر قابض ہوا، مجھ سے میری بیوی کو طلاق دلوائی اور غلام کو قتل کیا۔"

یہ کہہ کر ابی طاہر نے نیزہ سنبھالا اور اپنی پچھیری کی باگیں موڑ لیں۔

داستان گو کا بیان ہے کہ ابی طاہر نے ابو نواس کی جاں بخشی کے بعد گھر پلٹ کر وہی کچھ کیا، جس کی اس نے ابو نواس کو زبان دی تھی اور ابو نواس نے وہی کیا جو کچھ کہ کرنا چاہتا تھا۔ اس نے شبکہ کو مہر میں دے کر اپنی پسند کی لڑکی سے بیاہ رچایا۔ لیکن ابو نواس، جو کچھ کہ کبھی تھا، ویسا نہ رہا۔ اس کے سارے کیے دھرے پر اس وقت پانی پھر گیا، جب شادی کے تیسرے روز اس کی محبوب بیوی خون تھوکتی ہوئی دم دے گئی۔ اور یوں، ابو نواس نے

اِس نیلے آسمان تلے ہمیشہ خوف محسوس کیا۔

اک انجانا خوف، جس نے اسے مار کر رکھ دیا۔ اس نے حفاظت کی خاطر اپنے ارد گرد ایک سنگی حصار کھڑا کیا اور دروازوں پر مسلح چوکیدار بٹھا دیے لیکن دیکھتے ہی دیکھتے، جیسے کچھ تھا جس نے اسے اندر ہی اندر گھن کی طرح چاٹ لیا۔

اس رات بھی آسمان پر چھدرے بادلوں کی آوارہ ٹکڑیاں اٹھکیلیاں کر رہی تھیں اور پورا چاند روشن تھا۔

جب ابونواس کا سینہ رفتہ رفتہ بے صدا ہوتا چلا گیا۔

اس کے سنگی حصار کے روشن دان میں سے جھانکتا ہوا نیم روشن آسمان تھا اور نیچے کروٹیں لیتا ہوا شہر مٹی اندھیر

ابونواس ہر طرح محفوظ تھا لیکن ایک پھانسی تھی جو اندر ہی اندر سے اٹھ کر اُس کے نرخرے تک چلی آئی تھی اور اس کے لیے سانس لینا دشوار ہو گیا تھا۔

اس سے قبل بھی اکثر ایسا ہوا ہے، کہ جب ہر طرف چپ کی چادر تن جاتی اور وہ اپنے بستر پر اکیلا ہوتا تو یہ سانس کی پھانس ابھر آتی۔ لیکن آج اس کی شکل سوا تھی۔ وہ اٹھ کر کھلے میں نکل جانا چاہتا تھا لیکن اس وقت اس کے لیے ایسا کچھ ممکن نہ تھا۔ اس کے ارد گرد کھینچے ہوئے سنگی حصار کے بھاری دروازے اندر سے مقفل تھے اور باہر چوکس چوکیدار اور اسے اس مشکل کا سامنا تھا۔ اس کے سینے کی پھانس تھی یا ایک دہکتی ہوئی چنگاری جو اس کے نرخرے تک اوپر اٹھ آئی تھی اور ابونواس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔

وہ بدبخت آج پھر کیوں یاد آ گیا۔ ابونواس نے سوچا اور سر کو جھٹک دیا۔ پھر ہمیشہ کی طرح اس بار بھی اس نے اپنے گرد و پیش سے لاتعلق ہو جانے اور شانت رہنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا

ایسے میں ابی طاہر آ گئے اور آگے بڑھتا ہی چلا آتا تھا اور چوکیوں پر چوکس پہرہ داروں کو اس کی خبر نہ تھی۔

"او — کوئی ہے، روکو اسے —"

ابونواس نے اپنے سینے میں جمع شدہ سارے چنگھاڑتے ہوئے جذبوں کو آواز دی لیکن وہ کسی کو اپنی مدد کے لیے بلانے سے قاصر ہی رہا۔

اس روز ابی طاہر کو کون روک سکتا تھا۔

ابی طاہر آیا اور اس کی پائنتی کی طرف کھڑے ہو کر اس سے مخاطب ہوا، "میری طرف دیکھو ابونواس۔ یہ میں ہوں، سیاہ زبان۔ میری بددعا سے بچنا تمہارے لیے ممکن نہ تھا۔"

پھر اس نے اسی طرح کھڑے کھڑے اپنی کالی زبان کو دونوں ہونٹوں پر پھیرا اور بولا۔

"ابونواس، مجھ سے بچ کر کہاں جاؤ گے۔ تم نے میری مشکی گھوڑی پر قبضہ کیا، میری وفاشعار بیوی کو طلاق دلوائی اور میرے جاں نثار حبشی غلام کے تم ہی قاتل ہو۔" اس نے کہا اور وہاں کچھ دیر رک کر بتیل جڑے دیو ہیکل بند دروازوں کی درزوں میں سے راستہ بناتا ہوا پلٹ گیا۔

صبح ہوئی تو ابونواس کے محافظوں کو نادر سخت پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ دوپہر دن تک وہاں کی ساری آبادی یکجا ہو چلی تھی، پھر رات گئے تک وہ سب پتیل جڑے دیو ہیکل دروازوں کو کاٹنے میں مصروف رہے، لیکن جب ابونواس تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے تو انہوں نے دیکھا کہ ابونواس کی پیٹھ ننگی تھی اور اس کا وجود دوہرے پلنگ پر کمان کی صورت بھیلی مارے ہوئے لوہے کی طرح بھُربھُرا ہو چلا تھا۔ داستان گو نے بیان ختم کرنے کے بعد دونوں ہونٹوں پر دھیرے دھیرے اپنی زبان کو پھیرا، اک ذرا تامل کیا، پھر بولا۔ "ابی طاہر کے خشک حلق کو تر کرنے کی خاطر پانی نہیں لاؤ گے کیا؟"

بنگالی ہاؤس کی مُنّی

علی امام نقوی

آج پھر بنگالی ہاؤس میں طوفان برپا تھا، کماٹی پورہ پانچویں گلی کے لڑکے، بالے، جوان، بوڑھے سب ہی فقیر محمد کانچ والے کی دکان کے سامنے جمع تھے، برسوں پہلے جس جگہ کانچ گھسنے کی سل بچھی ہوئی تھی وہیں زمین پر پھسکڑا مارے مُنّی اودھم کاٹ رہی تھی، قادر نے اس کی چٹیا بائیں ہاتھ کی گرفت میں لے رکھی تھی۔ اس کا دایاں ہاتھ کھل کر کبھی مُنّی کے گال پر پڑتا تو کبھی اس کے گھونسے مُنّی کے تھل تھلاتے جسم پر پڑنے لگتے، جواباً مُنّی کی زبان تیغ بُراں کی طرح قادر کی ماں، بہن اور باقی رشتے داروں کو کاٹنے لگی۔

مُنّی کا نمبرہ چودہ سال کا لڑکا الیاس، دس برس کی بیٹی زلیخا اور سب سے چھوٹا حبیب ڈرے سہمے، ایک کونے میں دبکے ہوئے تھے۔ الیاس نے جھگڑا شروع ہوتے ہی قادر کی کمر پکڑنے کی کوشش کی تھی، لیکن خود مُنّی نے جھڑک کر اسے دور رہنے کی تاکید کر دی تھی۔ باہر کھڑے محلہ والوں کی تو کیا مجال تھی کہ وہ مُنّی اور قادر کی لڑائی رکوانے کی خاطر بیچ بچاؤ کی کوشش کرتے غرض قادر کے ہاتھ چل رہے تھے اور مُنّی کی زبان محلہ والوں کے لیے بھی کوئی بات نہ تھی۔ آئے دن وہ اس نوعیت کے تماشے دیکھا کرتے تھے شریف لوگ تھے، شاید اسی وجہ سے قادر اور مُنّی کی کیتگی کا تماشہ انہیں پسند تھا، یا پھر اپنے گھروں میں اپنی گھر والی کو پیٹنے کا موقع نہ ملنے کا احساس انہیں بنگالی ہاؤس کی تماشہ گاہ تک لے آتا تھا، یا پھر وہ سب کبھی نہ کبھی مُنّی کے زبان سے گھائل ہو چکے تھے۔ اس کی زبان کیا تھی، غلاظت کی پوٹ تھی۔ گرہ کھلی اور سڑی سڑی گالیوں کے تعفن سے گلی بھبک اٹھی، پورے محلہ میں صرف نذیر قصائی کی موٹی تگڑی بیوی بانو ہی کبھی کبھار اپنی خاندانی سرشت کے ہتھیاروں سے مسلح ہونے کے بعد اس سے بھڑنے کی جرأت کیا کرتی تھی۔ لیکن ایک خاص موڑ پر آنے کے بعد وہ بھی اپنے چکو ہچا پٹرا اس کے قدموں میں ڈال دیتی۔ قصائی برادری کی گالیوں کا اسٹاک ختم ہو جاتا اور مُنّی فتح مندی کے نشے میں سرشار ایک ادائے خاص سے اپنی جیت پر تبصرہ کرتی۔

"جا جا آڑے بھنتو کی! — آئی تھی میرے سے نڑنے۔ اڑے کھڑے ہو کر موتوں نا۔ تو تیرے مافک دس چھنالیں ٹپکیں گے۔"

فقیر محمد خاں کی موت کے بعد نذیر قصائی کی بیوی نے مُنّی سے بھڑنا چھوڑ دیا، غالباً اس کی نظروں میں مُنّی بیوہ ہو کر مظلوم ہو گئی تھی۔ خود مُنّی نذیر قصائی کی بیوی کے تبدیل شدہ رویے پر متحیر تھی۔

طوفان کسی طور نہ تھمتا نہ یا دل نا خواستہ بنگالی ہاؤس کے سامنے بندوق والی چال میں واقع شیشے کی دکان کے مالک سید صاحب نے مداخلت کے ارادے سے اپنی کرسی چھوڑی، لڑکوں، نوجوانوں اور بوڑھے تماش بینوں نے انہیں آتے دیکھا تو راستہ چھوڑ دیا۔ ادھر قادر نے بھی کنکھیوں سے سید صاحب کو دیکھتے ہی مُنّی کی چوٹی چھوڑ دی۔

"پکڑ نا بھڑوے، پکڑ، مار، مر دہے نا میرے کو مارے گا۔ تب ہی تو مالوم ہوئے گا کہ تو مرد ہے، ہانپ کاٹے کو رئیلا رے، ارے بھڑوے خاں۔ مارنا۔"

"ر چا چا آرے ٹیلے، چپ بیٹھ۔"

پسینے میں تر منی نے سر گھما کر اپنے منہ بولے جیٹھ کو دیکھا تو سر جھکا لیا۔ اس کی ساری طراری سیّد صاحب کے سامنے ماند پڑ جاتی تھی کیونکہ وہ اس کے شوہر فقیر محمد خاں کے پیر بھائی تھے۔ اور منی یہ بھی جانتی تھی کہ اگر سیّد صاحب نہ ہوتے تو فقیر محمد اس سے ہرگز شادی نہ کرتے۔ یہ سید صاحب ہی تھے جنہوں نے فقیر محمد اور اس کے تعلقات کو جان لینے کے بعد فقیر محمد کو منی سے شادی پر مجبور کر دیا تھا۔

ان دنوں منی اپنی ماں کے ساتھ کمائی پورہ آٹھویں گلی کی میونسپل مارکیٹ کے سامنے، آلو، ٹماٹر، پودینہ، ہری مرچ اور ادرک کے پاٹ لگا کر فروخت کیا کرتی تھی، کالی کلوٹی منی پر جوانی بھرپور طریقے سے آئی تھی، مارکیٹ سے خریداری کرنے والے منچلے، پودینہ، اور ہری مرچ خریدنے کے بہانے منی سے چھیڑ چھاڑ کیا کرتے تھے منچلوں کے فقرے سن سن منی خوش ہوتی اور اس کی ماں ملول کہ گھر میں کچھ نہ تھا اور منی کی جوانی کا پتہ من چلے خریداروں کو ہو چلا تھا انہی منچلے خریداروں میں ایک روز فقیر محمد خاں کا اضافہ ہوا تھا۔ انہیں ہری مرچ، پودینہ، کوتھمیر کے ساتھ لیمو کی بھی ضرورت تھی اور اس روز اتفاق سے پوری مارکیٹ میں لیمو نہیں تھے، قمیض کے دامن میں سامان اٹھائے وہ لیموں کی تلاش میں جب منی کے قریب پہنچے تھے تو ان کی باچھیں کھل گئی تھیں۔ اکڑوں بیٹھتے ہوئے انہوں نے بھاؤ پوچھا۔ منی نے دام بتائے۔ خاں صاحب بولے۔

"اس سے بڑے لیمو نہیں ہیں تیرے پاس"

"وہ اِدھر ہیں"

منی نے جس طرف اشارہ کیا تھا، ادھر نگاہ پڑتے ہی خاں صاحب نے ہونٹوں پر زبان پھیری تھی۔

"کیا بھاؤ لگائے گی؟"

منی نے سامان کے واٹوں کے بیچ ہتھیلیاں ٹیکیں اور ذرا سے جھکتے ہوئے بولی۔

"بھاؤ تاؤ میری ماں سے کرنا۔

"ہوں۔ لا۔ ابھی تو یہ چھوٹے لیمو ہی دے"

فقیر محمد نے لیمو بھی قمیض کے دامن میں ڈلوائے اور کمائی پورہ پانچویں گلی کی طرف بڑھ گیا۔ بھیڑ بھاڑ میں بھی اس کے سر پر جمی گونڈے والی ٹوپی کا دائیں بائیں لہراتا لچھا منی کو فقیر محمد کے کمر بند کے پھندنوں کی یاد دلا رہا تھا۔

ہری مرچ، لیمو، کوتھمیر کے بہانے فقیر محمد نے منی کو اپنی محبت کے دام میں گرفتار کر لیا تھا دوپہر کے بعد جب مارکیٹ کی رونق ختم ہوئی۔ تب طے شدہ پروگرام کے مطابق، منی آرام کرنے کے بہانے بیٹھے سے اٹھتی، ایک لمبا راستہ طے کرنے کے بعد وہ پلے ہاؤس پر پہنچتی، فقیر محمد کبھی نشاط ٹاکیز تو کبھی تاج اور کبھی نیو روشن سینما کے ٹکٹ لیے اس کا منتظر ہوتا۔ فلم ولم سے تو وہ کیا لطف لیتے، ہال میں اندھیرا ہوتے ہی ایک دوسرے میں سما جاتے تھے وہ۔

ایسی ہی تفریح میں وہ دونوں مگن تھے کہ ایک روز انٹرول میں سیّد صاحب نے ان دونوں کو پکڑ لیا تھا اور پھر فقیر محمد کو ان کے اصرار پر منی سے نکاح کرنا پڑ گیا تھا۔

سیّد صاحب نے قادر اور منی کو بری طرح صلواتیں سنائیں۔ دونوں سر جھکائے ان کی لتاڑ سنتے رہے۔ دو چار منٹوں کے پند اور نصیحتوں کے بعد سید صاحب رخصت ہوئے، جب وہ منی کی نظروں سے اوجھل ہو گئے تب منی

کو دکان کے سامنے موجود بھیڑ کا خیال آیا۔ اور اس کے ساتھ ہی اس کی زبان کھجلائی۔

"کیوں رے، تمہاری ماں تا پچ رئیلی کہ بہن۔ چلو فٹو۔ تمہاری تو....

لوکل ٹرین میں کسی مسافر کی جیب سے پرس اڑاتے ہوئے قادر پکڑا گیا وہ تو خیر ہوئی کہ سادہ لباس پولس والے نے اس پر ہاتھ ڈال دیا۔ ورنہ، اگر مسافروں میں سے کوئی اسے دیکھ لیتا تو اس کی ہڈی پسلی ایک کر دی جاتی لاک اپ ہی سے کسی پولس والے کی منت سماجت کے بعد قادر نے اس کے ذریعہ منی کو اپنی گرفتاری کی خبر بھجوائی تھی اس کی گرفتاری بھی منی کے لیے نئی نہ تھی۔ منی بخوبی جانتی تھی کہ اب اسے کیا کرنا ہے۔ بنگالی ہاؤس ہی میں افیم کا ناجائز کاروبار کرنے والے لقن خان چھوٹے موٹے جرائم پیشہ لوگوں کو ضمانت پر رہا کرواتے کا کاروبار بھی کیا کرتے تھے۔ وہ پہلے بھی کئی مرتبہ قادر کو ضمانت پر رہا کروا چکے تھے منی سیدھے ان کے پاس پہنچی اور بولی۔

"لقن بھائی۔ وہ ڈھولکی کا پھر جیع ہو گیا۔

"کدھر بند ہے؟

"دادر، ویسٹرن پر جیع ہے وہ"

"ہوں"

دوسرے دن تقریباً ۱۰ بجے لقن خاں منی کے ساتھ بمبئی سینٹرل ریلوے کورٹ پہنچے۔ قادر کو رہائی دلوائی اور اپنے کمیشن کے سو روپے وصول کرنے کے بعد کسی دوسرے ملزم کی ضمانت کے سلسلہ میں کرلا کورٹ کے لیے روانہ ہو گئے۔

چوراہے پر پہنچنے کے بعد منی اور قادر نے ہوٹل میں بیٹھ کر ناشتہ کیا۔ اور پھر پیدل ہی کماٹی پورہ کی طرف روانہ ہوئے۔ فاصلہ سمٹ رہا تھا اور منی کا ذہن ماضی کی پگڈنڈی پر سفر کر رہا تھا۔

فقیر محمد خان، رحمت بی اور حشمت بی کی پیدائش، بچوں کے ساتھ دونوں کا چوپاٹی پر گھومنا، بھیل پوری اور آئس کریم کھانا، بچوں کا جوان ہونا، رحمت بی کی شادی، حشمت کا بیاہ، الیاس زلیخا اور حبیب کی پیدائش اور فقیر محمد خاں کی موت۔

فقیر محمد خاں کی موت کے بعد سید صاحب نے پیر بھائی کا پورا پورا حق ادا کیا۔ مگر بہر حال وہ بات نہ پیدا ہو سکی جو فقیر محمد کی کمائی میں تھی، مرنے والے شاہ جہاں پور کے پٹھان تھے، کھانے پینے کے معاملہ میں بھی پورے پٹھان، جبکہ سید صاحب کے تعاون سے منی محض بچوں کا پیٹ ہی بھر پاتی تھی۔ اپنی دیگر ضروریات پوری کرنے کی خاطر منی نے دوکان میں بیٹھا بھاڑت (مجرد کرائے دار) رکھنے شروع کیے۔ آٹھ، دس افراد، دن بھر اپنے روزگار کے چکر میں گرفتار رہتے، شام ہوتے ہی ان کی آمد کا سلسلہ شروع ہوتا کھا پی کر وہ دکان میں سے اپنے اپنے بستر اٹھاتے، فٹ پاتھ پر بستر لگاتے کام دھندے اور فلموں پر تبادلۂ خیال کرتے ہوئے نیند کی وادیوں میں اتر جایا کرتے اور منی دکان میں بچوں کے ساتھ سویا کرتی تھی۔

> گلی والوں نے پہلے تو منی کی جرأت پر سرگوشیوں میں تبصرے کیے۔ پھر دو ایک بزرگوں کو سمجھانے کی خاطر بھیجا۔

ایک کرایہ دار آ رہا تھا۔ ایک جا رہا تھا۔ قادر بھی ان آنے جانے والوں کے درمیان ہی آیا تھا اور اب تو

وہ اس کے دل کے مکان میں ڈیرہ ڈالے ہوئے تھا۔ دکان کا دروازہ، جو پہلے رات بھر کھلا رہتا تھا اب بند ہونے لگا اور بچے ــــ دکان کے باہر چبوترے پر سونے لگے۔ گلی والوں نے پہلے تو منی کی جرأت پر سرگوشیوں میں تبصرے کیئے، پھر دو ایک بزرگوں کو منی کے پاس سمجھانے کی خاطر بھیجا۔ ان کی تمام تر نصیحتوں کو غور سے سننے کے بعد منی نے عادت کے مطابق دوٹوک انداز میں ان سے کہا۔

"ارے جاؤ رے مائی ملو! فقیر محمد کے مرنے کے بعد تو کسی ماں کے بار نے میرے کو نہیں پوچھا کہ ارے منی۔ تو کیا کھا رہیلی ہے؟ کھاتی بھی کہ ایسا ہی سوتی؟ اب آئے ہیں سمجھانے کو۔ کیا بولے، وہ چھپ چھنال کے یہ سب جو میں کر رہیلی ہوں اچھا نہیں ہے نا؟ میں پوچھتی سالوں سے۔ اچھا کیا ہے؟ محلے میں تین یتیم بچے اور ایک بیوہ کا بھوکا سونا اور یہاں بھائی لوگ کا دیا کے کھانا، ہی اچھا ہے نا؟ چلو چلو، رستہ نا پو اپنا۔ میں وہی سچ کروں گی جو میرا من بولے گا، چلو۔ پتلی گلی سے سٹک لو۔ دوسرے ٹائم وعظ کرنے تم آئے نا تو فقیر محمد کی پٹھان کی قسم۔ تم لوگ کی میم پے حج کروں گی۔

ایک آدھ مرتبہ سید صاحب نے بھی اشاروں کنایوں میں اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی مگر بے سود، ان کا چھوٹا لڑکا جو منی کو چاچی کہا کرتا تھا اور جسے منی بھی خوب پیار کیا کرتی تھی۔ ایک دن منی سے پوچھ ہی بیٹھا۔

"چاچی، اچھا لگتا ہے کیا، قادر کے ساتھ، اس طرح، شادی کی بنا رہنا؟

"اچھا تو نہیں رے۔ پن کیا کروں میں؟ بھائی کے ٹکڑے میرا، الیاس، ہتلو اور حبیب کا پیٹ بھرتے۔ پن میری اور بھی تو ضرورت ہے کہ نہیں۔

"کیا ضرورت ہے؟

"ارے ابھی تو بچہ ہے۔ ابھی نہیں سمجھے گا۔ بڑا ہوئے گا تب سمجھ جائے گا۔

"پھر بھی تم سمجھاؤ نو چاچی"۔

"ابھی کیسے سمجھاؤں تیرے کو۔ ہجھ عید بکرا عید ہے۔ گیارھویں شریف ہے۔ اچھا نہیں لگتا میرے کو، ہیں بھائی کی طرف دیکھنا۔

منی نے بڑی خوبصورتی سے منہ بولے بھتیجے کو ٹالا تھا اور یہ بھی سچ ہے کہ قادر کو ڈال لینے کے بعد اس نے سید صاحب کی طرف دیکھنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ خود سید صاحب بھی اس کی حرکتوں سے کبیدہ خاطر ہو چکے تھے قادر اس کی ہر طرح کفالت کر رہا تھا۔ بس کبھی کبھار دونوں میں جو تم بیزار ہو جاتی۔ مگر جب سے قادر نے پینا شروع کیا تھا تب سے آئے روز تماشہ ہوا کرتا۔ کبھی منی اسے پیٹتی تو کبھی قادر۔

برسوں بیت گئے، الیاس جوان ہوا، اس کا بیاہ کر دیا گیا۔ قادر نے فقیر محمد کی کمی محسوس نہ ہونے دی زلیخا بھی اپنے گھر کی ہو گئی۔ اور جب چھوٹے وانے کی نسبت ٹھہری تو قادر بھی اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اب منی اکیلی تھی۔ لیکن وہ مطمئن تھی الیاس برسر روزگار تھا اور حبیب بھی کما رہا تھا۔

حبیب کی شادی سے پہلے الیاس نے مکان کی تنگی کے بہانے گھر چھوڑ دیا، اور پھر پلٹ کر بھی نہ دیکھا۔ دس پندرہ روز تو منی اس صدمہ سے نڈھال رہی، پھر اس نے الیاس کے اس طرح چلے جانے کو تقدیر کا لکھا سمجھ کر صبر کر لیا۔ دو چار کرایہ داروں اور حبیب کی آمدنی سے گھر چلتا رہا۔ حبیب کی شادی ہوئی تو ساس اور بہو کے درمیان روز، روز، تو تو، میں، میں، ہونے لگی۔ تنگ آ کر منی نے حبیب سے کہا۔

"اے باباجانو، بھی کدھر اپنا بندوبست کر سمجھا، میں نیری جورو سے دب کر نہیں رہنے والی اندھا کیا چاہیئے؟ دو آنکھیں، حبیب نے اپنی سسرال آباد کرلی۔ اب منّی بالکل اکیلی تھی۔

برسوں بعد سید صاحب کا لڑکا کالکاٹی پورہ پانچویں گلی سے گذرا تو بے اختیار اسے فقیر محمد خاں، قادر، حبیب، زلیخا اور چاچی یاد آگئے۔ گلی میں داخل ہوا تو سارا منظر ہی بدلا ہوا تھا۔ بندوق والی حویلی، اور اس سے متصل دونوں بلڈنگوں کی جگہ نئی سہ منزلہ عمارت کھڑی تھی۔ بنگالی ہاؤس البتہ ویسا ہی تھا۔ نقن خاں حیات تھے۔ مگر نابینا ہو چکے تھے، افیم کا کاروبار وہ چھوڑ چکے تھے۔ چاچی بہت کمزور ہو چکی تھیں۔ علیک سلیک کے بعد اس نے چوبی زینے پر بیٹھتے ہوئے منی چاچی سے الیاس اور حبیب کے بارے میں دریافت کیا تو منی نے اپنے مخصوص لہجے میں جواب دیا۔

"شک گئے سب۔ آڑے بھنتو کے تھے نا۔ ارے میں ان لوگ کے لیے کیا نہیں کری۔ قادر کو ڈالی۔ اکھی گلی کی بات سنی۔ ہین وہ حرام کے پتلے۔ جورو کے غلام نکلے رے۔ بول کے بھی نہیں گئے اُڈگر لوگ۔

"گذر بسر کیسے ہوتی ہے چاچی۔

"بھاڑت ہیں۔ پھر، میں پانی بیچتی ہوں۔ ایک روپیہ بالٹی۔ وہ دیکھ۔ دکان کے باہر چار ڈرم رکھی ہوے بیس چالیس روپے کما لیتی ہوں

"ارے واہ۔ اس طرح تو خاصی رقم جمع کرلی ہوگی۔

منی نے فخریہ انداز میں سید صاحب کے بیٹے کو دیکھا پھر مسکراتے ہوئے بولی۔

"چالیس ہزار جمع کی ہیں۔

"واہ مگر ایک بات تو بتاؤ چاچی۔ کس کے لیے جمع کئے ہیں؟

"کس کے لیے کرنی؟ ارے وہ بیچ ماٹی ملے فقیر محمد خاں کی اولاد کے لیے۔

"مگر وہ تو تمہیں چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔

منی کی آنکھیں ڈبڈبا ئیں۔ اس نے سر جھکا کر ساری سے آنسو پونچھے اور آہستہ سے بولی۔

"ہاں وہ چھوڑ کر چلے گئے ہین میں تو ان کو نہیں چھوڑی۔ کبھی نہ کبھی حرام کے پلّوں کو میری ضرورت پڑے گی ضرور پڑے گی۔ بول تو، سچ بول بیٹا۔ پڑے گی نا؟۔

میں سچ بولتا ہوں۔ لیکن بعض اوقات جھوٹ بھی بولتا ہوں نماز میں نہیں پڑھتا لیکن سجدے میں نے کئی دفعہ کئے۔ کسی زخمی کتّے کو دیکھ لوں تو گھنٹوں میری طبیعت خراب رہتی ہے لیکن مجھے ابھی تک اتنی توفیق نہیں ہوئی کہ میں اسے اٹھا کر اپنے گھر لے آؤں اور اس کا علاج معالجہ کروں ـ کسی دوست کو مالی مشکلات میں گرفتار دیکھتا ہوں تو میرے دل کو بہت دکھ ہوتا ہے لیکن میں نے اکثر ایسے موقعوں پر اس دوست کی مالی امداد نہیں کی اس لئے کہ مجھے شراب خریدنا ہوتی تھی۔ مجھے کسی اپاہج لڑکی سے ملنے کا اتفاق ہو تو میرے دل و دماغ میں طوفان برپا ہو جاتا ہے۔ میں اپاہج بن کر اس کی جگہ اختیار کرکے گھنٹوں سوچتا ہوں۔ اس کی زندگی کے المیے کے متعلق غور و فکر کرتا ہوں پھر معاً تہیّہ کرتا ہوں کہ میں اس سے شادی کر لوں گا۔ مگر یہ تہیّہ فوراً غائب ہو جاتا ہے۔ جب میں اس کا ذکر اپنی بیوی سے کرتا ہوں۔ ○ سعادت حسن منٹو۔

ذہن جدید

مُردہ لوتھڑے کی حرکت

حسین الحق

قصائی کہتا ہے "ابھی اس میں جان باقی ہے"

میں کپکپا کر وہاں سے ہٹ گیا ... "ویسے بھی مجھے کون سی خریداری کرنی تھی؟"

بغل میں بجائے کی دوکان، دوسری طرف پان بیڑی، پیچھے بڑا نالہ، کنارے پر بھکاریوں اور فٹ پاتھیوں کے بچے ... کوڑی کھیلتے ہوئے یا پیشاب پائخانہ کرتے ہوئے ....."

"خیر، یہ تو تمہاری طبیعت کی گندگی کا ثبوت ہے" میرا دوست عبدالجبار مسکرا کر بولا۔ ورنہ اسی علاقے میں غالب اکیڈمی بھی ہے، غالب کا مزار بھی ہے، بڑی بڑی کتابوں کی دوکانیں، ہوٹل، اور پھر سب سے بڑھ کر... سلطان جی .... حضرت محبوب الٰہی!

ہوا کچھ یوں کہ مجھے ایک بچی کے علاج کے سلسلے میں وہاں جانے کا موقع ملا۔ ویسے پہلے بھی کئی بار حاضری کا شرف حاصل کر چکا ہوں مگر اس مرتبہ کا معاملہ کچھ اور تھا، قصائی نے کہہ دیا تھا کہ ابھی اس میں جان باقی ہے اور ہمارا دوست عبدالجبار بنگلے والی مسجد بھول گیا تھا۔

بچی رشتے میں ہماری بھتیجی لگتی ہے اور بے چینی کا شکار ہے، کئی کئی دن تک سو نہیں پاتی ہے، اختلاج بھی ہے رونا آتا ہے تو روتی چلی جاتی ہے، چپ کا دورہ پڑتا ہے تو دو دو تین تین دن چپ اوڑھ لیتی ہے، دروازے پہ کھڑی جانے کس کی راہ تکتی رہتی ہے، پوچھو تو بس ایک جواب "نہیں کچھ نہیں"۔ دیکھو تو سوال، انتظار اور اداسی کے بوا تلنگ فرینس پر بیٹھی چپ اداس لڑکی!

اس اداس لڑکی کے باپ کو یقین ہو گیا ہے کہ اس پر آسیب کا سایہ ہے۔

ایک آسیب سے تو میں بھی واقف ہوں، جو حضرت اشرف جہانگیر کچھوچھوی کے علاقے سے سلب کر گیا ہے اور اب پورے ہندوستان میں دندناتا پھر رہا ہے مگر اس بچی کا آسیب اس کے باپ اور گدی نشین دونوں کی نگاہ میں اس سے بھی بڑا آسیب ہے اور اس سے وہاں کے لیے اس بچی کو چالیس دن تک درگاہ میں، حجرے کے باہر پائنتی میں روز تین گھنٹوں تک بیٹھنا ہوگا، پوجا کی چھٹیاں تھیں اس لیے گویا راہِ فرار مسدود تھی .... بھائی صاحب بھی تو میرے ہر آڑے وقت میں سب سے پہلے آن کھڑے ہوئے تھے۔

مگر دل تو اپنے گھر اور بچوں میں اٹکا ہوا تھا، آس پاس کے علاقوں سے مسلسل وحشت ناک خبریں مل رہی تھیں، خود میرے شہر پر بھی کوئی آسیب طاری تھا، شام ہوتے ہوتے بازاروں میں ہُو کا عالم ... مغرب کی اذان کے بعد سڑکیں بالکل ویران ... لوگ محلوں کی گلیوں میں اور "محفوظ مقامات" پر چھوٹے چھوٹے گروپوں میں مصروف .... اور ہر صبح اخبار میں ایک نئے شہر کا نوحہ!

قصائی کہتا ہے ابھی اس میں جان باقی ہے"

تاریخ بتاتی ہے: ہسپانیہ میں مسلم اقتدار کا آخری دور بدامنی اور افراتفری کا دور تھا۔

ذہن جدید

عبدالجبار بگڑتا ہے : تم قنوطی ہو، فراری ہو، تمہاری نگاہ تاریک پہلوؤں پر زیادہ ٹھہرتی ہے۔
مجھے عجیب قسم کے حبس کا احساس ہوا، لگا دم گھٹ جائے گا، سر میں کافی درد ہو رہا تھا.... "شاید یہ مسلسل سوچنے کا نتیجہ ہو۔" میں نے سر جھٹکا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔

بازار کی رونق عروج پر تھی، بس اسٹاپ کے پاس ہی سے خاص قسم کی ٹوپی اور پاجامہ بتا دیتا تھا کہ یہ بستی حضرت نظام الدین ہے اور یہاں بنگلے والی...."

عبدالجبار کہتا ہے، یہاں غالب اکیڈمی بھی ہے جس میں ہر دوسرے چوتھے دن کوئی نہ کوئی ادبی یا سیاسی جلسہ ضرور ہی منعقد ہوتا ہے .... اور تب ایسے میں مجھے مور MOORE یاد آتے ہیں جو قشطالہ کے حاکم فرڈی نند سے الفانسو تک، جب ذرا موقع ملا، ادب و شعر کا دفتر کھول کر بیٹھ گئے۔

قصائی کہتا ہے... "

میں دیکھتا ہوں۔

مسجد اور درگاہ کے آس پاس دور دور پر فٹ پاتھی دوکانیں، جن میں طغرے، ٹوپیاں، جا نماز، چھوٹی بڑی مذہبی کتابیں.... کچھ اور آگے بڑھ کر فٹ پاتھ ہی پر.... اور کہیں کہیں ٹھیلے پر، چائے کی دوکان کڑاہ، بڑی بڑی کفگیلیاں، عقیقے کے چھوٹے چھوٹے گلاس، بیچ بیچ میں گوشت کی دوکانیں.... "یہاں بھینس کا گوشت ملتا ہے" اور پھر پھول، نقل، چادر کی دوکانیں.... درگاہ کی سرحد شروع ہوتی ہے.... بائیں طرف ایک پتلی سی گلی جو محلے کے اندر چلی گئی، اور سیدھے چلے جائیے تو درگاہ.... آئیے جناب چادر لے جائیے پھول چاہیئے جناب؟ اللہ کی راہ پر.... خواجہ صاحب کا صدقہ.... مولا دین دنیا کی بھلائی نصیب کریں۔ کچھ دیتے جائیے!

مجھے اپنے آپ پر ہنسی آگئی.... کان بجنے کی بھی حد ہوتی ہے، اب ایسا بھی کیا کہ چاروں طرف سے یہی سنائی دے.... کچھ دیتے جائیے، کچھ ملے بابا.... شاید عبدالجبار ٹھیک کہتا ہے، میری طبیعت ہی مراق زدہ ہو گئی ہے۔ ہر سوچ گھوم پھر کر فٹ پاتھ، گندگی اور بھکاریوں تک جا پہنچتی ہے، مگر میں کیا کروں، شنت ماریہ کا حاکم جب الفانسو کے لیے کچھ چیزیں تحفے کے طور پر لایا تو الفانسو اس وقت ایک بندر سے کھیل رہا تھا، اس نے شنت ماریہ کے حاکم کی طرف بندر بڑھایا...." تم اسی بندر کے مستحق ہو!"

بندر کو معمولی سی پھنسی نکلتی ہے تو پوری قوم اسے نوچتے نوچتے کینسر بنا دیتی ہے۔

ابینہ... بانو.... باقی....

بنگلے والی مسجد میں جماعت داخل ہو رہی ہے، وہاں سے جماعت نکل رہی ہے.... اللہ کافی!

ہمارا بھائی اپنی بچی کا آسیب اتروانے کے لیے درگاہ کی پائنتی میں بیٹھا ہوا ہے.... اللہ؟

بس پر عبدالجبار کی بات یاد آتی ہے "یار یہ فیصلہ کیسے ہو کہ کس پر آسیب سوار ہے؟

اور تب اس پل میرے جی میں اک بات آئی "کس پر آسیب سوار نہیں ہے؟"

"میں پھر ٹریک سے باہر ہو رہا ہوں" میں نے سوچا اور ہوٹل میں داخل ہو گیا.. بھوک شباب پر تھی ہوٹل زائرین اور مبلغین سے بھرا ہوا تھا۔

طرح طرح کے لوگ، طرح طرح کی باتیں..."

"بھائی ہدایت تو تقدیر کی بات ہے ورنہ "فضیلت کامل" میں تو صاف صاف درج ہے۔ ایک چلّہ برابر ایک حج کے!

"ہم لوگوں کی توجہ کی اوقات نہیں ہے تو کم از کم دہلی اور اجمیر ہی سہی"

"درگاہ میں شرک، مسجد میں ذہنی افلاس، قوم کا خدا حافظ ہے، اقامتِ دین کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا"۔

"گھر سے مسجد ہے بہت دور چلو یوں کر لیں کسی روتے ہوئے بچے کو ہنسایا جائے"

کوئی شعر پڑھتا ہوا گذرا اور اسی پل ایک تخریر جھلملائی۔

"مدرسوں اور خانقاہوں میں چند درجن کتابوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ استادِ گرد کو فقہ سکھاتا تھا یا آخرت کے عذاب سے ڈراتا تھا اور جنت کا لالچ دلاتا تھا، اور شیخ خانقاہ تسبیح و مناجات اور وظائف و ملفوظات کھولے بیٹھا تھا"

"لاحول ولاقوۃ۔ یہ جب تب میں مفیوضات الفانسو کی طرف کیوں دوڑ پڑتا ہوں؟"

میں نے سر جھٹکا اور ٹھیک اسی وقت ایک زوردار قہقہے نے مجھے چونکا دیا۔ سامنے سے ایک مجذوب قہقہہ لگاتا گذر رہا تھا۔۔۔ قہقہے کے عقب میں اس کی زوردار آواز سنائی دی۔۔۔۔ سب سنسار دیوانہ بھیا۔۔۔ سب پر ہے آسیب۔۔۔ پھر وہ فلمی دُھن کے ٹرانس میں آ گیا۔۔۔ "ہو جی ہو۔۔۔۔"

میں نے بور ہو کر اخبار اٹھا لیا۔ مگر سرخیوں سے بوکھلا کر باہر نکل آیا۔۔۔ جائے پناہ کہاں تھی؟ چاروں طرف میں گھبرا کر کتابوں کی دوکان میں داخل ہو گیا۔۔۔ تبلیغی نصاب۔۔۔ فضائلِ اعمال۔۔۔ الماریاں کتابوں سے بھری تھیں" میں نے چاروں طرف تلاش کیا، پھر دوکاندار سے پوچھا۔۔۔ "تاریخ کی کوئی کتاب؟"

"جی۔ ہم تاریخ کی کتابیں نہیں بیچتے"

بھائی۔۔۔ مسلم۔۔۔ نہیں نہیں، اسلامی تاریخ؟"

"کہا نا۔ ہم تاریخ نہیں بیچتے۔"

"ڈاکٹر صاحب۔ اتنے بڑے بقراط بنتے ہیں آپ، مگر سامنے کی بات آپ کو نہیں معلوم؟ عبدالجبار ہنسا

"کیا سامنے کی بات کیا؟"

"یہی کہ اس وقت مذہب بیچنے میں جتنا فائدہ ہے، تاریخ فلسفہ بیچنے میں اس کا عشرِ عشیر بھی نہیں"

"کیا ملحدوں جیسی باتیں کرتے ہو!"

"تاریخ فلسفہ تو چھوڑیئے۔ اب تو فلم سے بڑا مارکیٹ مذہب کا ہے"

"استغفراللہ!"

میں نے بوکھلا کر، گڑبڑا کر اور گھبرا کر اپنے بہروں کی طرف نگاہ کی!

"پھر یاد آیا کہ تاریخ فلسفے کے بغیر کوئی قوم نہیں؟"

"پھر یاد آیا کہ فرڈیننڈ سے الفانسو تک تسبیح و مناجات جاری رہی اور تعویذوں کا سلسلہ چلتا رہا"

میرے بھائی کا خیال ہے کہ اسی کی بچی پر آسیب سوار ہے، خود وہ بھی سوال انتظار اور اداسی کے بوائلنگ فرنس پر بیٹھی ہوئی ہے گدی نشین "حاضرات" لگا رہا ہے۔ سوئی والان میں دھڑا دھڑ کالم پر کالم چھپ رہا ہے۔۔۔ ننگلے والی مسجد، مسجد عید النبی اور اردو گھر میں عمل اور ردِ عمل کا سلسلہ جاری ہے اور حضرت اشرف جہانگیر

باقی صفحہ ۱۲۰

برف میں آگ

شموئل احمد

سلیمان کو اپنی بیوی کسی جز دان میں لپٹے ہوئے مذہبی صحیفے کی طرح لگتی تھی جسے ہاتھ لگاتے وقت احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کی شادی کو دس سال ہو گئے تھے لیکن اب بھی وہ سلیمان سے بہت کھلی نہیں تھی۔ سلیمان اُس کو پاس بلاتا تو وہ پہلے اِدھر اُدھر جھانک کر اطمینان کر لیتی کہ کہیں کوئی ہے تو نہیں... خاص کر بچوں کی موجودگی کا اس کو بہت خیال رہتا تھا۔ جب تک اُس کو یقین نہیں ہو جاتا کہ بچے گہری نیند سو چکے ہیں وہ سلیمان کو پاس پھٹکنے بھی نہیں دیتی تھی۔

سلیمان کو شروع شروع میں سلطانہ کے اس رویہ سے بہت اُلجھن محسوس ہوئی۔ اُس کو لگا اُس سے محبت کر کے وہ کسی گناہِ لازمی کا مرتکب ہو رہا ہے لیکن اس کی زندگی میں جب رضیہ داخل ہوئی تو اُس پر عُقدہ کھلا کہ بیوی اور محبوبہ میں فرق ہے اور یہ کہ زندگی میں دونوں کی اپنی الگ الگ اہمیت ہے۔

رضیہ سلیمان کی محبوبہ تھی اور اُس میں وہی گن تھے جو محبوبہ میں ہوتے ہیں۔ وہ بوسے کا جواب بوسے سے دیتی تھی۔ سلیمان جب اس کو اپنی باہوں میں بھینچتا تو وہ اسی گرم جوشی کا مظاہرہ کرتی بلکہ اکثر وہ بوس و کنار میں پہل کر بیٹھتی اور جب وہ آہستہ آہستہ اُس کے کانوں میں سرگوشیاں سی کرتی کہ... جانی... کہاں رہے اتنے دن... ! تو سلیمان پر نشہ سا چھانے لگتا تھا۔ لذت کی یہ گراں باری اس کو سلطانہ کے ساتھ کبھی میسر نہ ہوئی تھی۔ سلطانہ اس کو بند گھڑی کی طرح لگتی تھی جس کی گرہیں ڈھیلی تو ہو جاتی تھی لیکن پوری طرح کھلتی نہیں تھیں۔ جب کہ رضیہ اُس کے برعکس تھی۔ وہ بیڈروم میں شیلف پر رکھی ہوئی اُس کتاب کی طرح تھی جس کی ورق گردانی وہ اپنے طور پر کر سکتا تھا اور جب بھی اُس نے رضیہ کی کتاب الٹی پلٹی تھی لذت کی سرشاری کا ایک نیا باب ہی اُس پر کھلا تھا... رضیہ کہتی بھی تھی... یہی فرق ہوتا ہے جانِ من، بیویاں حقِ زوجیت ادا کرتی ہیں اور محبوبہ خزانے لٹاتی ہے...

رضیہ کا خیال تھا کہ عورت صرف محبوب کی باہوں میں ہی خود کو پوری طرح آشکارا کرتی ہے... شوہر اگر محبوب ہے تو ٹھیک ہے ورنہ وہ فرض نبھاتی ہے... اُس کے پیار میں فرض کا احساس غالب رہتا ہے...."

اُس کی اِس بات پر سلیمان نے ایک بار اُس کو ٹوکا تھا۔

"اِس کا مطلب یہ کہ تم اپنے شوہر سے پیار نہیں کرتیں..."

رضیہ اپنی باہیں اُس کی گردن میں حمائل کرتی ہوئی بولی تھی۔

میری جان.... میں شوہر سے پیار کرنا اپنا فرض سمجھتی ہوں... اس لیے اپنا فرض نبھاتی ہوں... لیکن پیار فرض نہیں ہے...."

اس پر سلیمان نے اس کا طویل بوسہ لیا تھا۔

"پھر پیار کیا ہے ۔۔۔۔؟"

"یہ ہے پیار ۔۔۔۔ ایک مرد اس طرح اپنی بیوی کو نہیں چومتا ۔۔ ۔ پیار بندھن نہیں ہے ۔ پیار کا مطلب ہے آزادی ۔۔۔ پیار کا مطلب ہے تمام بندھنوں سے ماورا ہو جانا ۔۔۔۔"

"واہ ! کیا بات ہے ۔۔۔۔" سلیمان ہنسنے لگا ۔

"دیکھو ۔۔۔ ہم کتنے فری ہیں ۔۔۔۔ کتنے آزاد ۔۔۔۔ میاں بیوی کا بندھن ملکیت کا بندھن ہے جس میں مالک کوئی نہیں ہے ۔۔۔۔ دونوں ہی غلام ہیں ۔۔۔۔ دونوں کا ایک دوسرے پر قبضہ ہے ۔۔۔۔ اور پیار قبضہ نہیں ہے ۔۔۔۔"

سلیمان لاجواب ہو گیا ۔

"ایک بات بتاؤں ۔۔۔؟" یکایک رضیہ مسکرائی اور پھر شرما گئی ۔

"بتاؤ ۔۔۔"

"نہیں بتاتی ۔۔۔"

"بتاؤ میری جان ۔۔۔" سلیمان نے اُس کے گالوں میں چٹکی لی ۔

"جب میں اپنے شوہر کی باہوں میں ہوتی ہوں تو تصور تمہارا ہی ہوتا ہے ۔۔۔۔ تمہارا تصور میرے لیے محرک ہے ۔۔۔۔ تب جاکر کہیں میں ۔۔۔۔"

سلیمان نے اُس کو بے اختیار لپٹا لیا ۔

"اور میری باہوں میں ۔۔۔۔"

"تمہاری باہوں میں مکمل آزادی محسوس کرتی ہوں ۔۔۔۔ کوئی حجاب نہیں رہتا میں ہوتی ہوں ، ایک سیلِ رواں ہوتا ہے ۔۔۔۔ ندی کی تیز دھار ہوتی ہے ۔۔۔۔ اور پھر ۔۔۔۔ اور پھر سیلِ رواں بھی نہیں ہوتا ۔۔۔۔ ندی بھی نہیں ہوتی ۔۔۔۔ میں بھی نہیں ہوتی ۔۔۔۔" سلیمان رضیہ کی اس بات پر عش عش کر اُٹھا تھا ۔

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود سلطانہ سے اُس کے تعلقات خوشگوار تھے ۔ بلکہ جوں جوں رضیہ سے اس کی وابستگی بڑھتی گئی سلطانہ کی قدر و قیمت بھی اس کے دل میں بڑھتی گئی اور یہ محسوس کرنے لگا کہ سلطانہ شرم و حیا کی پابند ایک وفا شعار بیوی ہے جس میں وہی تقدس ہے جو ایک شوہر اپنی بیوی میں دیکھنا چاہتا ہے ۔ مثلاً سلطانہ کا ہمیشہ نرم لہجے میں باتیں کرنا ۔۔۔ اس کا ہر حکم بجالانا ۔۔۔ سب کو کھلا کر خود آخر میں کھانا ۔۔۔۔ یہ سب ایک نیک طینت بیوی کے ضروری وصف ہیں جو سلطانہ میں کوٹ کوٹ کر بھرے ہوتے ہیں ۔

سلیمان کو اکثر یہ سوچ کر حیرت ہوئی تھی کہ دس سالہ ازدواجی زندگی میں سلطانہ نے آج تک اس سے کبھی اونچی آواز میں بات نہیں کی تھی ۔ نہ ہی اپنے لیے کبھی ایسی کوئی فرمائش کی تھی جو سلیمان کو الجھن میں ڈالتی ۔ شادی کے بعد شروع شروع کے دنوں میں اس نے ایک بار پوشاک کے معاملہ میں اس کو یہ مشورہ ضرور دیا تھا کہ وہ اپنے لیے پرنس سوٹ سلوائے ۔ سلیمان نے گرچہ یہ محسوس کیا تھا کہ سلطانہ کی یہ خواہش تھی کہ وہ اس کو پرنس سوٹ میں دیکھے لیکن بند گلے کا کوٹ اُس کو پسند نہیں تھا ۔ اس نے اُس کی اس بات پر

کوئی خاص توجہ نہیں دی تھی اور سلطانہ نے بھی پھر کبھی اصرار نہیں کیا تھا۔ انہی دنوں وہ اکثر گڑ بھر کر کریلے کی سبزی بھی بناتی تھی۔ سلیمان نے یہ بھی محسوس کیا تھا کہ سلطانہ یہ سبزی آچار سے بناتی ہے لیکن کریلے کا ذائقہ اس کو پسند نہیں تھا۔ اس نے سبزی ایک دو بار صرف چکھ کر چھوڑ دی تھی۔

سلیمان اپنی ازدواجی زندگی سے مطمئن تھا۔ سلطانہ نے اس کو تین خوبصورت بچے دیئے تھے۔ وہ امورِ خانہ داری میں طاق تھی اور گھر کا ہر چھوٹا بڑا کام خود ہی انجام دیتی تھی۔ سلیمان خانہ داری کی رقم اس کے ہاتھ میں دے کر مطمئن ہو جاتا تھا۔

رضیہ اکثر سلطانہ کے بارے میں پوچھتی رہتی تھی۔ لیکن وہ زیادہ باتیں کرنے سے گھبراتا تھا۔ کبھی کبھی رضیہ کوئی چھبتا ہوا جملہ بول جاتی اور سلیمان کو لگتا وہ اس کا امیج توڑنے کی کوشش کر رہی ہے۔

ایک بار جب وہ سلطانہ کی تعریفیں کر رہا تھا کہ وہ کس طرح گھر کا کام نبٹاتی ہے تو رضیہ برجستہ بول اٹھی تھی کہ۔ ۔ ۔ اس سے کہو ہر وقت دائی بن کر نہیں رہے۔ ۔ ۔ ۔ بیوی کو کبھی عورت بن کر بھی رہنا چاہیئے۔ ۔ ۔ ۔

سلیمان کو یہ بات لگ گئی تھی۔ اس کو احساس ہوا تھا کہ واقعی سلطانہ ہر وقت کام میں ہی لگی رہتی ہے۔ کبھی فرصت کے لمحوں میں وہ اس کو اپنے پاس بلاتا بھی ہے تو کام کا بہانہ کر کے اُٹھ جاتی ہے۔ لیکن پھر اس نے اپنے آپ کو یہ کہہ کر سمجھایا تھا کہ سلطانہ دراصل ایک سوگھڑ عورت ہے اور سوگھڑ عورتیں اسی طرح گھر کے کاموں میں لگی رہتی ہیں۔

ایک دن کپڑے کی خریداری کے لیے سلیمان بازار کے لیے نکلا۔ ساتھ میں سلطانہ بھی تھی۔ ایک دو دوکان دیکھنے کے بعد وہ ریمنڈ ہاؤس میں گھسنا ہی چاہ رہا تھا کہ سلطانہ کے قدم رک گئے۔ وہ ٹھٹھک کر کھڑی ہو گئی۔ اُس کا منہ حیرت و استعجاب سے کھل گیا۔

"کیا ہوا — ؟" سلیمان نے پوچھا۔

"یہ تو الیاس بھائی ہیں — " سلطانہ کا چہرہ تمتمار ہا تھا۔

سلیمان نے سامنے دکان کی طرف دیکھا۔ پرنس سوٹ میں ملبوس ایک خوب رُو آدمی کاؤنٹر کے قریب کھڑا تھا۔

"یہاں سے چلیئے ۔ ۔ ۔ ۔ " سلطانہ آگے بڑھتی ہوئی بولی۔

چلتے چلتے سلیمان نے ایک بار مڑ کر پھر اُس آدمی کی طرف دیکھا۔

سلطانہ آگے سنٹرل وسنز البیہ میں گھس گئی۔

"کون تھے — "

"بھائی جان کے دوست تھے "

"اگر جان پہچان ہے تو ملنے میں کیا حرج ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ؟"

"مجھے شرم آتی ہے ۔ ۔ "

سلطانہ کے چہرے پر پسینے کی بوندیں پھوٹ آئی تھیں۔ خریداری کے بعد دکان سے نکلتے ہوئے سلطانہ نے ایک دو بار گردن گھما کر ادھر ادھر دیکھا۔ ریمنڈ ہاؤس کے قریب سے گذرتے ہوئے سلیمان نے ادھر اچٹتی

سی نظر ڈالی۔

رستے میں سلطانہ سبزی کی دکان پر رکی۔ سبزیاں اور پھل خریدتے ہوئے وہ گھر لوٹے تو شام ہو گئی تھی۔ سلیمان ٹی۔وی۔ کھول کر بیٹھ گیا اور سلطانہ کھانا بنانے میں لگ گئی۔

خبریں سننے کے بعد سلیمان کھانے کی میز پر بیٹھا تو کریلے کی سبزی دیکھ کر اُس کو کچھ حیرت ہوئی۔ بہت دنوں کے بعد سلطانہ نے پھر گڑ دار کریلے بنائے تھے۔ اس بار سلیمان نے پوری سبزی کھائی۔ کھانے کے بعد بھی وہ کچھ دیر تک ٹی۔ وی۔ دیکھتا رہا۔ پھر بستر پر آکر لیٹا تو سلطانہ ایک طرف چادر اوڑھ کر سوئی ہوئی تھی۔ سلیمان کو عجیب لگا۔ یہ انداز سلطانہ کا نہیں تھا۔ کچھ دیر وہ بغل میں لیٹا رہا پھر اُس نے روشنی گل کی اور سلطانہ کو آہستہ سے اپنی طرف کھینچا۔ . . . وہ اس کے سینے سے لگ گئی۔ سلیمان کو اپنے سینے پر اُس کی چھاتیوں کا لمس بھی پُر اسرار لگا۔ اُس کو حیرت ہوئی کہ اُس کا بدن پہلے اتنا گداز نہیں معلوم ہوا تھا تب وہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکا کہ سلطانہ کی سانسیں کچھ تیز چل رہی ہیں۔ کمرے کی تاریکی میں اس نے ایک بار سلطانہ کے چہرے کو پڑھنے کی کوشش کی اور پھر اس کو اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔ . . . اور دفعتاً سلیمان نے محسوس کیا کہ سلطانہ کی سانسیں اور تیز ہوتی جا رہی ہیں۔ . . . اور جیسے سانس کے ہر زیر و بم کے ساتھ بند گٹھری کی گرہیں اپنے آپ کھلنے لگی ہیں۔ . . . کھلتی جا رہی ہیں . . .

سلیمان نے حیرت سے اُس کی طرف دیکھا۔ ایک لمحہ کے لیے اس کو رضیہ کی یاد آئی . . . اور پھر اس کا چہرہ پسینے سے بھیگ گیا۔ سلطانہ کے بدن پر اس کے بازوؤں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی . . . سلیمان کو لگا اس کی باہوں میں سلطانہ نہیں ہے . . . کوئی اور ہے . . . . .

باقی صفحہ ۲۳

پاگل کرنے کے لئے کافی ہے۔ بڑے سیاسی فیصلوں اور تاریخی حادثات کا اثر انسان کے ذہن، اس کے عمل، اس کے قرینۂ حیات اور اس کے پورے وجود کو متاثر کرتا ہے۔ مثلاً اسے فیصلہ کرنا پڑتا ہے وہ کہاں رہے گا، کون سے نظام میں رہے گا اور وہ نہیں جانتا کہ اس کا فیصلہ صحیح ہوگا یا غلط۔ منٹو اس تردد کا فلیتہ ایک پاگل کے ذہن میں رکھتا ہے کیونکہ یہ ذہن ایک خیال کے لئے بارود کی کان ہوتا ہے۔ اسی لئے افسانہ کا انجام اس کا نقطۂ عروج ہے اور نقطۂ عروج ایک دھماکا۔ اس سے قبل کہ اس دھماکے کو لوگ منٹو کی سنسنی خیزی پر محمول کریں انھیں سوچنا چاہئے کہ یہ دھماکا اس جوالا مکھی کا ہے جس میں ایک خیال لاوے کی طرح پکتا رہا ہے۔ جوالا مکھی بشن سنگھ ہے اور خیال پاگل کی یہ تشویش کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں رہے گا۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ اکثر ہمیں ہمارے سیاسی سوالوں کے جواب ہماری لاشوں پر ہی لکھے ہوئے ملتے ہیں۔

باقی صفحہ ۴۵

رکھنا پسند کریں گے تو ان کا جواب تھا کہ ہاں اگر وہ ان کے ذاتی کمرے میں، ان کی کسٹڈی میں ہو۔ لیکن اگر وہ ایسی جگہ پر جہاں عام لوگوں کی نظریں اس پر پڑیں تو وہ اس کی اجازت نہیں دیں گے۔

بس یہی منٹو کا جرم تھا۔ درد اور مومن کی مثنویاں اعلیٰ ذوق کی عکاس ہیں۔ ایشر سنگھ۔ موذیل۔ سلطانہ اور سوگندھی اس اعلیٰ ذوق سے محروم ہیں۔ صاحب ذوق جنسی بات کریں تو روشن خیالی ہے۔ وہی بات عام جاہل لوگ کریں تو فحاشی۔ کیا ہمیں بھی پسینہ نہیں آرہا ہے؟ منٹو کا قصور یہ ہے کہ وہ اس لطیف فرق کو نہیں سمجھتا۔

وہی رات

اختر یوسف

آدھی رات اُدھر تھی

جون کی گرد میں لپٹی ہوئی چاندنی بستی کو بہت پر اسرار بنا رہی تھی...

وہ روز کی طرح جاگ رہی تھی اب اسے نیند نہیں آتی تھی نیند اس کا رستہ بھول گئی تھی اس کے پاس آتے ہوئے ڈرتی تھی یا وہ بھی کسی درخت سے لٹکی آنکھیں نکالے پتھرائی ہوئی جھول رہی تھی کچھ تو بہرحال تھا ہی تبھی تو بستی جاگ رہی تھی۔

آدھی رات اُدھر تھی۔

بستی میں کتے نہیں تھے.... سانپ بھی نہیں جھاڑیوں میں کوئی سرسراہٹ نہیں.... کوئی آہٹ نہیں مکان سارے بند پڑے تھے یوں بند پڑے تھے کہ جیسے ان کی کھڑکی دروازے کبھی کھلے ہی نہیں تھے اندر اندر مگر بدستور ڈری سہمی اجاڑ بہت تھکی تھکی بے زاری کا بے حد پھیکا ذائقہ لئے سرگوشیاں تھیں دروازے کی درز سے کبھی ماچس کی تیلی کی پیلی کپ کپاتی بیمار سی روشنی کی اُدھڑی ہوئی لکیر بھی سرک آتی تھی، لیکن فوراً ہی بھک سے اڑ بھی جاتی تھی.... یا اڑا دی جاتی تھی۔

جون کی گرد میں لپٹی ہوئی چاندنی بستی کو بے حد پر اسرار بنا رہی تھی ایک تیسری گلی کے آخری مکان کی چھوٹی سی چھت پر گرد آلود چاندنی آڑی ترچھی ہو کر مستطیل سی ہو رہی تھی ایک کونا اس کا بالکل نیم تاریک ہو رہا تھا وہاں ایک جھٹکے سے ماچس کی تیلی جلی تھی.... فوراً ہی بجھ بھی گئی تھی.... اس کے بعد رہ رہ کے ایک چنگاری وہاں جل اٹھتی تھی۔

بجھا دو اسے — کیوں پیتے ہو — کرفیو کی رات ہے —،

کیسے نظر آئے گا — جون میں جیسے کسی کو بہت ٹھنڈ لگ رہی تھی۔

کب کون نظر آ جائے — وہی کپکپاتی آواز تھی — وہ کسی لمحے آ سکتے ہیں۔ نعروں کی آواز نہیں سنتے آواز کسی ٹھنڈے کنوئیں میں ڈوب رہی تھی — اور اس سے پہلے کہ چنگاری پھر اُبھرتی، کہیں کسی پاس کی بستی میں لگاتار کئی گولیاں سن سنا گئیں — پھر دوسرے ہی لمحے ایسا لگا کہ سارے مکان خوف کے کنوئیں میں کچھ اور بھی دھنس گئے تھے۔ کوئی بچہ بلبلایا تھا شاید فوراً ہی اسے دبوچ بھی لیا گیا تھا۔

سنی تم نے یہ آوازیں۔ کون جانے وہ اِدھر ہی آ رہے ہوں۔، وہی پہلی خوف زدہ آواز تھی — یہ آواز بے خطرے کی علامت ہیں۔ پاس کی بستی والوں نے دھیان نہیں دیا — پچھلے ہی ہفتہ کی بات ہے،،

گلی محلے روشن ہو رہے تھے — بارات لڑکی کے دروازے لگی تھی — انار پھولوں اور آسمان تاروں سے فضا دھنک آمیز تھی۔ بڑے، بوڑھے، عورتیں، جوان ایک دوسرے کو بدھائیاں دے رہے تھے — شادی کے گھر والے بڑے سے آنگن میں رنگ برنگی چوڑیوں کی جگمگاہٹ ایک دوسرے سے پیوست ہوتی ہوئی چاندنی

میں گھل مل کے رات رانی اور رجنی گندھا کی خوشبوؤں کے کندھوں پہ سوار آنند اور سکھ کے خواب بن رہی تھی ۔ کنواری لڑکیاں گیت گا رہی تھیں ۔ شادی کے منڈپ پر گھونگھٹ اور سُرخی میں لپٹی لڑکی شرما رہی تھی ۔

رات کے آسمان پر جب ایک تارہ رہ جائے گا تو اسے اس گھر میں جانا ہوگا، جہاں وہ پچھلے جنم میں چاہ کر بھی جانے سے رہ گئی ۔

رات کے آسمان پر جب ۔

گلی محلے روشن ہو رہے تھے ۔ پھر جانے کیا ہوا ۔ سب کچھ یک لخت ٹھٹھر گیا، گولیوں کی بوچھار میں سب لہولہان ہو گئے اور جب بچے کھچے لوگوں کو ہوش آیا تو دیکھا چاروں طرف سے دھواں اٹھ رہا تھا ۔ جیسے کسی نے بھیگی لکڑیوں کی ڈھیر ساری انگیٹھیاں جلا رکھی تھیں گھر کے اندر عورتیں بین کر رہی تھیں ۔ ۔ ۔ دوسرے دن سرخیوں میں لپٹی لڑکی کی لاش ایک دُور کے گاؤں میں کسی درخت سے لٹک رہی تھی ۔

دوسرے نے چھوتے ہوئے پوچھا، ”پچھلے ہفتے کی بات ہے اس کے بعد تمہاری زبان کہاں رہ گئی ۔“ اس کا ایک ہاتھ دوسرے کے کندھے پر تھا ۔ ”اتنا ڈروگے تو جیوگے کیسے“

پہلا جیسے کسی بھیانک خواب کی جکڑ سے چھوٹا ہو ”نہ ..... نہ ..... نہیں .... وہ در اصل ....“ اس کی زبان لڑکھڑا سی گئی ۔

آخر کیا ہو گیا ہے ہمیں، یہ سب کیا ہو رہا ہے، کیوں ہو رہا ہے ..... دو وقت کی روٹیاں کھا کر کتنی اچھی نیند آتی تھی ...، نہیں بھی ملتی تھیں تو بھی، ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانک لینے سے ہی ایسا لگتا تھا اندر میں کوئی تھپکیاں دینے لگا ہے ۔ پھر چہرے ہر طرح کے تناؤ سے مُکت ہو جاتے تھے، اور ننگے فرش پر یا اُدھڑی ہوئی چار پائی پر پسر جاتے تھے، پیاس لگتی تھی تو کنوئیں کا ٹھنڈا پانی چاہیے تھا ۔ اب مگر یہ کیسی بھوک اور پیاس ہے نعرے لگ رہے تھے ۔ بڑا شور تھا ۔ گولیوں کی سن سناہٹ بھی تھی دور دور تک ڈراؤنے قہقہے گونج رہے تھے جیسے گِدھ اپنے کریہہ پر پھڑ پھڑا رہے تھے ۔ جیسے بھیڑیئے دہاڑ رہے تھے ۔ آدمی ٹکڑے ٹکڑے سڑکوں پر پڑے تھے، آدمی کو جنگلوں کی طرف واپس ہونا ہے، شہروں میں گِدھ اور بھیڑیئے رینگتے ہیں شاید شہر پھیلے تو جانور بھی بڑھے ... ملے ہوتے ہوئے دن کی گھات میں بیٹھی ہوئی رات بظاہر گھات میں بیٹھی نظر آتی ہے لیکن یہ دھیرے دھیرے دن کو نگلتی جا رہی ہے .... نگلتی جا رہی ہے ۔

— کیا ۔ پہلا چونک کر جیسے اچھلا ۔ ”کیا کہا ۔ کیا نگلتی جا رہی ہے ۔“

— نگلتی جا رہی ہے ۔ دوسرا بُدبُدا رہا تھا ۔ ”برات ۔ درخت ۔ لڑکی ۔ دن ۔“

— وہ شاید پاس کی بستی میں ہیں ۔ بڑے سے نیم کے درخت کے پاس والے کچے مکان کے اندر کوئی بوڑھی آواز لڑکھڑا سی گئی تھی ۔ ”ویسے ہی کچھ نعرے سے لگتے ہیں ۔ آج کہیں وہ ادھر ..“

— چپ کر ..... کوئی مرد تھا

— آج، کہیں وہ ادھر نہ آ جائیں ۔ شام ہی سے لگتا ہے، جیسے ہمیں انہیں کا انتظار ہو رہا ہے ۔ جانے کب سے ہم سوئے نہیں ۔ نیم کے پاس والے کچے مکان کے اندر ہلکی ہلکی بُدبُداہٹ کے درمیان ایک زور کی لڑکھڑاتی ہوئی کھانسی جو اٹھی تو کوئی چلاتے چلاتے رہ گیا ۔

— اے بوڑھی ۔ کیا بک بک ۔ ،

— کیا پتہ — آج وہ ہماری طرف ہی آجائیں۔
— پھر وہی بک بک

پھر کچے مکان میں ہلکا دھم کرتا ہوا کوئی کودا — ابھی ابھی جو کھانسی اور بدبداہٹ وہاں اندھیرے کمرے میں پھڑ پھڑا رہی تھی، یک لخت اس کا دم بیٹھ گیا۔ ... گرد آلود چاندنی انار کے آس پاس بکھری تھی ... ہلکا دھم کرتا ہوا ابھی ابھی جو کودا تھا، وہ چاندنی سے بچنے کے لیے انار سے بالکل سٹ کر کھڑا تھا۔ آنگن میں جیسے بالکل چپ کا آنگن بنا تھا۔ ہوا بہت گرم تھی۔

— گرمی ؟؟؟ پاس کی جھکی ہوئی کوٹھری میں سانسوں میں کسی نے کہا۔
— بس — اب سب جل جائے گا۔ وہی بوڑھی بدبداہٹ تھی — تھوڑی دیر کی بات ہے ....

پھر دھیرے سے بغیر کسی آہٹ کے دروازہ کھلا — انار کی شاخوں کے پاس چاندنی اور بھی میلی ہو گئی تھی پاس کے گاؤں میں ایک دھماکہ سا ہوا تھا — تیز تیز نعرے آپس میں گڈ مڈ ہو گئے تھے — انار کے آس پاس دو سائے آس پاس کھڑے تھے ....

— تم، مت آیا کرو۔ جانے وہ کب ہماری بستی میں آجائیں ....
— مجھ سے پہلے یہاں نہیں آسکیں گے ...
— ٹھیک ہے — آج تم ہی مجھے ختم کر دو — روز روز کی اذیت — جیسے کوئی پرندہ آخری بار پھٹ پٹایا ہو ....

اب گولیوں کی آوازیں مسلسل آنے لگی تھیں .... ویسے رات کا کرفیو دور دور تک گاؤں میں نافذ تھا اب یہ گولیاں کون داغ رہا تھا۔ کہنا مشکل تھا — آنگن کے پاس والی جھکی ہوئی کوٹھری کا دروازہ بند تھا — رات اب آدھی سے کچھ زیادہ ہی ادھر ہو چکی تھی — بستی کی آنکھ یوں کھلی تھی کہ بند ہوئی تو ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے گی۔

چاند آسمان کے بیچ میں کب آیا اور کب دوسرے کنارے میں اترنے لگا تھا، یہ کسی کو پتہ نہیں تھا — بستی کے خاتمے پر جامن کے پیڑ بربریا ہی سی گرنے لگی تھی — اس کی موٹی موٹی ٹیڑھی کبڑی شاخیں بلاؤں کی طرح چاروں طرف سے بستی کی طرف بڑھنے لگی تھیں — شاخوں کا ہجوم لپکتا آ رہا تھا — ساری بستی ڈراؤنی شاخوں کے نرغے میں تھی — بستی جیسے اب معدوم ہو جائے گی ....

— اب تم جاؤ — انار کی کوئی شاخ تھرتھرا گئی تھی — رحدود کے جھنجھٹ مت کرو —
— ابھی تو رات سامنے ہے ....
— کوئی گولی آئے گی اور ہم دونوں کا خاتمہ کر دے گی .... آواز رونی سی تھی ... اب مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا ... حالات بہت خراب ہیں .... ہر طرف کرفیو پھیلا ہوا ہے ....
— تو کیا ہوا .... ہم الگ تو نہیں ہو سکتے۔
— بستی میں تو ابھی کتنے اور کتنا بھی نہیں ملتے .... ڈوبتی ہوئی آواز میں بہت بے زاری تھی۔
— وہ تو جانور ہیں ....
— اور ہم ....
— آدمی ....

— پتہ نہیں ... وہی بے زاری تھی ... اب جاؤ بھی ... مجھے تھوڑا باقی رکھو،

— کل کیا ہو ... کون جانتا ہے ...،

— اب تو مجھے تم سے ڈر ...،

— ڈر ؟؟؟، آواز کہیں ڈوب کر اُبھری

— مرد بھی عجیب ہوتے ہیں ...،

— مطلب ...،

— یہ چاروں طرف ...،

اور جو بھی سرنگیوں میں ڈوبی اس لڑکی کی لاش لانے گیا، وہیں ڈھیر ہوگیا ... دیکھتے دیکھتے کتنے لوگ اس درخت کے نیچے خاک بسر ہو گئے تھے — درخت کی جڑیں لہو پینے پر مجبور تھیں — وہ گاؤں بالکل شمشان معلوم ہو رہا تھا — کوئی بشر یا اس کا سایہ وہاں موجود نہیں تھا — دروازے کھلے ہوئے تھے اور ہر دروازے سے سنگینوں کی نوکیں جھانکتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں — بارود کی بو سے کنوئیں تالاب اور کھیت بھر گئے تھے ممکن تھا، سُرنگیوں میں ڈوبی لڑکی کو بچانے کی پاداش میں اس گاؤں کو شمشان بھگتنا پڑا ہو — پھر سہ پہر ہوتے ہوتے تو سارا گاؤں گِدھوں کا پڑاؤ بن گیا تھا — گھروں میں گِدھ — چھپروں کے اوپر، دروازوں، کھڑکیوں کے آس پاس، گلیوں اور کنوؤں پر گِدھ — ہر طرف گِدھ — دُور دُور کی بستی والوں نے بھی صاف دیکھا تھا وہ عجیب طرح کے گِدھ تھے — ان کے چہروں پر اوپر نیچے سُرخ سُرخ آنکھیں ٹکی تھیں — پپوٹے بہت بھاری تھے۔ چونچیں دو تھیں — ایک بہت نوکیلی اور دوسری بالکل چپٹی، مگر دونوں دھار دار ... وہ عجیب طرح کے گِدھ تھے اور چاروں طرف لاشیں بکھری تھیں۔

— یہ چاروں طرف ... جیسے کوئی تیز دوڑتا ہوا اُٹھتی بیٹھتی سانسوں کے درمیان بول رہا تھا ... اتنا کہہ کر کہاں چلی گئی ... چپ ...،

— اوہ ... چاروں طرف گِدھ ہی گِدھ ہیں ...،

— گِدھ ...، آواز میں بناوٹی حیرت تھی ... یہ گِدھ کہاں سے آگیا ...،

— یہ چاروں طرف ہیں ...،

— چاروں طرف ...،

— ہاں چاروں طرف ...، الفاظ میں غصّے کی آنچ تھی ... یہ جو آگ لگی ہے۔ بس تمہاری ضد ہے ...،

— مطلب ...، آواز لٹکی زبان والے تھکے ہوئے کتے جیسی تھی۔

— تم لوگ ہی مصیبت کی جڑ ہو ... خود غرض ہو ...، الفاظ ہانپنے لگے تھے ... اب نکلو بھی ... کل سے مت آنا ....،

— مجھے پار تو ہونے دو ...،

انار کی شاخوں کے پاس نیم تاریکی اور بھی سرک آئی تھی ... چاند ... آسمان کے دوسرے کنارے میں کچھ اور بھی نیچے اتر گیا تھا — دھم سے کرتا ہوا سایہ جو نیچے اترا تھا، وہ سانپ کی طرح لہراتا ہوا اور بڑھ کھا بڑ دیوار کے پار جا کے بغل والی چھت پر غائب ہو چکا تھا۔

اب رات کے تین ٹکڑے، پاس میں بہنے والی ندی کے پانیوں میں گھل چکے تھے. قریب و دور سے گولیوں کی آوازیں رہ رہ کے آ رہی تھیں... کبھی دُور کوئی چیخ بلند ہوتی پھر شاید کسی گہری اندھیری کھائی میں ڈوب جاتی. بستی بھی ساری خوف کی گہری کھائی میں ڈوبی ہوئی تھی. نیند کی کھائی اس کے لیے بند ہو چکی تھی.

ایک بڑے سے مکان کے بالکل کھلے آنگن میں نیم برہنہ نیم بے ہوش سی عورت کے سر پر پانی سے بھری بالٹیوں کا ریلا جاری تھا.

— یہ کیسا پاپ ہے کہ اترتا ہی نہیں...، پانی سے بھری ہوئی ایک بالٹی اچھالتے ہوئے کسی نے کہا...

— ارے... دھیرے، بول...، بولنے والے کے منھ پر کسی نے ہاتھ رکھ دیا... وہ آ جائیں گے....

— یہ تو مر جائے گی...، بہت دھیمے سے کسی بوڑھی عورت کی آواز بجھتے ہوئے چراغ کی زبان کی طرح لڑکھڑائی....

— کیسی مصیبت ہے.... اسے ہم ڈاکٹر کے یہاں کیوں کر لے جائیں...،

— کیسا پاپ ہے کہ اترتا ہی نہیں...،

— بدبختی... چلّائے جا رہا ہے... جانتا نہیں... چاروں طرف کرفیو پھیلا ہے...،

اور — اس کے فوراً بعد بغل کے گاؤں میں جو دھماکہ، چیخ اور نعرے شروع ہوئے تو مسلسل پندرہ منٹ تک جاری رہے — پھر آسمان دھوئیں سے بھر گیا — ڈوبتے ہوئے چاند کی دھندلی ہوتی ہوئی روشنی سیاہ دھوئیں میں کہیں غائب ہو گئی تھی — درختوں کی پرچھائیاں ادھ مری سی بن گئی تھیں — چھتوں، کھپریلوں اور دیواروں پر بیٹھے ہوئے اُلوؤں نے چپی کے چوہے نگل لیے تھے.

رات نے ایک جھٹکے سے اپنا پہلو بدل لیا تھا... صبح نے آسمان کا ایک کونا سرکا کے گاؤں کی طرف جھانکا تھا. گھروں کے دروازے رت جگوں سے نڈھال دھیرے دھیرے کھل رہے تھے. ملگجی روشنی میں لوگوں کے چہرے نچوڑے، بےچین آمیز نظر آ رہے تھے — آ رہے تھے — جا رہے تھے — ایک دوسرے کو دیکھ کے یوں ہاتھ جوڑ رہے تھے جیسے ایک نے دوسرے کی جان بخشی ہو... کنوؤں کے آس پاس بالٹیاں بج رہی تھیں.

— چلو یہ رات تو گذر گئی...،

— گذر تو گئی...، کوئی معمر سی آواز تھی... دن بھی تو جلد ہی گذر جائے گا...، لہجے میں اندیشے کی گرفت تھی.

— پھر وہی شام...، دوسری معمر آواز تھی... وہی رات... وہی کرفیو... پھر وہی رات...، جیسے کوئی ناامید مریض کراہ گیا تھا...

— ابھی تو رات... بہت لمبی ہے... مرے بابا...، بڑے سے کنوئیں کے اندر سے کوئی تھرتھراتی ہوئی آواز آئی تھی....

پھر — پاس میں ہی زرد چاندنی رنگت والی عورت کی انار جیسی سرخ آنکھوں میں خوف کا کوئی پرندہ پھڑپھڑا اٹھا تھا.

مذبح کی بھیڑیں

خورشید اکرم

مذبح کو جاتے والے اس راستہ پر بھیڑوں کے ریوڑ آتے رہتے ہیں۔ یہاں سے گذرنے والے ریوڑوں میں بھیڑوں کی تعداد کم یا زیادہ ہو سکتی ہے لیکن بھیڑیں ساری ایک ہی سی ہوتی ہیں۔ پہلی صف کے پیچھے پیچھے ایک دوسرے میں گھسی گھسی چابک کے خوف سے جلدی جلدی چلنے والی۔ انہیں ہانکنے والے بھی سبھی ایک سے ہوتے ہیں جن کی مشترکہ شناخت یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے اپنے ہاتھ میں چابک لیے ریوڑ کے آگے پیچھے چلتے ہوئے اسے ہانکتے رہتے ہیں۔

ریوڑ کے ہانکنے والے عام طور پر گڈریا کہلاتے ہیں جن کے بارے میں کہانیوں میں لکھا ہوتا ہے کہ وہ اپنی بھیڑوں کو جنگل میں چرانے لے جاتے ہیں۔ بھیڑیں دن بھر اپنی مرضی سے چرتی رہتی ہیں اور شام ڈھلنے سے پہلے انہیں ہانک کر باڑہ میں واپس لے آیا جاتا ہے۔ سو انہیں اپنے ہنکائے جانے پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا لیکن جس راستہ کا بیان ذکر ہے اس پر ہانکے جانے والی بھیڑیں جنگل کو نہیں مذبح کو لے جائی جاتی ہیں، اور ان کو ہانکنے والے کچھ بھی کہے جا سکتے ہیں مگر گڈریے نہیں۔

ہانکنے کے کام پر مامور تین چار آدمی بہت دیر سے بھیڑوں کو ہانکے چل رہے ہیں بھیڑوں کو ہانکنا اب ان کے لیے کوئی مشکل کام نہیں رہ گیا ہے کیونکہ یہ بہت دنوں سے اس کام پر مامور ہیں اور بھیڑوں کی فطرت جانتے ہیں۔ ویسے جیسا کہ یہ خود ہی کبھی کہتے ہیں۔ بھیڑوں کی کوئی خاص فطرت نہیں ہوتی ہے۔ اس سے ان کا مطلب یہ کہ کوئی ایسی فطرت نہیں جس کی وجہ سے انہیں کبھی کچھ زیادہ پریشانی ہوتی ہو۔ اگرچہ اُن کے سَر پر سینگیں ہوتی ہیں اور بلکہ بعض بعض کی تو کافی بڑی بڑی ہوتی ہیں۔

ہانکنے والوں کے ہاتھوں میں چھوٹی سی ایک چھڑی ہوتی ہے جس کے سرے پر تقریباً دو ہاتھ لمبی تیل پلائی ہوئی مضبوط سُتلی بندھی ہوتی ہے۔ جسے چابک کہتے ہیں اور جسے ہوا میں مارنے سے ایک... شا... پ... کی آواز ہوتی ہے۔ چابک کا استعمال کرنے کی نوبت کبھی کبھی آتی ہے۔ جب کوئی بھیڑ چلتے چلتے رُکنے لگتی ہے یا اُن کے منشا کے برخلاف ریوڑ سے نکل کر کسی دوسرے راستہ کی طرف مڑنے کی کوشش کرتی ہے تو یہ اُس پر ایک آدھ چابک جما دیتے ہیں۔ چابک کی مار سے تلملا کر بھیڑ سیدھے راستہ پر آجاتی ہے اور اس سے دوسرے بھیڑیں بھی بدک جاتی ہیں۔ ایسے وقت میں عام طور سے بے فکری سے چلنے والی بھیڑوں میں ایک طرح کی کھلبلی مچ جاتی ہے اور وہ سب چابک کے خوف سے ایک دوسرے میں گھسی گھسی چلتی ہیں۔ جو بھیڑیں کنارے کی طرف ہوتی ہیں۔ وہ چابک کی مار سے بچنے کے لیے بیچ میں گھس جانا چاہتی ہیں۔ مذبح پہنچنے تک راستہ بھر ان میں آپس میں یہ دھکم پیل چلتی رہتی ہے۔ حالانکہ اطمینان انہیں وہاں بھی نہیں ہوتا کیونکہ وہ یہ جانتی ہیں کہ ہانکنے والے بیچ میں گھس کر بھی چابک چلا سکتے ہیں۔

یہ بھیڑیں بہت دیر سے چل رہی ہیں اور تھک بھی گئی ہیں لیکن انہیں رکنا نہیں ہے کیونکہ ان کے ہانکنے

والے ہاتھ میں چابک لیے مستعدی سے چل رہے ہیں۔

ریوڑ کے بیچ میں چلنے والی ایک بھیڑ نے جو بہت دیر سے یہ سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی کہ اس کو اور اس کے ساتھیوں کو کہاں ہانک کر لے جایا جا رہا ہے، اپنی گردن ذرا اونچی کر کے ریوڑ کے باہر دیکھا تو اسے اپنے آس پاس کی دنیا ویسی نہیں لگی جیسی وہ دیکھتی آئی ہے۔ بہت دیر سے کوئی اس کے اندر ٹہوکے مار رہا تھا۔ اس لیے وہ پہلے بیچ سے نکل کر کنارے آئی جہاں چابک پڑنے کا خطرہ ہر وقت بنا رہتا ہے۔ کنارے آ کر کچھ دیر چلنے کے بعد اسے بہرحال یہ اندازہ ہو گیا کہ یہ وہ راستہ نہیں ہے جس پر وہ اکثر چلا کرتی تھی اور اپنے باڑہ میں واپس آ جاتی تھی۔ اس نے ایک بار رک کر اپنے ارد گرد غور سے دیکھ لینا چاہا۔ اس کے رک کر گردن گھما گھما کر ادھر ادھر دیکھنے بھر کے اس عمل میں ریوڑ اس سے پانچ سات میٹر آگے نکل گیا۔ ہانکنے والوں میں سے ایک پلٹ کر پیچھے آیا اور ایک چابک سٹاک سے اس کے بدن پر پڑا۔ وہ بلبلا کر رہ گئی اور دوسرا چابک پڑنے سے پہلے ہانکنے کے اشارہ پر لپک کر ریوڑ میں شامل ہو گئی۔ اس کا بدن چابک کی مار سے بلبلا رہا تھا لیکن پھر بھی یہ ایک سوال اس کے اندر ٹہوکے مار رہا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو اس نے اپنے ساتھ چلتی ہوئی ایک بھیڑ سے پوچھا۔

"یہ ہم لوگ کہاں جا رہے ہیں"

"جہاں لے جائے جا رہے ہیں"

"مگر... ہم کہاں لے جائے جا رہے ہیں"

"جہاں روز لے جائے جاتے ہیں"

"لیکن دیکھو، ہم جہاں روز لے جائے جاتے ہیں یہ وہ راستہ نہیں ہے۔"

"چپ چاپ چلتے چلو.... ورنہ ابھی چابک پڑے گا"

"....لیکن.... لیکن یہ ہم پر چابک مارنے والا ہوتا کون ہے"

بھیڑ نے پلٹ کر اس سرکش بھیڑ کو دیکھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کس طرح کے سوال کر رہی ہے اسے لگا یہ پاگل ہو گئی ہے سو اسے چھوڑ کر بیچ میں گھس گئی۔

ذرا دیر پہلے جو چابک کی مار اس کے بدن پر پڑی تھی اس سے ٹیس کی لہر ایک بار پھر اٹھی اور ایک بار پھر اس کے من میں یہ سوال تازہ ہوا کہ وہ کہاں لے جائی جا رہی ہیں۔ اپنے ساتھ چلتے ہوئے ایک دوسری بھیڑ سے اس نے پھر اپنا سوال دہرایا۔

"کیا تم نے یہ سوچا ہے کہ ہم کہاں جا رہے ہیں"

"اس میں سوچنے کی کیا بات ہے۔ ہم تو اپنے آگے والوں کے پیچھے پیچھے چل رہے ہیں۔"

"لیکن کیا یہ ہمارے آگے والوں کو کچھ پتہ ہے کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔"

"پتہ نہیں ...." اتنا کہہ کر اس بھیڑ نے ایسے چپ سادھ لی جیسے اسے اس طرح کی باتوں سے کوئی سروکار نہ ہو۔

"لیکن کیا ہمارے آگے والوں کو کچھ معلوم ہے کہ ہم کہاں چل رہے ہیں۔"

اس نے ایک بار پھر کہا

اس بار چپ سادھ لینے والی بھیڑ کی آنکھوں میں پئے بہ پئے سوال کرنے والی اس بھیڑ کے تئیں

شدید بے زاری تھی۔ اس نے اسے غصے سے دیکھا اور اس کے الٹے سیدھے سوالوں سے پیچھا چھڑانے کے لیے آنکھ بند کر کے ریوڑ کے ساتھ چلنے لگی۔

اس بھیڑ نے جس کے بدن پر ایک چابک زور کا پڑ چکا تھا اور جس کے من میں خدشہ لگاتار ٹہوکے مار رہا تھا ایک بار پھر اپنے اردگرد نظر دوڑائی۔ اپنے آس پاس کی اجنبی اور نامانوس فضا کو دیکھ کر اس کے اندر کھلبلی سی ہوئی۔ اتنی دیر میں پھر ریوڑ آگے نکل گیا تھا۔ ہانکنے والے نے پہچان لیا کہ یہ وہی بھیڑ ہے جو کچھ دیر پہلے بھی ریوڑ سے الگ ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگی تھی۔ اس لیے اس نے اسے قابو میں کرنے کے لیے اب کی بار اور زور سے چابک مارا۔ اتنی زور سے کہ اس کے بلبلانے کی آواز آگے نکل گئے ریوڑ کی ایک ایک بھیڑ نے سنی۔ اب کی بار اسے کھدیڑ کر بالکل آگے کر دیا گیا۔

آگے کی بھیڑیں کوئی اس طرح صف بنا کر نہیں چل رہی تھیں کہ جو ابھی آگے ہیں وہ شروع ہی سے آگے تھیں اس کا اندازہ اس بھیڑ کو کچھ دیر تک آگے آگے چلنے کے بعد ہوا۔ لیکن اس وقت صف کے ترتیب سے ہونے یا نہ ہونے اور دو چابک کی مار کی ٹیسوں سے زیادہ وہ سوال اس کے اندر ٹہوکے مار رہا تھا جو تھوڑی دیر پہلے اس کے من میں آیا تھا۔ اس نے اگلی صف میں اپنے ساتھ چلنے والی ایک بھیڑ سے ذرا غصہ سے پوچھا۔

"تم ..... آگے آگے چل رہی ہو۔ کیا تمہیں پتہ ہے کہ ہم لوگ کہاں لے جائے جا رہے ہیں"

"مجھے کیا پتہ ....."

"تمہیں اگر پتہ نہیں ہے تو چل کیوں رہی ہو۔"

"اس لیے کہ ہم اتنے سارے ایک ساتھ چل رہے ہیں۔ اور یہ کوئی نئی بات تو ہے نہیں۔ ہم پیدا ہوتے تھے تو ہم نے اپنے باپ کو اس طرح چلتے ہوئے دیکھا تھا اور اس کی دیکھا دیکھی ہم بھی ریوڑ کے ساتھ چلنے لگے تھے۔"

"لیکن تم کیا غور نہیں کرتے کہ یہ وہ راستہ نہیں ہے جس پر ہم اس سے پہلے چلا کرتے تھے"

"کیوں ... کیا ہوا اس راستے میں، سب کچھ تو ویسا ہی ہے۔ نیچے زمین ہے اوپر آسمان ہے اور ہم سب اتنے سارے ساتھ ہیں۔ ہم اسی طرح چلتے رہے ہیں اور ہمارے باپ بھی اسی طرح ....."

" ..... ہمارے باپ! ... ہاں ٹھہرو.. کیا تمہیں معلوم ہے کہ اسی طرح ایک بار ہمارے باپ ریوڑ کے ساتھ چلے تھے اور آج تک باڑہ میں واپس نہیں آئے۔"

"کیا پتہ ... خیر چھوڑو! ذرا جلدی جلدی چلو" اس نے چابک کی طرف دیکھا جو ہوا میں لہرایا تھا۔ ہانکنے والے رہ رہ کر اپنی مستعدی کا مظاہرہ کرتے۔ ان کے قدم تیز ہو جاتے۔ چابک ہوا میں لہرانا اور اس سے بھیڑوں کو سمجھ لینا پڑتا کہ انہیں جلدی جلدی چلنا ہے۔

"تمہیں کچھ معلوم نہیں، تم کچھ جانتی نہیں اور تم جاننے سمجھنے کی کوشش بھی نہیں کرتیں اور یہ پیچھے والے تمہاری دیکھا دیکھی چل رہے ہیں کہ تم آگے ہو اور تمہیں ٹھیک معلوم ہوتا ....."

"میرے پیچھے کیوں .... میں تو ابھی ذرا پہلے دھکم پیل میں آگے آ گئی۔ اتنی دیر سے تو میں خود پیچھے تھی۔"

"یہ تم جانتی ہو کہ تم پہلے سے پیچھے تھیں لیکن جو پیچھے ہیں وہ سمجھتی ہیں کہ تم اور ہم جو اس وقت آگے ہیں، ہمیں صحیح صحیح معلوم ہو گا کہ ہم کہاں ہانکے لیے جا رہے ہیں .... اور ہمیں تمہیں کچھ نہیں معلوم .... اور یہ سب اس دھوکہ میں ہیں کہ ہم ....."

عجیب ایک سوال اس کے دماغ میں آیا تھا جس کی وجہ سے اس کو دو چابک پڑ چکے تھے اور جس کی ٹیسیں ابھی تک رہ رہ کر اس کے بدن میں اٹھ رہی تھیں۔ انہیں ٹیسوں نے ایک اور سوال اس کے من میں کھڑا کر دیا کہ پاؤں ان کے ہیں اور اگر وہ اپنے پاؤں سے چل رہی ہیں تو انہیں یہ معلوم کرنے کا حق تو ہے ہی وہ کہاں لے جائے جا رہی ہیں اور اُس نے تو صرف یہ جاننا چاہا تھا کہ وہ سب آج کہاں لے جائے جا رہی ہیں۔ اس نے کسی کا کچھ نہیں بگاڑا تھا۔ پھر اسے صرف اتنی سی بات جاننے کے جرم میں کوڑے کیوں پڑے۔ سوچتے چلتے اس بار اُس نے آگے کے ایک بوڑھی بھیڑ سے ایک ساتھ دو سوال پوچھے۔ ایک تو یہی کہ وہ کہاں لے جائی جا رہی ہیں، اور دوسرا یہ کہ انہیں یہ جاننے کا حق ہے کہ نہیں کہ وہ کہاں لے جائی جا رہی ہیں۔

بوڑھی بھیڑ نے ترحم آمیز نظروں سے اس بھیڑ کو دیکھا جس کو دو چابک پڑ چکے تھے اور جو اس کے باوجود ایک ساتھ دو سوال کر رہی تھی اسے اس کی ہٹ پر رحم بھی آیا اور خوف بھی چنانچہ اس کی بات کا جواب دیئے بغیر اپنی رفتار ذرا سست کر کے وہ ریوڑ کے بیچ میں آ گئی۔

ہانکنے والے پوری مستعدی سے ریوڑ ہانک رہے تھے اور بھیڑیں ایک دوسرے میں گھسی گھسی جلدی جلدی چل رہی تھیں کہ ہانکنے والوں نے دیکھا کہ آگے کی ایک بھیڑ جس کو دو چابک پہلے ہی پڑ چکا تھا، تیزی سے لپکتی ہوئی آگے نکلی اور ریوڑ سے الگ ایک طرف مڑ کر دوڑنے لگی ہانکنے والے نے ایک دوڑ لگائی اور شڑاک سے ایک چابک اس کے بدن پر جما دیا۔ بھیڑ بلبلائی اتنی زور سے کہ ایک بار پھر پورے ریوڑ نے اس کی بلبلاہٹ کی آواز سنی۔ لیکن وہ رُکی نہیں، وہ بھاگتی رہی۔ بقیہ بھیڑوں کو دوسرے ہانکنے والوں نے روک لیا۔ وہ تعداد میں اتنی تھیں، اکٹھی تھیں مگر خوف سے تھر تھر کانپ رہی تھیں اور ان میں زبردست کھلبلی مچی ہوئی تھی کہ کسی بات پر انہیں بھی اسی طرح چابک نہ پڑنے لگے۔ ادھر بھاگتی ہوئی بھیڑ کے بدن پر ایک اور چابک . . . . اور اس بار چابک کی تسلی اس کے بدن کے روئیں میں الجھ گئی، جس کو کھینچنے میں اس کے بدن کا رُواں . . . . . جر . . . چر . . . . کی آواز کے ساتھ کچھ زمین پر گرا، کچھ چابک میں لپٹا ہوا چلا آیا۔ بھیڑ کے بدن کے زخمی حصے سے خون رسنے لگا۔ بھیڑ ادھ مری ہو گئی تھی لیکن اس کے اندر اپنے تحفظ کا احساس شدید تر ہو گیا تھا۔ اب اور بھاگنے کی بجائے اس نے پلٹ کر اپنی سینگوں سے ہانکنے والے پر حملہ کرنا چاہا۔ تھوڑی دیر پہلے جب کہ اسے پہلا چابک پڑا تھا اور جب اس کا بدن اس طرح زخمی نہیں ہوا تھا، اسی وقت اگر اس کے اندر اپنے تحفظ کا احساس اسی شدت سے جاگ جاتا اور وہ ہانکنے والے پر اسی طرح لپک پڑتی تو شاید اس وقت کوئی دوسرا ہی منظر قلم بند کیا جاتا۔ فی الوقت ہوا یہ کہ اسے اپنی طرف حملہ کرنے کا پوز بناتا دیکھ کر ہانکنے والے نے تڑا تڑ کئی چابک اسے لگا دیے بلکہ دو تین لاتیں بھی جما دی۔ بھیڑ ایسی اُدھ مری ہو گئی تھی کہ بلبلاتے اور غراتے ہوئے زمین پر پڑی رہی۔ اس کے پڑے پڑے پورے ریوڑ پر نظر دوڑائی جہاں ایک طرح کی شانت کھلبلی مچی ہوئی تھی، بھیڑوں میں خوف اور اس زخمی بھیڑ کے تئیں انتہائی ہمدردی تھی اور ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اُسے ہوا کیا ہے؟ زخمی بھیڑ اس شدید تکلیف کے باوجود سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی کہ اس کے اتنے سیدھے سے سوالوں کا جواب دینے کے بجائے اسے کیوں مارا گیا، اور یہ سوچ سوچ کر اس کے من میں کرودھ آرہا تھا۔ لیکن اب اس کے اندر اتنی تاب نہیں تھی کہ وہ اپنے اوپر چابک چلانے والے کے پیٹ میں اپنی سینگ گھونپ دے۔ اور اب وہ اسی کرودھ اور بے چارگی میں اپنی ان ساتھی بھیڑوں کی طرف دیکھ رہی تھی جن کے سر پر سینگیں تھیں، جو اپنے پیروں پر کھڑی تھیں، جن کو کوڑے نہیں پڑے تھے اور جن کے اندر اس کے خیال میں یقیناً

اتنی تاب تھی کہ وہ چاہیں تو ہانکنے والوں کے پیٹ میں اپنی سینگیں گھونپ دیں۔

ایک اور چابک اس کے بدن پر پڑا۔ اور اس کی آنکھوں کے سامنے بالکل اندھیرا چھانے لگا۔ اس میں چلنے تک کی تاب نہیں رہ گئی تھی مگر اس کے اندر کوئی ایسا ہی بیدا ہو گیا تھا جس نے یہ طے کر لیا تھا کہ اسے اب وہاں سے نہیں کھسکنا۔ ہانکنے والے نے اس کے پیٹ میں لات گھسا کر اسے اٹھانے کی کوشش کی لیکن وہ نہ اٹھ سکی، بکریوں کہا جائے کہ اٹھی نہیں۔ ریوڑ میں چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں کہ آخر اسے کیا ہوا ہے؟ کیا اب یہ زندہ بچ پائے گی؟ یہ چھوڑ کر کہاں بھاگ رہی تھی۔ اور کیوں؟ صرف سوال تھے جو سب ایک دوسرے سے کر رہی تھیں لیکن سچ بات یہ ہے کہ یہ سوال نہیں تھے۔ یہ تو ان کی حیرت، ترحم اور خوف تھا جو ان دو ایک سوالوں کی صورت میں ادھر ادھر رینگ رہا تھا۔ وہ بھیڑیں جن سے زخمی بھیڑ نے اپنے من کے سوال دوہرائے تھے، خاموش تھیں بلکہ اس سوال سے بچنے کے لیے اپنی اپنی آنکھیں موندے کھڑی تھیں۔

ہانکنے والوں نے جب یہ دیکھا کہ یہ بھیڑ اتنی زخمی ہو چکی ہے کہ اب اس میں چلنے کی تاب نہیں رہی ہے تو انہوں نے آپس میں کچھ باتیں کیں۔ ریوڑوں کو ہانکنے کا تجربہ انہیں بتاتا ہے کہ کبھی کبھی کسی ریوڑ سے اس طرح کی کوئی سرکش بھیڑ نکل آتی ہے جسے لاکھ مارو وہ اپنی ہٹ پر اڑی رہتی ہے۔ ایسے موقعوں کے لیے انہیں اجازت بلکہ ہدایت تھی کہ ایسے ہٹی اور زخمی بھیڑ کو راستے میں چھوڑ دیں کیونکہ باقی ساری بھیڑوں کا بہ حفاظت مذبح پہنچ جانا زیادہ اہم ہے.... تو انہوں نے آپس میں باتیں کیں اور طے کیا کہ اسے یہیں چھوڑ کر باقی بھیڑوں کو لے کر آگے کوچ کیا جائے۔ ریوڑ میں پہنچنے کے بعد انہوں نے آگے پیچھے اور دائیں بائیں سب طرف سے اپنی اپنی پوزیشن سنبھالی اور ان کے چابک ہوا میں لہرائے جس کا اشارہ ریوڑ کی طرف صاف تھا کہ آگے بڑھے۔ رکی ہوئی بھیڑیں جن کے اندر انتہائی سراسیمگی پھیلی ہوئی تھی اور جن کے کانوں میں اپنے ایک زخمی ساتھی کے بلبلانے اور تڑپنے چیخنے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی، چابک کے اشارہ پر ایک دوسرے میں گھس گھسا کر آگے بڑھنے لگیں۔ ان میں پلٹ کر اپنے اس زخمی ساتھی کو دیکھنے کا حوصلہ نہیں تھا جو کچھ دیر پہلے تک بجبر و عافیت ان کے ساتھ چل رہی تھی اور اب سرکشی کی سزا میں زخموں سے چور پڑی تھی۔

زخمی بھیڑ نے اپنی دھندلائی آنکھوں سے ان بھیڑوں کو دیکھا جن کے پاؤں بدن اور سینگ سلامت تھے مگر چابک سے خائف سہمی سہمی چلے جا رہی تھیں اور سرکش پیروں سے ادھڑی ہوئی زمین کا ایک ٹکڑا پیچھے چھوٹتا جا رہا تھا۔ کچھ سوچ کر زخمی بھیڑ نے ریوڑ کی طرف منہ اٹھا کر اپنی قوت سے زیادہ کی ایک زوردار آواز لگائی۔ اس آواز سے ریوڑ کی بھیڑیں مانوس نہیں تھیں سو انہوں نے سنا تو سہی مگر سمجھیں کچھ بھی نہیں۔

راستہ بھر ساری بھیڑیں ایک دوسرے سے یہی پوچھتی رہیں۔ آخر اسے ہوا کیا تھا؟ وہ کہاں بھاگ رہی تھی اور کیوں؟ کیا وہ زندہ بچ پائے گی۔

مذبح کے احاطے میں داخل ہونے تک وہ ایک دوسرے سے بار بار یہی سوال پوچھ رہی تھیں۔

منٹو کی بدکردار نیک عورتیں ۰ ممی ، شاردا، موذیل

ذہن جدید

زمین

سہیل وحید

میں نیا نیا انفارمیشن افسر ہوا تھا اور یہ پہلا موقع تھا جب کسی منسٹر کے پروگرام میں میں پریس پارٹی کا نگراں بن کر جا رہا تھا۔ جیسے تیسے انجن بھرا راستہ ختم ہوا اور وہ جگہ آ گئی۔ منسٹر دو گھنٹے دیر سے آئے۔ فنکشن ہوا۔ ایک رہائشی کالونی کے سنگ بنیاد رکھنے کی رسم ہوئی اور آواس وکاس کے چیف انجینئر منسٹر کے ساتھ ساتھ اخبار نویسوں کو نئی کالونی کی سائٹ کے بارے میں بتانے لگے۔

”کالونی کے مغرب میں بیس کیلومیٹر تک ہرے بھرے کھیت ہیں۔ پلان کے مطابق پورب میں محکمۂ جنگلات کے ذریعہ پانچ کلومیٹر لمبی گرین بلیٹ تیار کرائی جائے گی۔ اس قومی شاہراہ کے دائیں جانب جو کالونی کا جنوبی حصہ ہوگی ایک آٹھ لین والی سڑک تعمیر کرائی جائے گی۔ کالونی کے درمیان میں ایک پارک اور جمنیزیم بنوایا جائے گا اور ایک کمیونٹی سینٹر بھی۔ یہ کالونی ہندوستان کی اُن چند گنی چنی کالونیوں میں سے ایک ہوگی جو انسانی صحت کو فروغ دینے کے بنیادی عنصر کو خیال میں رکھ کر بنائی جا رہی ہیں اور شمالی ہند میں یہ اپنی قسم کی پہلی کالونی ہوگی۔ اس کالونی کا نام ’وسُندھرا‘ تجویز کیا گیا ہے۔“

اخبار نویس انجینئر کی باتوں کو نوٹ کرتے جا رہے تھے۔ بیچ بیچ میں کچھ پوچھ بھی لیتے تھے۔ منسٹر ہوں ہاں اور وہری گڈ کے علاوہ کچھ نہیں بول رہا تھا۔ کبھی ادھر اُدھر دیکھنے لگتا کبھی اخبار نویسوں کی طرف دیکھ کر مسکرا دیتا۔

”دیکھئے یہ کالونی کا سینٹرل پوائنٹ ہے یعنی ”ہارٹ آف وسُندھرا“ یہاں ایک خوبصورت پارک ہوگا۔ سامنے جمنیزیم بائیں کمیونٹی سینٹر“۔۔ انجینئر اب سب کو اس جگہ لے آیا تھا اور بتائے جا رہا تھا۔ میں نے غور کیا کہ انجینئر نے پارک کے شمالی کونے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ یہ تقریباً سو گز کا پلاٹ تھا۔ ہو سکتا ہے بھول گیا ہو۔ خیر۔ منسٹر کے جانے کے بعد میں نے انجینئر سے پوچھا کہ آپ نے اس نکڑ والی زمین کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔

”اوہو۔۔۔ مسٹر انصاری یہ زمین بہت اچھی ہے۔ کالونی بن جانے کے بعد یہی وہ جگہ ہے جہاں سے پوری کالونی کا لطف لیا جا سکتا ہے۔ ویل سائیڈ پلیس ہے۔ تین شاہراہیں یہاں آکر ملتی ہیں۔ پیچھے پارک ہے۔ مستقبل میں کبھی اس پر اگر کوئی ہوٹل بن جائے اور سب سے اوپر کی منزل پر اوپن ریسٹورینٹ کھل جائے تو کالونی کی خوبصورتی میں بھی چار چاند لگ جائیں گے اور یہاں کے لوگوں کا وہ محبوب ریسٹورینٹ بھی بن جائے گا کیونکہ یہ جگہ ہے ہی اتنی دلکش۔

”یہ زمین آواس وکاس کی نہیں ہے، میں نے پوچھا۔

”نہیں، شمالی حصہ چونکہ کھلا چھوڑ دیا گیا ہے اس لیے یہ زمین نہیں اکوائر کی گئی“ انجینئر نے بتایا۔

اس وقت نہ جانے کیوں میرے دل میں خیال آیا کہ اگر اس نکڑ والی زمین پر گھر بنایا جائے تو کتنا اچھا رہے گا۔ دوسرے تمام گھروں سے مختلف، نیا اور انوکھے قسم کا۔

"سنیے .... یہاں فلیٹ بھی تو بن سکتا ہے"

"اوہو .... آف کورس .... لیکن جدید ہاؤسنگ ٹیکنالوجی کے مطابق ایسی جگہوں پر مکانات نہیں بنوائے جاتے۔ بہت خرچیلی تعمیر ہوتی ہے۔ دیکھ بھال میں بھی بہت خرچ ہوتا ہے۔ ایسی جگہوں پر انگریز مکان بنوایا کرتے تھے۔ آپ نے بڑے شہروں میں پیلیس PALACE دیکھے ہوں گے۔ پرانے ضلعوں میں کلکٹر کے بنگلے بھی جو انگریزوں کے بنوائے ہوئے ہیں۔ اسی طرح کا مکان بن سکتا ہے۔ یہاں" انجینئر نے بڑی خوش اسلوبی سے مجھے سمجھایا۔

زندگی میں پہلی بار کسی زمین پر میری حسرت بھری نگاہ پڑی — "چلئے صاحب چلئے .... سب کام ہوگیا" اخبار نویسوں نے کہا اور ہم سب واپس چلے آئے۔

دن بیتتے گئے میں نے کبھی اس زمین کے بارے میں سوچا بھی نہیں۔ وہ ملازمت چھوڑ کر ایک پرائیویٹ فرم میں نوکری کر لی۔ دیکھتے دیکھتے تین سال گذر گئے۔ ایک دن میں کمپنی کے کسی کام سے جا رہا تھا کہ وہ جگہ راستے میں پڑی مجھے فوراً احساس ہوا کہ یہ وہی جگہ ہے وہی کالونی ہے جس کے سنگ بنیاد کی تقریب میں ہم آئے تھے۔ اور اچانک وہ ٹکڑ والی زمین یاد آگئی — "روکو .... روکو ذرا روکو ...." میں نے گاڑی رکوائی اور اتر کر چاروں طرف دیکھنے لگا مکانوں کی ایک منزل بن چکی تھی اور دوسری منزل پر کام چل رہا تھا۔ سڑکیں بن رہی تھیں۔ بجلی کے کھمبے لگائے جا رہے تھے۔ ہر طرف شور تھا۔ اینٹوں کے ٹوٹنے کی آوازیں اور تارکول کے جلنے کی بو — مزدوروں کا شور — ہلتے ڈولتے اوپر نیچے مرد عورتیں۔ کوئی اینٹیں ڈھو رہا تھا کوئی تسلا۔ سیمنٹ کی ٹھنڈی کسک ....

"چلو اس طرف چلو" میں نے ڈرائیور کو کالونی کے شمالی حصے کی نشاندہی کرائی انجینئر کے الفاظ کانوں میں بجنے لگے۔ "ہارٹ آف وُنڈھرا ...." اس زمین پر پاؤں رکھتے ہی مجھے اپنے دل میں کچھ ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ میں نے چاروں طرف نظر دوڑائیں۔ سچ مچ کالونی بن جانے کے بعد یہ جگہ بہترین ہوگی۔ رہائش کا لطف یہیں آسکتا ہے۔

"چلو ...." میں نے ڈرائیور سے کہا اور ہم اپنے کام پر چل پڑے۔ اس دن کے بعد مجھے وہ زمین اکثر یاد آتی رہی۔ بہت سے تغیر ہوئے تبدیلیاں نئے نئے پیرہن میں نمودار ہوتی رہیں اور میں اپنے کام میں مصروف رہا۔ وہ زمین جب جب یاد آتی ذہن جھٹکتا، ذہن سے نکالنے کی کوشش کرتا۔ پھر سوچتا بھی کہ یہ زمین مجھے کیوں یاد آتی ہے۔ پتہ نہیں کیوں میں بے وجہ کسی چیز میں الجھ جاتا ہوں۔

میری زندگی کے کسی گوشے میں اپنے لیے مکان بنانے کی کوئی تمنا نہیں تھی، اپنا گھر ہو ایسی کسی آرزو نے کبھی جنم ہی نہیں لیا تھا۔ گھر جاتا تو ماں مکان لے لینے کے لیے اصرار کرتی۔ ان کی باتوں کو ہنس کر ٹال دیتا۔ "پسند کی زمین نہیں مل رہی ہے ...." کبھی کہہ دیتا پیسے نہیں ہیں۔ کبھی یہ سمجھا دیتا کہ بے وقوف لوگ مکان بنواتے ہیں اور عقلمند لوگ ان میں رہتے ہیں اور چونکہ میں عقلمند ٹھہرا اس لیے میرے واسطے بھی ہر شہر میں کچھ بے وقوفوں نے مکان بنوا رکھے ہیں۔

لیکن پچھلے تین مہینوں سے ماں نے مکان بنوانے کی مہم چھیڑ رکھی تھی۔ ہفتے میں دو خط آتے کہ جلد مکان بنواؤ۔ کوئی زمین لے لو۔ میں نے عاجز آکر سوچا کہ چلو یہ بھی سہی — اب پیسے بھی ہیں۔ لہٰذا لی جائے زمین۔ "زمین" لفظ ذہن میں آتے ہی مجھے وہ ٹکڑ والی زمین یاد آگئی۔ "ہارٹ آف وُنڈھرا ...." اس کی یاد آتے ہی میں نے اپنے

اندر ایک نئی قوت محسوس کی۔ میں خوشی خوشی اپنے پرانے دوست دلیپ ترار کے پاس جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ وہ پراپرٹی ڈیلر ہے ضرور مددگار ثابت ہوگا اس زمین کے سودے میں۔

دلیپ نے مجھے دیکھتے ہی گلے لگا لیا اور مجھے تین سال پہلے کی وہ محفلیں یاد آنے لگیں جو میں دلیپ اور آلوک باترى کے ساتھ سجایا کرتا تھا۔ تب میں انفارمیشن افسر ہو کر نیا نیا آیا تھا۔ "داڑھی کہاں ہے" ...."اچھا آلوک .... ابھی آتا ہی ہوگا اب شام ہوئی ہے، دلیپ نے ہنستے ہوتے بتایا۔

"داڑھی ابھی بھی ہے؟" میں نے پھر پوچھا۔ "ارے یار داڑھی چشمہ اور کیپ انہیں تین چیزوں کا نام تو آلوک باترى ہے"، ہم دونوں ہنسنے لگے۔

"اور بنا ممی کیسی ہے" "ٹھیک ہے۔ گاڑی کب لی۔ ابھی پچھلے برس اور سب؟

اور ہے ہی کیا، ہم دونوں پھر ہنس پڑے۔

"آئیے .... آئیے .... یہ لے آگیا تیرا یار — " آلوک آیا تو خوب محفل جمی۔ جام سے جام ٹکرائے۔ یہ اُن لوگوں کا روزانہ کا شغل تھا۔ کبھی میں بھی شریک رہا کرتا تھا۔

"سنو دلیپ آج میں تمہارے پاس ایک کام سے آیا ہوں۔ ایک زمین کا سودا کروا دو —"

"ارے یار تیرے لیے تو میں اپنا سودا کروا سکتا ہوں، بولو کہاں ہے۔ چلو دیکھتا ہوں۔

ہم تینوں گاڑی میں سوار ہو کر وسندھرا کے لیے نکل پڑے .... ہارٹ آف وسندھرا۔

پرندے جا چکے تھے ستارے آ چکے تھے۔ دُبلا نحیف سا چاند نمایاں ستارے کی طرح چمک رہا تھا ہلکی ہلکی ہوا اور ہلکی سی خنکی .... اس زمین پر پاؤں پڑتے ہی میں فرطِ مسرت سے لرز گیا۔ زمین ویسے ہی پڑی تھی جیسی تین برس پہلے تھی۔ کالونی مکمل ہو چکی تھی کچھ آبادی بھی ہو گئی تھی۔ دلیپ نے زمین دیکھی اور ہم سب واپس چل پڑے۔ پتہ نہیں کیوں مجھے ہلکا پن محسوس ہو رہا تھا۔

"سنو یہ زمین کس لیے لے رہے ہو؟ آلوک نے مجھے چونکا دیا۔

"گھر بنانے کے لیے" دونوں نے اس قدر استعجاب سے میری طرف دیکھا کہ میں گاڑی چلانے چلاتے رُک گیا۔

" تم لوگ اس قدر تعجب میں کیوں پڑ گئے؟

"ابے وہ کوئی گھر بنانے کی جگہ ہے۔ میں تو سمجھا تھا کوئی دفتر وفتر بنائے گا وہ تو کمرشیل پر پز کی ہے دلیپ نے گھورتے ہوتے کہا۔

"تجھے معلوم ہے کہ وہ ہائی وے سے لگی ہوئی ہے۔ رات بھر کھڑکیاں دروازے بجیں گے۔ مکان بار بار کریک ہوگا۔ بیس سال بعد سڑک چوڑی ہو گئی تو گھر توڑ دیا جائے گا۔ چاروں طرف سڑکیں ہیں، بیچ میں ٹھونٹھ جیسا تیرا مکان ہوگا۔ وہاں رہے گا ....؟ چلا ہے کھیت میں گھر بنانے .... بجوکا جیسا لگے گا تیرا گھر .... "

آلوک نے مجھے جھڑکی دی۔

"نہیں پلیز نہیں — مجھے اس کا سودا کروا دو تمہیں میری دوستی کا واسطہ، میں نے التجا کی۔

"ٹھیک ہے یار چل .... کروا دیں گے، دلیپ نے بھروسہ دلایا اور ہم چل پڑے۔ آلوک بڑبڑا رہا تھا .... " اس سالے نے کبھی ہم لوگوں کی بات مانی ہے جو اب مانے گا۔ ٹھیک ہے دلوا دو زمین .... دلوا دو

دلیپ بھائی دلوا دو وہی زمین ۔ ۔ ۔ ۔،، میں نے دلیپ سے چپکے سے کہا کہ کچھ زیادہ ہوگئی ہم دونوں ہنسنے لگے ہم دونوں کو ہنستا دیکھ کر آلوک بھی ہنسنے لگا راستہ طے ہوتا رہا۔

میں رات گئے دلیپ سے اس وعدے کے ساتھ واپس ہوا کہ کل مجھے اس زمین کی ساری تفصیلات مل جائیں گی۔ دوسرے روز میں خلاف توقع جلدی اٹھا۔ نہا دھو کر نکلا۔ دفتر میں کام میں دل نہیں لگا۔ شام کا انتظار کرتے لگا کہ جلدی سے شام ہو اور میں دلیپ کے پاس جاؤں۔ شام ہوتے ہی میں پہنچ گیا دلیپ کے پاس۔

،، یار وہ زمین تو نہیں لے پائے گا — ،، دلیپ کا یہ جملہ میرے سینے پر گھونسے جیسا لگا۔

دکیوں؟ میں اس کے لیے بڑی سے بڑی قیمت چکانے کو تیار ہوں۔ میں اس زمین کے ٹکڑے کے لیے جذباتی ہو چلا تھا۔ اپنی سابقہ تمام ناکامیوں کے احساس نے آ جکڑا تھا۔ یہ میری زندگی کا المیہ رہا تھا کہ جو چیز میں نے پسند کی وہ حاصل نہ کر سکا۔

یہ زمین اسی لائق تھی کہ یہاں پان کا کھوکھا لگ جائے، لوگ پان کھائیں اور اس پر پیک تھوکیں۔

،، نہیں یار وہ تم کو نہیں مل سکتی ،،

،، کیوں یار یہ بات کیسے کہہ رہے ہو۔ آخر کیوں نہیں مل سکتی۔ ایسی کیا وجہ ہے؟ ،،

،، تم کیوں نہیں سمجھتے کہ تم اس کو نہیں حاصل کر سکتے ،،

،، تو بتاؤ میں اس کو کیوں نہیں حاصل کر سکتا؟ ،،

،، یار۔ میونسپل کارپوریشن کہتا ہے کہ میری ہے۔ ڈسٹرکٹ بورڈ کہتا ہے کہ اس کی ہے مزول والوں کا بھی دعوا ہے۔ وقف بورڈ کا بھی اسی قسم کا بیان ہے اور شخصی دعوا کسی کا ہے نہیں۔ اب بتاؤ جب اس کا کوئی مالک ہی نہیں ہے تو تم کس سے خریدو گے؟ ۔ ۔ ۔ اور بتاؤں اِست جین کو جانتے ہو۔ اس شہر کا بہت بڑا رئیس ہے ہوٹلنگ کا کاروبار ہے۔ اس نے دو برس پہلے وہاں ایک بار کھولا تھا۔ ڈھائی مہینے کے بعد وہاں ایک قتل ہو گیا۔ بار بند ہو گیا لوگ کہتے ہیں کسی کا قتل کرنے کے لیے ہی بار کھولا گیا تھا۔ اسی لیے عمارت وغیرہ نہیں بنوائی تھی سب ٹمپریری انتظام تھا۔ بانس بلی ٹینٹ کا۔

،، تو پھر ۔ ۔ ۔ تو پھر جب اِست جین کو وہ زمین مل سکتی ہے تو مجھے کیوں نہیں؟ ،،

،، ہاں اسی طرح جاؤ تم بھی قبضہ کر لو۔ اس نے کوئی خریدی تھوڑی تھی۔ جاؤ قبضہ کر لو۔ وہ بڑی پارٹی ہے رشوت دے دی ہوگی۔ منتری ونتری سے مل لیا ہوگا۔ تمہارے پاس بھی دولت ہے ذرائع ہیں تم بھی قبضہ کر لو۔

،، دیکھو دلیپ تمہیں معلوم ہے میں بنیادی طور پر شریف آدمی ہوں۔ یہ ٹھیک ہے کہ آج میرے پاس دولت ہے اس لیے میں اپنے آپ کو ایماندار کہنے میں شرم محسوس کر رہا ہوں لیکن میں ذلیل نہیں ہوں۔ میں اس کو حاصل تو ضرور کرنا چاہتا ہوں لیکن پوری ایمانداری سے اس کی قیمت ادا کرنے کے بعد۔،،

،، دیکھو یہ ارافت شرافت گئی تیل لینے۔ تمہیں اگر وہی زمین چاہیئے تو جاؤ قبضہ کر لو تھوڑی بہت رشوت دینی پڑے گی اس میں مدد کروں گا۔ ویسے تو وہ تمہارے مطلب کی ہے ہی نہیں۔ میں پھر کہہ رہا ہوں کہ وہ رہائشی پرپز کے لیے بالکل نہیں ہے پہلے اس کے بارے میں سوچو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔،،

"نہیں دلیپ۔ تم نہیں سمجھ سکتے مجھے اس میں جو اُپڑ و بنجر نظر آتا ہے وہ میں ہی دیکھ سکتا ہوں۔ اس کی کشش میں ہی محسوس کر سکتا ہوں۔ ذرا سوچو وہاں پر گھر ہے ....."

...... دائیں جانب سے آتی ہوئی سڑک، سامنے سے گذرتی سڑک، بائیں سے نکلتی سڑک۔ دیکھو کیسا بیکونس ہے .... کیا اینگل بنتا ہے .... اور ہاں پشت پر ہرا بھرا خوبصورت پارک .....واہ .... واہ .. کیسا انوکھا نیا مکان ہوگا .... اپنے آپ میں مثالی

"ارے میرے باپ تو وہ زمین لے ہی نہیں سکتا .... شاعری کرنے لگا" میرے اندر کچھ جھنجھنا کر ٹوٹ سا گیا۔ اس رات میں اپنا سا منھ لئے دلیپ کے پاس سے واپس آیا تھا۔ زندگی ایک بار پھر ڈھرے پر چل پڑی تھی .... مجبور اور مایوس اپنے کام میں لگ گیا۔

دو مہینے اور بیت گئے۔ ماں کے کئی اور خط آئے۔ آج پھر خط آیا۔ پہلا سوال "کوئی زمین پسند آئی؟" یہ مائیں بھی عجیب ہوتی ہیں .... اپنے بیٹوں سے کیسی کیسی امیدیں لگا بیٹھتی ہیں۔

پتہ نہیں کس جذبے کے تحت آج پھر میں اس زمین کو دیکھنے نکل پڑا۔ ریڈ لائٹ پر گاڑی روکنا پڑی نظریں بائیں طرف اپنے آپ اٹھ گئیں۔ پاش کالونی، ہر طرف بڑی بڑی کوٹھیاں کاریں اسکوٹر .... کھڑکیاں اور کھڑکیوں میں خوبصورت لڑکیاں۔ اچانک مجھے بدبو کا احساس ہوا۔ بائیں طرف ہی دو کوٹھیوں کے درمیان ایک خالی پلاٹ پڑا تھا۔ لمبی لمبی گھاس اُگ آئی تھی اس میں گندگی اکٹھا ہو گئی تھی۔ اسی میں سے بدبو آ رہی تھی۔ کسی صاحب علم کا قول یاد آ گیا "زمین لاش کی طرح ہے خالی چھوڑ دی جائے وقت پر اس کو انجام تک نہ پہنچایا جائے تو بدبو دینے لگتی ہے" واقعی صحیح کہا ہے۔ زمین خالی چھوڑ دی جائے تو گھاس اُگ آتی ہے کتوں کی آماجگاہ بن جاتی ہے پتہ نہیں کون کون سے پودے اُگ آتے ہیں سانپ، بچھو پیدا ہو جاتے ہیں .... بدبو دینے لگتی ہے۔ زمین لاش ہے .... جنگل اسی طرح آباد ہوئے ہوں گے .... لاش ہے زمین .... لاش .... ایسی کوئی زمین میرے پاس ہوتی تو سنبھال کے رکھتا۔ بیلا چمیلی اور گلاب کی خوشبوؤں سے معطر کر دیتا۔ خوبصورت مکان تعمیر کرواتا۔ اس کو لاش نہ بننے دیتا ....

پیچھے سے کسی نے زور کا ہارن بجایا میں چونکا۔ میرے آگے کی سب گاڑیاں جا چکی تھیں۔ جلدی جلدی گاڑی اسٹارٹ کی اور چل پڑا۔ وہ زمین اب قریب آ رہی تھی ـــ وسندھرا۔ پارک ... تین جانب سڑکیں .... نکڑ ....

..... ارے یہ کیا .... مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ اُس زمین پر اچھی خاصی بھیڑ تھی۔ ایک طرف پان کا کھوکھا رکھا تھا ایک طرف ڈھابا۔ تیسری طرف شراب کا ٹھیکا ـــ ارے یہ سب اتنی جلدی ـــ میں ٹھگا ٹھگا سا گاڑی میں بیٹھا تھا ـــ اپنی کوئی قیمتی چیز کے چوری ہو جانے کا احساس ہوا ـــ ایک پسند کی زمین تھی وہ بھی گئی ـــ بڑی ہمت کر کے باہر نکلا معلوم کیا یہ سب کس کا ہے۔

ایک لمبا تڑنگا آدمی تھا جو اس سب کا ٹھیکیدار تھا۔

"کہئے صاحب کیا سیوا کروں" ـــ اوہ .... ہاں .... میں چونکا۔ "بولئے صاحب کیا سیوا کروں چائے پان دارو ....."

"نہیں یہ بتاؤ تم نے یہ زمین کیسے لی۔"

"ارے صاحب. اب آپ سے کیا چھپانا. آپ تو پڑھے لکھے بھلے آدمی معلوم ہوتے ہیں. سرکار بدلی، اپنا آدمی منتری بن گیا. میں نے اس کا پٹہ کروالیا. برسوں سے خالی پڑی تھی. پہلے سوچا تھا نرسری لگواؤں گا معلوم ہوا، بنجر ہے، اس میں کچھ پیدا نہیں ہو سکتا. تو یہ ٹھیکا لے لیا. کچھ تو کرنا ہی تھا.

نہ دل کو ٹھیس لگی نہ افسوس ہوا نہ پسینہ آیا نہ حلق خشک ہوا. بہت اطمینان سے میں نے سگریٹ سلگائی اور واپس گاڑی میں آ بیٹھا. چلنے سے پہلے آخری بار اس طرف نظر ڈالی . . . . یہ زمین اسی لائق تھی کہ یہاں پان کا کھوکھا لگ جائے لوگ پان کھائیں اور اس پر پیک تھوکیں. یہ اسی قابل تھی کہ یہاں شراب کی بھٹی لگ جائے. شرابی آئیں شراب پئیں گالیاں بکیں اور اس پر قئے کر کے واپس چلے جائیں. یہ شاید اسی لیے تھی کہ یہاں ڈھابا کھل جائے اور جھوٹن چاٹنے کے لیے کتے ایک دوسرے کو بھنبھوڑ کھائیں —— یہ تھی ہی بازارو.

باقی — مردہ لوتھڑے کی حرکت صفحہ ۱۰۰

پھوپھوی کے علاقے سے سیلپ کرنے والا آسیب سمنی پور سے آگے بڑھ چکا ہے اور قصائی کہتا ہے کہ "میرے جانور کے گوشت کا جو لوتھڑا دھڑک رہا ہے گویا ابھی اس میں جان باقی ہے"، اور میں سوچتا ہوں کہ دلّی ہندوستان کا دل ہے، اس کی دھڑکن تو پورا ہندوستان محسوس کرتا ہے.

جھٹپٹے اور دھند میں صورتِ حال کا صحیح اندازہ تو بہت مشکل ہوتا ہے مگر اتنا واضح ہے کہ مُوروں کے ہاتھوں شکست کھانے کے احساس نے عیسائیوں کو زخمی سُور کی طرح غضب ناک بنا دیا تھا. اسی زمانے میں اندلس اور اس کے گرد و نواح میں ولی یعقوب کی زیارت گاہ کا بڑا چرچا ہوا اور اس یادگار کو نمایاں اور مشہور کرنے میں برگنڈی کے فرانیسی راہبوں نے بہت اہم کردار ادا کیا.

اور ٹھیک اسی وقت نہ جانے کن دھندلکوں سے نکل کر مجذوب میرے سامنے آن کھڑا ہوتا ہے، کچھ دیر مجھے غضب ناک نگاہوں سے دیکھتا رہتا ہے پھر میری شرٹ کا کالر پکڑ کر کھینچتا ہوا مجھے ہوٹل سے باہر لاتا ہے. اور سڑک پر پٹخ دیتا ہے اور چیخنے لگتا ہے . . . . "

"یہی جگہ ہے تیری . . . . یہی جگہ ہے تیری!"

میں کھلے آسمان کے نیچے آ چکا ہوں، سوال انتظار اور اداسی کے بوائلنگ فرنیس پر بیٹھے وجود کا درد محسوس کر رہا ہوں اور چاہتا ہوں کہ دو کانوں میں کتابوں کا سٹ بدل جائے!

مگر میرے چاہنے سے کیا ہوتا ہے؟

سچے صاحب! یہ قصائی اور گدّی نشین.!

سچے سائیں!، یہ دوکان اور سوئی والان!

سچے باشا: الفانسو ہم سے محراب و منبر کا تقاضہ کر رہا ہے. !!!

جرم وسزا

مسونہ المصباحی
ترجمہ: زبیر احمد فاروقی

میرے لیے روزانہ جو مشکل ترین کام ہوتا تھا وہ تھا پانچ منزل تک سیڑھیاں چڑھنا اور وہاں سے اترنا۔ ایسا کرتے وقت ہمیشہ میرے حلق میں کانٹے چبھتے ہوئے محسوس ہونے لگتے، جسم پر رعشہ طاری ہوجاتا، پیر بوجھل سے لگنے لگتے اور میں سر د پسینے میں شرابور ہوجاتا۔ میرے دل کی دھڑکن اس قدر تیز ہوجاتی کہ جب تک میں سیڑھیاں چڑھتا یا اترتا، مجھے دوسری کوئی اور آواز سنائی نہیں دیتی، اور میری یہ حالت اس وقت تک باقی رہتی تھی جب تک کہ میں اس عمارت سے کافی دور جاکر لوگوں کی بھیڑ میں گم نہ ہوجاؤں، اس وقت میں خوشی سے ناچنے لگتا اور کامیابی کے نشے کے احساس سے عجیب وغریب حرکتیں کرنے لگتا جو گزرنے والوں کو اپنی طرف متوجہ کرلیتی تھیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ میرے لیے ایک بہت پیچیدہ مسئلہ تھا جو گھنٹوں تک میرے ذہن پر چھایا رہتا اور میں اس کی گرفت سے اس وقت تک اپنے آپ کو آزاد نہیں کرپاتا تھا جب تک کہ میں کسی کلچر کو سننے یا کسی کتاب کو پڑھنے میں مصروف نہ ہوجاؤں یا لنچ اور ڈنر کے وقت لمبی قطاروں میں کھڑا نہ ہوجاؤں۔ مجھے نہیں معلوم میرا یہ عذاب کب ختم ہوگا، بلکہ مجھے لگتا کہ یہ کبھی ختم نہیں ہوگا.... عذاب کا یہ طویل اور بے رحم صحرا جس کی انتہا صرف موت ہے۔ میں نے کتنی ہی دفعہ اس صحرا سے نکلنے کی کوشش کی لیکن ہمیشہ ناکام رہا۔ جن لوگوں کو میں جانتا ہوں اور جن کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا ہوں ان میں سے کوئی بھی میری حالت سمجھنے یا میری مدد کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ جس وقت میں انہیں مصیبت کی داستان سناتا ہوں وہ میری طرف حقارت آمیز بے نیازی کے ساتھ دیکھتے ہیں اور جب بھی میں اس مسئلے کی تفصیل بیان کرنے کی کوشش کرتا ہوں وہ مجھ سے فرار اختیار کرتے ہیں۔ مجھے معلوم ہے ان کے بھی اپنے مسائل ہیں.... کسی کو مکان کا مسئلہ درپیش ہے تو کسی کو تعلیم کا مسئلہ اور کوئی عشق کی مشکلات کا شکار ہے، لیکن میں سوچتا ہوں کہ جس طرح کی مشکل کا سامنا مجھکو ہے وہ کسی اور کو نہیں۔ میرے سامنے اس مصیبت کا صرف ایک ہی حل ہے جو بظاہر آسان ہے لیکن حقیقت میں بہت مشکل دراصل یہ ہے کہ میں اس گھناؤنے کمرے کو جو عمارت کی چھت پر واقع ہے چھوڑ کر کہیں اور چلا جاؤں، لیکن سوال یہ ہے کہ کہاں جاؤں؟ اس شہر میں میرے رہنے کے لیے یا تو یہ کمرہ ہے یا پھر سڑک۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ اس کمرے میں سونے کے مقابلہ میں میرے لیے سڑک پر سونا زیادہ آسان ہے۔ لیکن ان اوقات میں جبکہ پولس کی طرف سے بہت زیادہ پکڑ دھکڑ اور سختی کی جارہی ہے اس خوبصورت خیال کو عملی جامہ پہنانا آسان کام نہیں ہے۔ میرے ایک دوست نے ایک دفعہ ایسا ہی کیا تھا تو اسے پولس نے گرفتار کرکے ایک ہفتہ تک ایک ایسی تاریک کوٹھری میں رکھا جو چوہے، کھٹمل، پسّو اور غلاظت سے بھری ہوئی تھی، ایک ہفتہ تک نہ اس نے کوئی انسانی شکل دیکھی اور نہ ہی اسے کسی نے دیکھا۔ اس کوٹھری سے نکالے جانے کے بعد پورے ایک ماہ تک وہ حیات وموت کی کشمکش میں مبتلا رہا۔ اپنے دوست کے اس انجام کے بارے میں سوچ سوچ کر میرے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں اور اسٹیشن کے پلیٹ فارم یا کسی خاموش میدان میں یا چاندنی کی آغوش میں کسی پرسکون باغیچہ میں سونے کا خیال میرے ذہن سے کافور ہوجاتا ہے۔ پھر میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اگر میں ان کے ہاتھ آگیا تو وہ میرے دوست کے مقابلے میں مجھے کئی گنا زیادہ سزا دیں گے

ہوسکتا ہے وہ مجھے کسی گڈھے میں پھینک کر بھول جائیں یہاں تک کہ میں جوؤں اور پسوؤں کے درمیان گل سڑ جاؤں مجھے معلوم ہے کہ وہ دوسروں کے مقابلہ میں مجھے زیادہ قابل نفرت سمجھتے ہیں۔ ان کے پاس میرے خلاف ایک لمبی چوڑی فائل ہے جس میں میرے بارے میں پیدائش سے لے کر مظاہرے کے دوران میری گرفتاری تک کی تمام تفصیلات کا ریکارڈ محفوظ ہے۔

دراصل میں گذشتہ تمام مظاہروں کی طرح اس مظاہرے میں بھی شریک نہیں ہونا چاہتا تھا، اور وقتاً فوقتاً "ہمارے" تنظیم کے ممبران جو جلسے منعقد کرتے تھے میں ان میں صرف نعرہ بازی کی حد تک شریک ہوتا تھا اور جب وہ غیظ اور جوش کے جذبات کے ساتھ سڑکوں پر نکل آتے جہاں پولس ہوتی، آنسو گیس کے گولے ہوتے اور نیم فوجی دستے ہوتے تو میں چپکے سے کسی دور اور پرسکون مقام کی طرف کھسک جاتا، اور حالات کے نارمل ہونے تک وہیں رکا رہتا لیکن وہ دن میری بدبختی کا دن تھا جب میں نہایت جوش کے ساتھ "زندہ باد ۔۔۔۔ مردہ باد ۔۔۔ روٹی اور انصاف" کے نعرے لگا رہا تھا۔ اچانک ایک طالب علم تیزی سے میری طرف بڑھا اور زور زور سے چلا کر کہنے لگا "تم خائن ہو، تم بزدل ہو"، پھر وہ مارچ کے مہینہ کی کمزور دھوپ میں کھڑی ہوئی بھیڑ کو بتانے لگا کہ میں مظاہرہ سے کس طرح بھاگ کر ایک خاص جگہ چھپ جاتا ہوں اس کے دلائل نے مجھے اس درجہ لاجواب کر دیا کہ میں اپنے دفاع میں منھ سے ایک لفظ بھی نہ نکال سکا۔ میرا جوش فوراً ٹھنڈا پڑ گیا، حلق میں کانٹے چبھنے لگے، چہرہ خوف سے زرد پڑ گیا۔ ان تکلیف دہ لمحوں میں مجھے یہ احساس ہونے لگا کہ میں اس زمین پر سب سے زیادہ قابل نفرت انسان ہوں اور دنیا میں کوئی ایسی جگہ نہیں ہے جو مجھ جیسے ڈرپوک اور ذلیل شخص کو برداشت کر سکے۔ میرا جسم کانپ رہا تھا جل رہا تھا، لوگوں کی آنکھیں مجھے غضب ناک اور نفرت آمیز انداز میں گھور رہی تھیں۔ جس وقت اس ملعون نے اپنی مفصل اور مدلل تقریر ختم کی کچھ لوگ انتقام کے ارادے سے مٹھیاں بھینچے ہوئے میری طرف تیزی سے بڑھے لیکن ان کا ایک بااثر اور محترم لیڈر میرے اور ان کے درمیان حائل ہو گیا اور چلا کر بولا "اسے خود اپنا محاسبہ کرنے کا ایک موقع دو، مجھے یقین ہے وہ ٹھیک ہو جائے گا"، اس طرح وہ لوگ ہیجانی حالت میں مجھ سے الگ ہو گئے اور انہوں نے مجھے میری خیانت اور رسوائی کے ساتھ تنہا چھوڑ دیا۔ میں نے سوچا مجھے تھوڑی دیر کے لیے باتھ روم جا کر اپنا توازن درست کر لینا چاہیے۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا اور آدھے گھنٹہ کے بعد میں بھی مظاہرین کی اگلی صفوں میں شامل ہو گیا اور نہایت جوش و خروش کے ساتھ اپنے ہاتھوں کو ہوا میں لہرا کر "زندہ باد ۔۔۔۔ مردہ باد ۔۔۔۔ آزادی روٹی ۔۔۔۔" کے نعرے بلند کرنے لگا۔ آہستہ آہستہ میرے جسم میں ایک برقی قوت سرایت کرنے لگی اور میں نے اپنے اندر ایک عظیم طاقت محسوس کی جو مجھ سے اس بوجھل اور کدورت آمیز احساس کو دور کرنے لگی جو ان لوگوں کی غضب ناک اور تمسخر آمیز نگاہوں نے میرے اندر پیدا کر دیا تھا جب کہ وہ ملعون طالب علم لوگوں کے سامنے میری خیانتیں گنوا رہا تھا، اس طرح میں اپنے گردوپیش کو بھول کر ایک ایسی آواز میں تبدیل ہو گیا جس میں دنیا کے تمام مظلوم لوگوں کا غیظ و غضب سمٹ آیا ہو۔ اچانک جس طرح کسی شکاری کو دیکھ کر پرندوں میں کھلبلی مچ جاتی ہے مظاہرین کی صفوں میں بھی ابتری پیدا ہو گئی۔ کوئی ادھر بھاگ رہا ہے تو کوئی ادھر، لوگ ایک دوسرے میں گڈمڈ ہوتے جا رہے تھے، ان کی چیخیں فضا میں بلند ہو رہی تھیں۔ میرے سامنے ایک نیم عریاں نوجوان عورت زمین پر ڈھیر تھی تمام بینرز ہاتھوں سے چھوٹ کر نیچے گر چکے تھے اور بھاگتے ہوئے لوگوں کے قدم ان کے ساتھ ساتھ انقلابی لیڈروں اور شہیدوں کی تصویروں کو روند رہے تھے۔ حیرت اور بدحواسی کے ان ہی لمحات میں میرا سر کسی اور سر سے

ٹکرایا چوٹ کی شدت سے مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں غش کھا کر نیچے گر جاؤں گا۔ میں ابھی اپنے توازن کو برقرار رکھنے کی کوشش میں مصروف ہی تھا کہ اچانک فضا میں چند دھماکے ہوئے اور چاروں طرف دھواں پھیل گیا اور میرے اردگرد تاریکی شدید ہوگئی۔ میں شیطان، مظاہرے اور آئیڈیالوجی پر لعن طعن کرتا ہوا اپنا راستہ تلاش کرنے لگا۔ اس دوران میں نے اپنے قریب سے آتی ہوئی ایک چیخ اور جسموں کے زمین پر گھسٹنے اور بھاری بھاری بوٹوں کی آوازیں سنیں۔ میں دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپائے ہوئے پیچھے کی طرف پلٹا۔ اسی لمحے میں نے اپنے جسم پر ایک مضبوط ہاتھ کی گرفت محسوس کی جو مجھے بے رحمی کے ساتھ جھنجھوڑ رہا تھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے ابھی میرے جسم کے تمام جوڑ الگ ہو جائیں گے، پھر ایک لاٹھی میرے سر پر پڑی اور میں زمین پر ڈھیر ہوگیا۔ میرے ذہن میں اس طالبہ کا سرخ اسکرٹ ستارے کی طرح چمکتا ہوا محسوس ہوا۔

جب میں نے آنکھیں کھولیں تو اپنے آپ کو ایک کمرے میں پایا جو بالکل خالی تھا۔ اس کی سرمئی دیواروں پر جا بجا خون کے دھبے تھے، کمرے میں پھیلی ہوئی بدبو کسی مذبح کی بدبو سے ملتی جلتی تھی۔ میرے چاروں طرف، چھ، آٹھ یا دس آدمی بیٹھے ہوئے تھے، مجھے ان کی صحیح تعداد یاد نہیں۔ وہ میری طرف ایسی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے جیسے میں کوئی کیڑا ہوں جسے زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں، میں خوف سے ان کے بڑے بڑے سروں، ان کے پھولے ہوئے چہروں اور بھاری بھرکم بوٹوں کو دیکھ رہا تھا۔ میرا سر درد کی شدت سے اس قدر تیزی سے چکرا رہا تھا جیسے پنکھا پوری رفتار سے چل رہا ہو۔ اچانک وہ غصے سے پھٹ پڑے، دانتوں کو بھینچ کر اور بغیر کسی سوال وجواب کے مجھے اپنے پیروں سے ٹھوکر مارنے لگے۔ وہ چلا رہے تھے، گالیاں بک رہے تھے جن کا نشانہ میری ماں جس نے مجھے جنم دیا، میرے والد جنہوں نے میری تربیت کی اور تمام اساتذہ جنہوں نے مجھے تعلیم دی بغیر کسی انتشار کے سبھی تھے وہ اس کام میں مصروف ہی تھے کہ مجھ پر دوبارہ بے ہوشی طاری ہوگئی، جب مجھے ہوش آیا تو محسوس ہوا کہ اب اس کمرے میں پھیلی ہوئی بدبو اور شدید ہوگئی ہے۔ اور میرا جسم زخموں اور چوٹوں سے چور چور ہے۔ میرے چاروں طرف پُر اسرار قسم کی نقل وحرکت کا ماحول تھا، ایک طرف کچھ ڈانٹنے ڈپٹنے والی آوازیں، کچھ گالیاں، کچھ احکامات اور دوسری طرف درد سے بھری ہوئی چیخیں اور رحم کی بھیک مانگنے والی صدائیں تھیں۔ ان دونوں طرح کی آوازوں کے درمیان کبھی کبھی ایک نوجوان عورت کی سسکیاں سنائی دیتی تھیں جو مجھے اس سرخ اسکرٹ والی لڑکی کی یاد دلاتی تھیں جو مظاہرہ کے دوران میرے سامنے گر رہی تھی۔ کچھ لوگ درشت آواز میں چیخ رہے تھے اور ماں بہن کی گالیاں دے کر محظوظ ہو رہے تھے۔ پھر اچانک دوبارہ وہ لوگ مجھ پر ٹوٹ پڑے اور کچھ کہے بغیر میرے چاروں طرف حلقہ بنا کر مجھے اپنے جوتوں سے اس طرح مارنے لگے جیسے میں بوسیدہ چیتھڑوں کی گیند ہوں۔ میں ایک ناقابل بیان درد سے رو رہا ہوں، ان سے رحم کی فریاد کر رہا ہوں۔ خدا اور رسول اور اولیائے صالحین کی قسمیں کھا کر انہیں یقین دلانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ آئندہ میں کسی مظاہرہ میں حصہ نہیں لوں گا، مجھے تو ان حرامی لڑکوں نے ورغلایا تھا۔ میں تو ایک غریب ومسکین آدمی ہوں اور اپنی ماں کی واحد امید ہوں میں دل، معدہ، بواسیر، کی بیماری میں مبتلا ہوں، لیکن میری باتوں سے ان کا دل ذرا بھی نہیں پسیجا، بلکہ مجھے ایسا لگا کہ میری آہ وزاری اور فریاد سے ان کی بے رحمی غیظ وعصبیت اور اضافہ ہوگیا۔ جب وہ مجھے مارتے مارتے تھک گئے تو گھسیٹ کر ایک تنگ کمرے میں لے گئے اور مجھے ایک میز کے سامنے پھینک دیا جس کے پیچھے ایک ادھیڑ عمر کا گول مول چہرہ اور جسم والا شخص بیٹھا تھا۔ اس نے میری طرف غصے سے دیکھتے ہوئے میرے جائے پیدائش اور خاندان

کے بارے میں سوالوں کی بوچھار کر دی۔ جب میں نے اسے بتایا کہ میرا تعلق "العلاء" نامی قریہ سے ہے تو وہ میری طرف اس طرح دیکھنے لگا جیسے وہ عجیب وغریب جانور کو پہلی مرتبہ دیکھ رہا ہو، پھر وہ ہاتھ پر ہاتھ مارتا ہوا انتہائی غرور کے ساتھ بڑے کمرے کی طرف تیزی سے گیا اور چلا کر کہنے لگا، "لوگو آؤ دیکھو العلاء قریہ کا یہ آدمی لیڈر بننا چاہتا ہے"۔ پھر دوبارہ وہ لوگ کمرے میں آئے اور میرے چاروں طرف کھڑے ہو کر اپنی زبانوں سے ہونٹوں سے چاٹتے ہوئے تمسخر آمیز قہقہہ لگانے لگے۔ اس لمحے مجھے محسوس ہوا کہ میں نے بہت عظیم غلطی کی ہے۔ میرے ذہن میں میرے دور دراز اور بدحال گاؤں کا نقشہ ابھر آیا۔ وہی اونچی نیچی پہاڑیاں، وہی غبار آلود آندھیاں.... وہی پاگل عورت عائشہ جو اس کو تنگ کرنے والے لڑکوں کے چہروں پر ریت اڑاتی ہے.... وہی زخمی پشت والے گدھے جو اگست کی شدید دھوپ میں اونگھتے رہتے ہیں،.... بدوؤں کے تھکے ہوئے رنجیدہ قافلے جو شمال کی سمت گامزن ہیں۔ وہ لوگ اسی طرح میرا مذاق اڑاتے ہوئے میرے چاروں طرف گھومتے رہے، پھر دوبارہ مجھ پر ٹوٹ پڑے اور ایک بار پھر میں نے اپنے آپ کو اسی مٹیالے رنگ کی خالی کوٹھری میں پایا۔ جو مذبوحہ جانوروں کی بدبو میں بسی ہوئی تھی۔ وہ لوگ مجھے ٹھوکروں سے مارتے رہے یہاں تک کہ میرے ذہن میں اس جوان لڑکی کی سرخ اسکرٹ ابھری جو مظاہرہ کے دوران میرے سامنے گری تھی۔ اس کے بعد مجھے ایسا لگا جیسے وہ ملعون طالب علم کا منھ کھلا جو غضبناک اور مذاق اڑاتی ہوئی نگاہوں کے سامنے میری خیانتیں گنوا رہا تھا۔۔۔ اچانک وہ منھ کشادہ ہونا شروع ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک گہرے غار میں تبدیل ہو گیا جس نے مجھے پوری قوت کے ساتھ اپنی طرف کھینچا اور میں اوندھے منھ اس غار میں گر گیا۔

وہ ٹائپ کرتے کرتے رُک گیا، چشمہ میز پر رکھا اور چیخ کر بولا، تو پھر اے بدمعاش تو کس کے لیے مظاہرہ کر رہا تھا

پورے ایک ماہ تک میں اسی حالت میں رہا۔ روز و شب، چیخوں، گالیوں، رحم کی درخواستوں اور ٹائپنگ مشینوں کی آوازوں کے درمیان ضرب و ستم کی مقررہ خوراک مجھے برابر ملتی رہی۔ وہی گول مول آدمی مجھ سے میرے بچپن، میرے خاندان اور ان کتابوں کے بارے میں جو میں نے پڑھی ہیں سینکڑوں سوالات پوچھتا رہا۔ ایک دفعہ اس نے مجھ سے میری آئیڈیالوجی کے بارے میں سوال کیا، اور جب میں نے بتایا کہ میری کوئی آئیڈیالوجی نہیں تو وہ ٹائپ کرتے کرتے رک گیا۔ چشمہ میز پر رکھا اور چیخ کر بولا، "تو پھر اے بدمعاش تو کس کے لیے مظاہرہ کر رہا تھا"؟

"جناب جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا، ان لوگوں نے مجھے ورغلایا تھا"

"جھوٹے، کمینے، ذلیل، حقیر"

یہ کہہ کر وہ تیزی سے غضب ناک حالت میں کمرے سے باہر نکلا اور زور زور سے ان لوگوں کو آواز دینے لگا۔

"لوگو آؤ، دیکھو یہ کہتا ہے کہ اس کی کوئی آئیڈیالوجی نہیں"

وہ لوگ پھر میرے چاروں طرف جمع ہو گئے۔ ان کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں اور وہ مذاق اڑاتے ہوئے کہہ رہے تھے "اچھا تو تمہاری کوئی آئیڈیالوجی نہیں ہے"

"بخدا میری کوئی آئیڈیالوجی نہیں ہے، میں تو ایک غریب اور بے قصور انسان ہوں"

میری آواز بھرا رہی تھی اور میرے ہونٹ کانپ رہے تھے، میں رونے کے قریب تھا۔

(قہقہے) "اچھا تو تمہارا تعلق انتشار پسند تنظیم سے ہے"

"کون سی انتشار پسند تنظیم"۔۔۔۔۔ میں نے سہمی ہوئی آواز میں پوچھا۔

وہ میرے ارد گرد چکر کاٹنے سے رک گئے اور میں ان کے درمیان ایک حقیر و ذلیل مخلوق کی طرح بیٹھا رہا۔ اچانک ان کے پیچھے سے وہ گول مول آدمی چلایا۔ "اسے پکڑ لو"

درحقیقت میں نے ان سے جھوٹ نہیں کہا تھا کہ میری کوئی آئیڈیالوجی نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ میں کسی وقت بعض نظریات اور ideologies کی طرف مائل تھا لیکن میں ان سے اس حد تک مطمئن نہیں ہوا کہ میرے چہرے پر بھی اس طرح کے جوشیلے جذبات منعکس ہوں جو میں طلبہ کے بعض لیڈروں کے چہروں پر دیکھتا ہوں۔ وقت گذرنے اور مصائب کی بڑھتی ہوئی شدت کے ساتھ ساتھ مجھے یقین ہوتا گیا کہ میں اس دنیا میں تنہا ہوں اور ان میں سے کوئی بھی نظریہ یا آئیڈیالوجی میرے اندر امید کی ایک کرن بھی پیدا نہیں کر سکتی۔ اس طرح میں ایک مایوس وجود میں تبدیل ہو گیا، جو ہر شئے کی اصل حقیقت کا مذاق اڑاتا ہے۔ میں صرف اپنی تعلیم مکمل کرنا چاہتا تھا۔ جس کی مدت مقررہ وقت سے زیادہ لمبی ہو گئی تھی۔ میرے والد ایک طویل عرصے تک انتظار کرنے کے بعد اس عالم فانی سے رخصت ہو گئے۔ وہ ہمیشہ لوگوں کے سامنے فخر سے میرا تذکرہ کیا کرتے تھے۔ اور لوگوں کو راستے میں روک روک کر ان سے میری ذہانت اور غیر معمولی صلاحیتوں کے قصے بیان کرتے تھے۔ لیکن جب انہیں محسوس ہوا کہ میری تعلیم کی مدت لمبی ہوتی جا رہی ہے اور میرا جوش روز بروز سرد پڑتا جا رہا ہے تو وہ بجھ سے گئے۔ ان کے چہرے کی رنگت زرد پڑ گئی اور ایک روز بازار جاتے ہوئے راستے میں گر پڑے۔ اس حادثہ سے چند ہفتے قبل انہوں نے میری طرف دیر تک غور سے دیکھنے کے بعد کہا تھا۔۔۔ "میرے بچے لگتا ہے شہر نے تمہیں خراب کر دیا ہے"۔ اور آج جبکہ میں یہاں غبار اور مکھیوں کے درمیان بیٹھا ہوں میری ماں میرا انتظار کر رہی ہوگی۔ میں اس منحوس تعلیم کو جلد از جلد ختم کرنا چاہتا ہوں تاکہ کوئی کام کر کے اسے تھوڑا آرام پہونچا سکوں، لیکن ہر حال میں میرے سامنے نئی نئی مصیبتیں اور مشکلات کھڑی ہو جاتی ہیں جن کی وجہ سے میں امتحان کے لئے تیاری نہیں کر پاتا۔ میں اس عمارت کی مالکہ بوڑھی عورت کھوسٹ عورت سے کتنی بار گڑگڑا کر درخواست کر چکا ہوں کہ وہ مجھے اس غلیظ کمرے میں صرف تین ماہ کے لیے اور ٹھہرنے دے تاکہ میں اپنا فائنل امتحان مکمل کر سکوں، لیکن وہ غصے سے لال پیلی ہو جاتی ہے اور چلا کر کہتی ہے کہ میں ایک ہفتے کے اندر اندر وہ کمرہ خالی کر دوں ورنہ وہ پولس کی مدد حاصل کرنے پر مجبور ہو جائے گی۔ پولس کا نام سنتے ہی میری آنکھوں کے سامنے وہی کوٹھری آجاتی ہے جس میں مذبوحہ جانوروں کی بدبو بسی ہوئی ہے وہی خون سے ملوث دیواریں، وہی خوف ناک چہرے جو میرے چاروں طرف حلقہ بنا کر بھیانک طور پر ہنستے تھے۔ وہی گول مول آدمی، وہی ٹائپ مشینوں کی آوازیں، وہی ان لوگوں کے سوالات اور ان کی مغلظات گالیاں۔۔۔ وہی لال اسکرٹ والی نوجوان لڑکی کی سسکیاں۔۔۔۔ یا الہی میں ہرگز ہرگز دوبارہ اس کوٹھری میں نہیں جا سکتا لیکن آخر جاؤں بھی تو کہاں؟ اس چھت والے کمرے کے علاوہ اس وسیع و عریض شہر میں میرا اور کوئی ٹھکانہ بھی تو نہیں ہے اور اس کے باوجود وہ کھوسٹ بڑھیا مجھے وہاں سے جلد از جلد دھکا دینے پر ہے، یہاں تک کہ میرے گرم گرم آنسو بھی اس کے دل کو پگھلانے میں ناکام رہے۔ وہ عمر کی آخری منزل میں ہونے کے باوجود بھی دنیا اور مال سے بری طرح چمٹی ہوئی ہے اور مجھے اس بدبودار کمرے سے صرف ایک ہفتہ کے اندر اندر نکال دینا

چاہتی ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ کئی عمارتوں اور زراعتی فارموں کی مالک ہے اور بے اولاد ہے۔ اے کاش وہ مجھ کو اپنا بیٹا بنا لیتی تو یہ میرا سارا عذاب ختم ہو جاتا۔ لیکن وہ مجھ سے اس قدر نفرت کیوں کرتی ہے؟ حالانکہ وہ شروع میں مجھ پر مہربان تھی۔ مجھے دیکھ کر مسکراتی بھی تھی اور مجھ سے خیریت وغیرہ پوچھتی تھی۔ کبھی میری تعلیم کے بارے میں بھی دریافت کرتی۔ لیکن اچانک وہ مجھ سے چڑنے لگی اور میری طرف شک وشبہہ کی نظر سے دیکھنے لگی اور جب جب اس کی نگاہ مجھ پر پڑتی وہ میری طرف سے اپنا چہرہ پھیر لیتی یا جب بھی میں اس کو سلام کرتا وہ ناک چڑھا لیتی۔ آخر اس عجیب وغریب تبدیلی کا سبب کیا تھا؟ کیا کسی نے اپنی طرف سے کوئی کہانی گھڑ کر اسے میرے خلاف بھڑکا یا ہے؟ لیکن کسی کو ان باتوں سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟ وہ ایک تجسس میں رہنے والی بڑھیا ہے، اس نے یقیناً مجھے دروازے کے تالے کے سوراخ میں سے بستر پر اکیلے تڑپتے اور کانپتے ہوئے دیکھا ہے، اور اس طرح کی بوڑھی عورتیں ہمیشہ اس کوشش میں رہتی ہیں کہ اپنے آس پاس کے لوگوں کو اس بات کا یقین دلا دیں کہ وہ تائب ہو کر خدا کی اطاعت میں لگ گئی ہیں۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ مجھ جیسے شیطان کو خدا کی عطا کردہ عمارت جیسی نعمت کو ناپاک کرنے یا ایسے گناہ کا ارتکاب کرنے کی اجازت دیدے جو اسے خیر وبرکت سے محروم کر دے۔ کیا یہ بڑھیا میرے بارے میں سوچ رہی تھی کہ میں . . . .

اوہ! ہرگز نہیں، ہرگز نہیں۔ وہ ایک سوکھی ہوئی بے جان بڑھیا ہے جس کے منھ میں نہ دانت ہیں نہ پیٹ میں آنت، اب وہ صرف قبر کے قابل ہے۔ اس پر خدا کی لعنت ہو آخر اس کو مجھ پر رحم کیوں نہیں آتا؟ وہ سال کے آخر تک مجھے یہاں کیوں نہیں رہنے دیتی؟ میں اس پڑھائی کو جس کی مدت لمبی ہو گئی ہے ختم کرنا چاہتا ہوں۔ میں اب عمر رسیدہ دکھائی دینے لگا ہوں، میرے سر کے بال گرنے لگے ہیں، چہرے پر کان دانے نکل آئے ہیں اور آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے ہیں۔ کلاس کی ساری لڑکیاں مجھ سے دور بھاگتی ہیں اور ان میں سے کوئی بھی میرے پاس بیٹھنا یا مجھ سے بات کرنا پسند نہیں کرتی۔ ایک طرف میں عمر رسیدہ ہوتا جا رہا ہوں اور دوسری طرف یہ پڑھائی ہے جو کسی طرح مکمل ہونے کا نام ہی نہیں لیتی۔ کلاس کی کوئی بھی لڑکی مجھے دیکھ کر نہ تو مسکراتی ہے، نہ گفتگو کرتی ہے اور نہ ہنسی مذاق کرتی ہے، اور خود میں بھی کسی سے اچھی طرح گفتگو نہیں کر پاتا۔ جب بھی میں ان میں سے کسی سے بات کرنے کا ارادہ کرتا ہوں، میری زبان لڑکھڑانے لگتی ہے، اور دماغ پریشان ہو جاتا ہے۔ میں عمر رسیدہ لگنے لگا ہوں اور یہ کھوسٹ بڑھیا مجھے سڑک پر پھینک دینا چاہتی ہے۔ امتحانات سر پر آ چکے ہیں اور میں حیران ہوں کہ آخر کروں تو کیا کروں، ادھر میری ماں گردو غبار کے بیچ بیٹھی ہوئی اپنے نوجوان بیٹے کا انتظار کر رہی ہو گی جسے شہر نے خراب کر دیا ہے۔ آخر یہ بوڑھی کھوسٹ عورت سال کے آخر تک مجھ پر ترس کیوں نہیں کھا سکتی؟ کیا اس کے لیے دوسری عمارتیں اور کھیت جن کی وہ مالک ہے کافی نہیں؟ آخر اس کمرے کی اسے ایسی کیا ضرورت ہے جس میں صرف چوہے اور کیڑے مکوڑے ہی رہ سکتے ہیں وہ مجھے نکالنے پر بضد ہے اور مجھے ڈر ہے کہ اگر اس نے پولس کی مدد حاصل کر لی تو میں پھر اس جگہ پہونچ جاؤں گا اور وہ وحشی ٹولہ پھر میری فائل کھولے گا اور پھر میرے اردگرد وہ لوگ حلقہ بنا کر میرا مذاق اڑائیں گے۔ مگر مجھے اس کمرے میں مزید رہنے کے لیے کوئی نہ کوئی حیلہ اختیار کرنا چاہیئے صرف دو ہی مہینے کی تو بات ہے۔ اس کے بعد جو اس کے بعد جو ہونا ہو تا رہے، شہر آہستہ آہستہ خاموش ہوتا جا رہا ہے۔ پولس کی سیاہ گاڑیاں سڑکوں پر گشت کرنے لگی ہیں، اس کھوسٹ بڑھیا کے فلیٹ کی روشنیاں بجھ چکی ہیں۔ میں نے تقریباً نصف گھنٹے تک انتظار کیا۔ پھر عمارت کے دروازے کے پاس اپنے جوتے اتارے، اور دبے قدموں اپنی سانسوں کو روکے ہوئے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے میں اپنے کمرے تک پہونچا، میرے جسم پر رعشہ طاری ہے۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی حسب عادت میں نے روشنی بجھا دی

ہے اور بستر پر دراز ہوگیا ہوں، فوراً ہی مجھے لذیذ ترین راحت کا احساس ہوتا ہے۔ جس روز سے مجھے اس کھوسٹ بڑھیا نے ایک ہفتہ کے اندر اندر وہ کمرہ چھوڑ دینے کا حکم دیا ہے میرا روزانہ یہی معمول ہے کہ میں صبح اس کے بیدار ہو جانے کے قبل نکل جاتا ہوں اور اس وقت واپس آتا ہوں جب اس کے فلیٹ کی روشنیاں بجھ چکی ہوتی ہیں۔ لیکن مجھے کچھ نہ کچھ ضرور کرنا چاہیئے تاکہ سال کے یہ باقی دن گذر جائیں، ورنہ تقریباً امتحان میں دوبارہ ناکام ہو جاؤں گا اور میری مشکلات اور بڑھ جائیں گی۔ اس شہر میں پریشانیوں کا سلسلہ ناقابل برداشت ہو چکا ہے۔ تھکن کی شدت سے جلد ہی مجھے گہری نیند آجاتی لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد چیخنے چلانے اور گالیوں کی آواز سے میری آنکھ کھل جاتی ہے، میں گھبرا کر اٹھ بیٹھتا ہوں وہی کھوسٹ بڑھیا میرے آنکھوں کے سامنے کھڑی ہوئی لوہے کی ایک سلاخ ہلا ہلا کر چلا رہی ہے اور پولس بلانے کی دھمکی دے رہی ہے۔ میں جس قدر اس سے رحم کی بھیک مانگ رہا ہوں اور درخواست کر رہا ہوں کہ وہ مجھے سال کے آخر تک اس کمرے میں رہنے دے اس قدر وہ مشتعل اور بے رحم ہوتی جا رہی ہے۔ پھر میں نے اسے یہ کہتے ہوئے سنا کہ وہ پولس کو بلانے جا رہی ہے اور عین اسی لمحے مجھے محسوس ہوا کہ میں ایک ایسی مخلوق میں تبدیل ہوگیا ہوں جس کے یہاں رحم یا خوف جیسے الفاظ بے معنی ہیں، اچانک میرے ہاتھ اس کی گردن دبوچ لیتے ہیں۔ ہاتھوں کی گرفت لمحہ بہ لمحہ سخت ہوتی جا رہی ہے یہاں تک کہ اس کی زبان باہر آجاتی ہے، چہرہ زرد پڑ جاتا ہے اور جلی ہوئی مٹی کا رنگ اختیار کر لیتا ہے آنکھیں بارڈھ کی طرف ابل پڑتی ہیں اس لمحے اس کے ہونٹ پھڑ پھڑاتے ہیں اور میں محسوس کرتا ہوں گویا وہ مجھ سے رحم کی درخواست کر رہی ہے کہ میں اسے چھوڑ دوں تاکہ وہ اپنی عمر کے باقی دن پورے کر لے۔ لیکن میں اور سختی سے اس کا گلا دبانے لگتا ہوں یہاں تک کہ وہ میرے ہاتھوں کے درمیان بےجان ہو کر جھولنے لگتی ہے۔ پھر میں اس کو چھوڑ دیتا ہوں اور وہ سوکھے ہوئے لہسن کے جوے کی طرح زمین پر گر جاتی ہے اس کے بعد میں بستر پر بیٹھ کر اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے بارے میں سوچنے لگتا ہوں، میری آنکھیں کمرے میں کسی چیز کو تلاش کر رہی ہیں۔ اچانک میری نگاہ ایک بڑی سی کلہاڑی پر پڑتی ہے جسے نہ معلوم کس نے میری چھوٹی میز پر رکھ دیا تھا۔ میں اس کلہاڑی کو اٹھا لیتا ہوں اور ایک شدید اعصابی کیفیت میں اس کے جسم کے اس طرح ٹکڑے کرنے لگتا ہوں خون کا ایک قطرہ بھی فرش پر نہ گرے۔ اس پورے عرصے میں مجھے اپنے آپ پر شدید حیرت ہو رہی تھی کہ کس طرح میں اچانک ایک سفاک مخلوق میں تبدیل ہوگیا ہوں اور کس طرح بغیر کسی خوف اور تردد کے ایک انسانی جسم کو بوٹی بوٹی کر رہا ہوں۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد میں نے ہر چیز نائیلین کے ایک بڑے تھیلے میں رکھی اور آہستہ آہستہ پانچوں منزلوں کی سیڑھیاں طے کرتا ہوا نیچے اترا۔ عمارت کے دروازے پر پہونچ کر میری وحشت میں یہ دیکھ کر اور اضافہ ہوگیا کہ یہ وہ شہر ہے جسے میں جانتا پہچانتا تھا...... ایک مہیب وحشت آمیز سناٹا...... نہ پولس کی گاڑیاں، نہ روشنی، نہ ٹریفک، نہ زندگی کی کوئی اور نشانی، صرف سلیٹی رنگ کی گندی عمارتیں جو مدھم روشنی کے درمیان سر اٹھائے ہوئے کھڑی تھیں، ایک عجیب سی روشنی جو نہ دن کی اور نہ رات کی، میں نے سڑک کے کنارے نصب شدہ کوڑے دان میں وہ تھیلا ڈال دیا اور نہایت سکون و اطمینان کے ساتھ اپنے کمرے میں واپس آکر غسل کیا اور سگریٹ سلگا کر بستر کے اندر گھس گیا، اس وقت جو خوشی مجھے محسوس ہو رہی تھی اس کا مقابلہ کسی اور خوشی سے نہیں کیا جا سکتا۔ ابھی میں نیند کے پہلے ہی جھونکے میں تھا کہ ایک شور بلند ہوا، کوئی دروازہ شدت سے کھٹکھٹا رہا تھا، میں گھبرا کر بستر سے باہر کود پڑا۔ دن کی تیز روشنی میرے منھ پر طمانچے کی طرح محسوس ہوئی۔ میرے ذہن میں ایک ساتھ بہت سے سوالات ابھرے، میں کانپتے ہوئے قدموں کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازہ کھولتے ہی میں نے دیکھا کہ وہی کھوسٹ بڑھیا دو پولس والوں کے درمیان کھڑی ہے، وہ چیخ رہی ہے چلا رہی ہے اور دھمکیاں دے رہی ہے اسی روز میں نے اپنا جو کچھ سامان تھا سمیٹ کر پیٹھ پر رکھا اور اس شہر میں جہاں میرے لیے صرف خوف تھا، پولس تھی، بلا مقصد اور بلا امید حیران و پریشان پھرنے لگا۔

ذہن جدید

ترسیل

ادب، میڈیا اور "صدائے ختم شد"

دیویندر اسر

ذرا ان "وفاتیات" پر غور فرمائیے:

گذشتہ صدی میں نطشے نے خدا کی موت کا اعلان کیا اور اس صدی میں بریخت نے ایک اور ایسے کے گواہ ہونے کی اطلاع دی۔ انسان کی موت۔

قریب ۶۰ برس قبل (۱۹۳۶) میں ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے ناول کی موت کی خبر سنائی تھی۔ ایک دہائی کے ختم ہونے سے پہلے ہی ایڈمنڈ ولسن نے کہہ دیا۔ "نظم ایک مرتی ہوئی تکنیک" ہے۔ لیکن یہ پڑھ کر کچھ تسلی ہوئی کہ ایلیٹ نے ایک مخصوص قسم کی ناول کے خاتمے کا ہی ذکر کیا۔ یہ نہیں کہا کہ ادب کا خاتمہ ہوگیا ہے اور نہ ہی ولسن نے تمام شاعری کو مرتی ہوئی صنف کہا ہے۔ بلکہ یہ کہا کہ شاعری ہوتی رہے گی۔ لیکن روایتی طرز کی شاعری کا دور ختم ہوگیا ہے۔

لائنیل ٹرلنگ نے پانچویں دہائی میں ایک مضمون لکھا، عنوان تھا، ادب کا خاتمہ اور اعلان کیا کہ یہ دور قاری کا دور ہے۔ ایم۔ ایچ۔ ابرامس نے بھی ۱۹۷۸ میں جدید دور کو "قاری کا دور" قرار دیتے ہوئے کہا کہ اس حادثے کا اولین شکار ادیب ہے۔ ایک "ادارے" کی حیثیت سے ادیب مرچکا ہے۔ ساختیاتی تنقید STRUCTURALISM کے مفکر رولاں بارتھ نے بھی قریب قریب اس قول پر صاد کیا کہ ادیب کا ممتاز مقام مٹ چکا ہے اور اس کی انسپریشن کا سرچشمہ اب خشک ہوگیا ہے MICHEL FOUCAULT نے خبردار کیا کہ وقت آگیا ہے کہ ہم تنقید اور فلسفے کے لکھنے والوں کے خاتمے اور موت کو تسلیم کرلیں۔ کیونکہ قاری اب ہر انسانی احساس سے عاری ہوتا جارہا ہے ادب کی تخلیق کیسے ہوتی ہے؟ اس کا پیٹرن کیا ہے؟ اسے کیسے پڑھا جاتا ہے؟ اس کی قدر و اہمیت کیا ہے؟ ان سوالات کے بارے میں روایتی نظریات نابود ہونے کے عمل میں انسانی خصوصیات سے محروم ہونے کا بھی نظم عمل کارفرما ہے۔

بیسویں صدی کی آخری دہائی میں حالات اور بھی سنگین بیان کیے جاتے ہیں۔ چاروں اطراف سے یہ آواز سنائی دے رہی ہے کہ ادب یعنی الفاظ پر مبنی فکری پیٹرن کا پورا انظام ختم ہونے جارہا ہے یعنی ادب کا خاتمہ ہونے والا ہے ALVIN KERNAN نے ایک کتاب لکھی، عنوان اور موضوع تھا۔ ادب کی موت۔ کرنن نے صاف طور پر جس قاتل کی طرف اشارہ کیا وہ ہے POST MODERNISM یعنی گذشتہ تین دہائیوں سے جو صرفیاتی اور معاشرتی تبدیلیاں عمل میں آرہی ہیں وہ ادب کے لیے مہلک ثابت ہورہی ہیں۔ ڈینیل بیل کا مشہور مضمون نظریے کا خاتمہ اسی سلسلے کی اہم کڑی ہے۔ کچھ سال قبل FRANCIS FUKUYAMA نے اپنا تھیسس پیش کیا تواریخ کا خاتمہ۔ ترقی پسندی اشتمالیت کا دور ختم ہوا۔ جدیدیت کا گُسرا چھٹ رہا ہے، اور وجودیت کا مفاد خاتمہ پرستی اختتامیت ENDISM نے لے لیا ہے۔ کیا بیسویں صدی کی آخری دہائی "اختتامیت" کی دہائی کہلائے گی کیونکہ POST MODERNISM کے دور میں الیکٹرانک میڈیا نے ادب پر فوقیت حاصل کرلی ہے۔

اس بارے میں بحث ابھی جاری ہے۔ ادیبوں اور دانشوروں کی ایک طویل فہرست ہے اور پیشن گوئی

کرنے والے کسی نہ کسی صنف یا نظریے کی موت کا اعلان کر دیتے ہیں۔ ادب اور نظریے کے خاتمے کے بعد ٹکنالوجی کمپیوٹر، انفارمیشن ٹکنالوجی، الیکٹرانک میڈیا وغیرہ نے فکر اور تخلیق کی نئی جہتوں سے انسان کا جو سامنا کرایا ہے اور "نئی جرنلزم" نے ادب کو جو چیلنج پیش کیا ہے اس سے ادب کے مستقبل کے بارے میں فکر نو کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے۔ "نیو جرنلزم" نے اس بات پر زور دیا ہے کہ "دستاویزی بیانیہ" DOCUMENTARY NARATIVE ہی برق رفتار سے ہونے والے روزمرہ کے واقعات اور حقایق کی DYNAMICS اور مسائل سے پر پیچیدہ ذہن کی عکاسی کر سکتا ہے۔ یہ کہ "نان فکشن" ناول کا دور ہے۔ جسے کئی ناموں سے موسوم کیا گیا ہے FABULATION یا FABULOUS FICTION یا META FICTION وغیرہ

اب سوال محض ناول، افسانے یا روایتی شاعری کے خاتمے کا نہیں بلکہ ادب کے بے عمل اور خارج از بحث ہونے کا ہے "زبان" اور "پرنٹ" کے "متروک" ہونے کا ہے JACQUES DERDIDA نے DECONS TRUCTION کے اصول کے تحت اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ادبی تحریروں کی زبان سے مصنف کے تعصبات اور ان صداقتوں جن کا کہ وہ دعوے کرتے ہیں، کے کھوکھلے پن کو ظاہر کرتی ہے، اب بحث کا موضوع ادب میں ترسیل کی ناکامی نہیں بلکہ ادب کی TERMINAL صورت حال کا ہے۔ سوال یہ نہیں کہ عام لوگوں سے لے کر ELITE تک، ادبی کتابوں سے اوب محسوس کرنے لگے ہیں۔ بلکہ یہ ہے کہ خود ادیب جن کے وجود کی سند ہی ادبی تخلیق ہے ادب کے مستقبل کو شک کی نظر سے دیکھنے لگے ہیں۔ اور یہاں تک کہا جانے لگا ہے کہ ۲۰۰۰ کی ناول سلولائیڈ پر لکھی جائے گی۔ جب LESLIE A FIEDLER جیسا جدیدیت پرست اور ریڈیکل نقاد ایک مشہور فکری جریدے میں اپنے ایک مضمون کا آغاز ان الفاظ سے کرتا ہے کہ "اپنے ارد گرد نئی ناولوں کے ہجوم کا منظر میرے اندر یہ شدید خواہش پیدا کرتا ہے کہ میں کوئی فلم دیکھنے نکل جاؤں۔ یہ فلم میڈیم کتنا ممتاز اور مقبول بن گیا ہے" تو عام ادیبوں کا کیا حشر ہوگا۔

کیا مستقبل کا تصور اب احساس اور ادب کے مرگھٹ کی شکل میں ہی کیا جا سکتا ہے؟ کیا مستقبل میں ادب کی تصویر اتنی سیاہ اور سنگین ہے؟ کیا الیکٹرانک میڈیا اور نئی ترسیلی ٹکنالوجی ہی انسانوں کے مابین COMMUNICATION LOOP کا فریضہ سر انجام دے گی!

"فیوچر شاک" اور ادب کا مستقبل

۱۹۷۰ میں شایع اپنی کتاب "فیوچر شاک" میں جب الفریڈ ٹافلر نے یہ کہا کہ بیسویں صدی کے اواخر میں مستقبل سے انسان کا ایسا سامنا ہونے جا رہا ہے کہ اس کے صدمے سے اس کے ذہنی توازن کے بگڑ جانے کا خطرہ ہے تو لوگ چونکے۔ نئی اطلاعی اور ترسیلی ٹکنالوجی INFORMAtion/ COMMUNICATION کمپیوٹر، الیکٹرانک میڈیا، سیٹلائیٹ وغیرہ کے دور میں انسان کی حیثیت اور صورت حال کیا ہوگی؟ کیا اس کی خود مختاری، فکر و عمل کی آزادی، خودی اور تخلیقی قوت محفوظ رہ سکے گی۔ کیا اس کا ذہن اور جذبہ تغیر کے اس عمل میں ابلاغ و ترسیل کے نئے ذرائع سے ہم آہنگ ہو سکے گا؟ یا ان کی نئی اور نادر جہتیں جنم لیں گی۔ ان حالات میں ادبی جمالیاتی ترسیل کا ذریعہ کیا ہوگا؟ کتاب کا وجود بھی رہے گا یا نہیں؟ یا کتاب نابود ہو جائے گی۔ خواندگی تحریری

مطبوعہ الفاظ تک محدود رہے گی یا کمپیوٹر لٹریسی (COMPUTER LITRACY) اور امیج ریڈنگ (IMMAGE READING) میں بدل جائے گی۔ یہ سوالات اہم اور برمحل ہیں کیونکہ ادب کی ترسیل کا ذریعہ (مطبوعہ) کتاب ہے جبکہ الیکٹرانک میڈیا (ORAL) اور (IMAGE) کمیونی کیشن پر مبنی ہے جس کے باعث آنکھ کی پتلی کا دائرہ زیادہ پھیل رہا ہے اور کان کا پردہ زیادہ حساس ہو گیا ہے۔ اس لحاظ سے ترسیلی طور پر جدید انسان قبائلی انسان سے زیادہ قریب ہو رہا ہے۔

کمپیوٹر کتاب اور نئی خواندگی

سائنس کے مشہور مصنف (ISAAC ASIMOV) نے اپنی کتاب (I ROBOT) میں (ROBETICS) انقلاب کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انسانی ذہن کی تعمیر اور تشکیل اور ارتقا قریب ساڑھے تین سو کروڑ سالوں سے جاری ہے جبکہ کمپیوٹر کی عمر قریب ۵۰ برس ہے۔ انسانی ذہن اور کمپیوٹر کی تشکیل، ارتقا اور عمل میں اتنے اہم فرق ہیں کہ انہیں مساوی درجہ دینا صحیح نہیں۔ انسانی ذہن کا عملی مقصد ریاضیات کا کھیل نہیں بلکہ یہ ہے اور ہمیشہ سے ہے کہ وہ خلا اور احساس کا عمیق مطالعہ کرے، فلسفیانی طور پر سوچ وچار کرے۔ انسان اور کائنات ہیں بصیرت عطا کرے۔ تخیل کی اڑان بھرے۔ تخلیق حسن کرے۔ اپنے اردگرد کی دنیا سے نشاط و انبساط حاصل کرے اور حقایق کی از سر نو تشکیل کرے۔ اور ان حقایق کو آشکار کرے جن کا انسانی ذہن سے باہر کوئی وجود نہیں۔ جب ہم کمپیوٹر شاعری اور کمپیوٹر آرٹ کی بات کرتے ہیں تو ہمیں (ASIMOV) کی یہ بات یاد رکھنی ہوگی کہ خود انسان ہی کمپیوٹر پروگرامنگ کرتا ہے اور اپنے تجربے، فکر اور تخیل کی بنا پر بلیو پرنٹ تیار کرتا ہے۔ انسانی ذہن کے بغیر کمپیوٹر کا عمل بے معنی سفر بن کے رہ جاتا ہے۔ قریب ۶۰ برس قبل (LYBERNETICS) سے یہ امید بندھی تھی کہ انسانی ذہن کے اسرار سے ہمیشہ کے لیے پردہ اٹھنے والا ہے۔ بیشتر اس کے کمپیوٹر (LYBERNITICS) انسانی ذہن کی پرچھائیں تک بھی پہنچ سکیں۔ وہ ان سے کئی برسوں آگے نکل چکا ہوگا۔ کمپیوٹر انسانی ذہن کے تخلیقی عمل اور یادداشت کی قوت حاصل کرنے کی میکانکی کوشش ہے۔ اس میں شک نہیں کہ انسانی قوت یادداشت کے مقابلے میں کمپیوٹر (MEMORY) بہت سے دقیق مسائل کو حیرت انگیز رفتار سے حل کر لیتا ہے۔ لیکن عدم استعمال سے انسانی ذہن کی جو قوت مفلوج ہوتی ہے در حقیقت خطرہ اس سے ہے۔ کیونکہ اس سے فکر اور تخلیق کی قوت مضمحل ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ اگر تواریخ کا خاتمہ ممکن ہے تو یہ اس کا آغاز ہے۔ ادبی تخلیق میں انسانی یادداشت (NOSTALGIA) کا اہم اور کئی بار فیصلہ کن رول ہے میں مقناطیسی قوت اور کشش ہے۔ اگر انسان سے اس کی یادداشت چھن جائے تو ادب اور تواریخ کا خاتمہ ہو جائے گا اس خطرے نے اختتامیت، (ENDISM) کے نظریے کو مستحکم کیا ہے۔ تواریخی عمل کمپیوٹر گرافکس کے ذریعے نہیں بلکہ (PSYCHOGRAPHICS) کی زندہ قوت کے بل پر جاری رہتا ہے۔ اس امر کو سائنسدانوں اور مفکرین نے تسلیم کیا ہے کہ آج تک انسانی ذہن نے جو فہم و آگہی حاصل کی ہے اس کا سرچشمہ سائنسدانوں کے بجائے زیادہ تر ادیبوں اور مفکروں کی تحریریں ہیں۔

اطلاعی ٹکنالوجی اور معاشرہ اور الیکٹرانک میڈیا

حرفیاتی معاشرہ میں ادب عام لوگوں کے لیے زیادہ سے زیادہ تفریح یا تفنن طبع یا فرار کا ذریعہ ہے لیکن

جب ٹکنالوجی اور الیکٹرانک میڈیا انسان کو تفریح اور فرار کی پُش بٹن PUSH BUTTON اور فوری INSTANT سہولت مہیا کرادیں تو ان کے لیے ادب کا یہ رول بھی ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن اس محدود، رول کے باوجود کیا یہ پیشن گوئی صحیح ثابت ہوگی کہ ادب کا دور اب ختم ہو رہا ہے۔ موجودہ معاشرہ انسانی / تہذیبی اقدار کے بجائے واقعات اور اطلاعات پر مبنی ہے۔ اس میں ادبی کتابوں کی نہیں DATA BANK کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ جس میں ادب کی کرنسی رائج نہیں اور نہ ہی تخیل اور تخلیق کے لین دین کا چلن ہے۔

ENDLESS INVENTION, ENDLESS EXPERIMENT
BRINGS KNOWLEDGE OF MOTION, BUT NOT STILLNESS,
KNOWLEDGE OF SPEECH, BUT NOT OF SILENCE,
KNOWLEDGE OF WORDS, AND IGNORANCE OF THE WORD....
WHERE IS THE WISDOM WE HAVE LOST IN KNOWLEDGE
WHERE IS THE KNOWLEDGE WE HAVE LOST IN INFORMATION.
T.S. ELLIOT

جدید دور کے الیکٹرانک مسیحا MARSHALL McLAHAN نے مختلف النوع میڈیا کا گہرا اور جامع (اور بحث طلب) تجزیہ پیش کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا ہے کہ اگر ہم انسانی تواریخ کا مطالعہ کریں تو یہ بات صاف ہو جائے گی کہ انسانی فکر اور اظہار حرفیاتی جبریت سے متاثر ہوتے ہیں۔ کارل مارکس اور اس کے پیرو کار مادی اور معاشی جبریت کو تواریخ، معاشرے اور ہر انسانی فکر و عمل یہاں تک کہ ادب اور فن کا بھی محرک تسلیم کرتے ہیں۔ ادب میں نصف صدی سے زاید تک یہ نظریہ دنیا کے ایک بڑے حصّے کو مسحور کیئے رہا۔ جب اشتمالیت کی فصیلیں گرنے لگیں اور بت گرائے جانے لگے تو ٹکنالوجی کا عالمی تسلط قائم ہوگیا۔

جدید دور میں سماجی تبدیلی اور ارتقا میں نئے حرفیاتی نظام کا اہم رول رہا ہے۔ مارشل میک لوہان نے اپنی کتاب UNDERSTANDING MEDIA میں کہا ہے کہ سماج کو نئی شکل دینے میں فکر سے کہیں زیادہ ان میکانکی ذرایٔع کا ہاتھ ہوتا ہے جو فکر کی نشر و اشاعت کو ممکن بناتے ہیں۔ الیکٹرانک انفارمیشن ٹکنالوجی۔ ٹیلی گراف، ٹیلی فون ریڈیو، ٹیلی ویژن، فلم اور کمپیوٹر۔ ہماری تہذیب کو نئی شکل دے رہے ہیں۔ اس سے قبل پرنٹ میڈیم نے یہ اہم رول ادا کیا تھا GUTTENBERG GLAXO میں میک لوہان نے تواریخ کے ارتقا میں چار ادوار کو اہم قرار دیا ہے

۱. مکمل ORAL قبل از خواندگی کا قبیلیائی معاشرہ۔
۲. حرف ابجد، رسم الخط تحریر کا منظم نظام جو قریب دو ہزار برسوں تک رہا۔
۳. طباعت کا دور ۱۵۰۰ سے ۱۹۰۰ تک اور
۴. الیکٹرانک میڈیا دور۔ ۱۹۰۰ تا حال

جب طباعی ترسیل زبانی ترسیل پر حاوی ہوگئی تو کان کے بجائے آنکھ کو اولیت حاصل ہوگئی (یاد رہے کہ میک لوہان نے میڈیا کو انسان کی وسعت کہا ہے) جس کا باعث انسان کی ذات اور سماج میں انتشار کا عمل شروع ہوگیا۔ تحریری طبع شدہ لفظ بولے ہوئے لفظ اور فلم کے امیج سے کم ترسیلی ہوتا ہے۔ پرنٹ میڈیم اپنے عمل اور مزاج میں اقلیتی اور ELITIST ہے جس کے باعث فکر اور عمل میں بیگانگی پیدا ہوگئی۔ الیکٹرانک

ذہن جدید

میڈیا کی آمد سے انسان پھر سے آدی واسیوں کی اجتماعی زندگی کی جانب واپس لوٹ رہا ہے اور دنیا ایک گلوبل ولیج GLOBAL VILLAGE میں تبدیل ہو رہی ہے۔ اس گلوبل ولیج میں کتاب نابود ہو جائے گی (میک لوہان نے اس قول کے بعد ۱۹۶۹ میں ایک انٹرویو میں کہا کہ کتاب انسانی ترسیل کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ اس کا کوئی ثانی نہیں، یہ ہمیشہ رہے گی) آج انسان ایک سے زائد حواس کے ذریعہ ترسیل اور ابلاغ کی نئی اشکال کا سامنا بیک وقت کر رہا ہے جو الیکٹرانک میڈیا کے باعث ہی ممکن ہو سکا ہے۔ الیکٹرانک میڈیا نے صوتی اور سماعی کلچر کو پھر سے زندہ کر دیا ہے۔ اور اسے پرنٹ میڈیم کے مقابلے میں زیادہ وسیع اور مقبول بنا دیا ہے۔ ریڈیو، فلم اور ٹیلی ویژن کے ذریعے صوتی اور نظری ترسیل کو ایک جادوئی قوت حاصل ہے۔ کمپیوٹر اور الیکٹرانک میڈیا واقعات اور علم کو جمع، محفوظ اور نشر کرنے میں مدد دیتے ہیں جس سے علم کا وسیع ابلاغ ممکن ہوا زیادہ سے زیادہ لوگوں تک کم سے کم وقت میں انسان اس ٹکنالوجی کے ذریعے علم، سائنس، آرٹ، ادب وغیرہ کی ترویج واشاعت کرنے میں کامیاب ہوا ہے۔ اس فنی AUDIO VISUAL تہذیب سے بے حد خدشہ پیدا ہونے لگا ہے کہ اب تک ادب کو جو مخصوص مقام حاصل تھا وہ اب نہیں رہے گا۔ شاید یہ صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ الیکٹرانک ابلاغ کے پیچھے بھی تخلیق و تحریر کارفرما ہیں حالانکہ ان کے طرز اور اظہار میں تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔

میڈیا کی صورت اور "سیرت" الگ الگ اثرات

اسی خیال کے تحت میک لوہان نے میڈیا کی صورت (فارم) اور سیرت، کی بنیاد پر میڈیم کو گرم (تیز) اور ٹھنڈا میں تقسیم کیا ہے۔ گرم میڈیم میں ٹھنڈے میڈیم کے مقابلے کم اشتراک ہوتا ہے۔ کتاب گرم میڈیم ہے کتاب میں مکالمے کے مقابلے میں شرکت کا احساس کم ہوتا ہے۔ ادبی مجلسوں اور نشستوں کے ذریعے شرکت کی اس کمی کو نقرہ بہ نقرہ مکالمے کے ذریعے پورا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس سے یہ مراد ہے کہ میڈیم سے نشر مواد کے مقابلے میں میڈیم کے فارم اور خصوصیت میں انسان اور معاشرے میں تبدیلی لانے کی قوت زیادہ ہوتی ہے۔ ہم کس میڈیم کے ذریعے اطلاع اور علم حاصل کرتے ہیں زیادہ اہم ہے بہ نسبت اس کے کہ نشر کیا ہوا مواد کیا ہے بقول میک لوہان میڈیم ہی پیغام ہے (THE MEDIUM IS THE MESSAGE) اس نے اپنی کتاب THE MEDIUM IS THE MASSAGE میں اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ کس طرح میڈیم انسان کی زندگی اور طرز عمل اور افدار کو متاثر کرتا ہے۔ میڈیم کوئی غیر جانبدار شے نہیں وہ آدمی کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ اس کو مسلتا ہے۔ اس پر دباؤ ڈالتا ہے۔ اس کی اچھی طرح مالش کرتا ہے اس طرح میڈیم سماج میں محض تنظیم کو ہی نہیں اس کے احساس کو بھی متاثر کرتا ہے۔

اس لیے سوال ٹکنالوجی پر کسی طرح کی پابندی کا نہیں بلکہ انسان اور مشین کے باہمی عمل کو سمجھنے کا ہے۔

E.F. SCHUMACHER نے اپنی تصنیفات SMALL IS BEAUTIFUL اور FUTURE IS MANAGABLE میں واضح کیا ہے کہ دانشوری اسی میں ہے کہ سائنس اور ٹکنالوجی کو شعور، احساس، نفاست، عدم تشدد، اور حسن کے حصول کے لیے استعمال میں لایا جائے۔ ہر سماج میں زندگی، کام کاج کے طریقوں اور انبساط کا سرچشمہ کچھ نفسیاتی عناصر پر مبنی ہوتا ہے جو بہت ہی قیمتی اور حساس ہوتے ہیں۔ ادب ان بیش بہا اور حساس نفسیاتی عناصر کو نہ صرف محفوظ رکھتا ہے۔ بلکہ انہیں ہمیشہ بہتر اور حسین تر بناتا ہے

"انسانی تجربے کے اہم حصے کی معنوی طور پر سائنس کے نظام کے تحت قدر و قیمت متعین نہیں کی جاسکتی خیر و شر، جذبۂ ترحم، رنج و نشاط، ظرافت، خوش طبعی، نفرت، پیار، اعتقاد، وقار، اور زندگی کا جوہر وغیرہ ایسے تجربات ہیں جن کی کوئی جامع سائنسی وضاحت نہیں ہو سکتی"[1]

دراصل ٹکنالوجی اور ادب میں کوئی بُعد نہیں۔ یہ ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ مشین کی غیر ذاتی ترسیل کو انسان کے نجی تجربے کے دائرے میں لانے کی ضرورت ہے۔ جسے انسانی بنانے کی ضرورت ہے اور یہ فریضہ صرف ادب ہی سر انجام دے سکتا ہے۔ کیونکہ ادب کا رشتہ انسانی فکر و احساس اور حسن و اقدار سے ہے۔ بقول میک لوہان ہمارے چاروں طرف کے ماحول کو ٹکنالوجی کس طرح متاثر کرتی ہے یہ جان کر ہی ہم اس کے فیصلہ کن اثرات پر کنٹرول کر سکتے ہیں۔ جغرافیائی تبدیلیوں کو ناگزیر تسلیم کرنے کے بجائے میں اس بات پر زور دیتا ہوں کہ اگر ہم اس کے آلات اور امکانات کو سمجھ لیں تو ہم جس وقت بھی چاہیں اس کو روک سکتے ہیں۔ لیکن ایسا کرنے کے بجائے ہمارے پاس بہت سے دوسرے ایسے طریقے ہیں جن کے ذریعے ٹکنالوجی کو صحیح سمت دی جا سکتی ہے۔ سی۔ پی۔ اسنو نے جب دو مخالف تہذیبوں کا ذکر کرتے ہوئے TWO CULTURES میں لکھا تھا کہ ایک تہذیب سائنس کی ہے اور دوسری روایتی انسانی علوم کی تو وہ بھی اسی مسئلے سے دوچار ہو رہے تھے بعد میں انہوں نے TWO CULTURES - A SECOND LOOK میں ان دونوں تہذیبوں کو ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم تسلیم کیا ہے۔ آج بھی ہمارے سامنے یہی سوال ہے کہ ٹکنالوجی جس تہذیب کی پرورش کر رہی ہے اسے انسانی علوم، انداز، فلسفہ، فن اور ادب کی تہذیب کے دائرے میں کیسے لایا جائے گا کہ ایک جامع PLURALISTIC کلچر کا ارتقا ممکن ہو سکے۔

میڈیا کی تیسری لہر

الفریڈ ٹافلر نے ۱۹۹۰ میں شائع اپنی کتاب POWER SHIFT جو اس کی TRIOLOGY، فیوچر شاک (۱۹۷۰) اور دی تھرڈ ویو (۱۹۸۰) کی آخری کتاب ہے، میں اس بات کا ذکر کیا ہے کہ میڈیا کی پہلی لہر جس میں پرنٹ میڈیا نہیں تھا اور لوگوں کے مابین بات چیت سے براہ راست ترسیلی عمل ہوتا تھا کے مقابلے میں دوسری لہر میں پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا کا ابلاغی دائرہ اتنا وسعت اختیار کر گیا کہ اسے MASS MEDIA کے نام سے موسوم کیا گیا۔ بیک وقت دنیا کے ہر حصے میں جہاں تک میڈیا کی رسائی ہے لوگوں کے ہجوم تک ابلاغ ممکن ہو گیا۔ لیکن میڈیا میں ایک اہم تبدیلی آئی ہے جس کا ذکر اس نئی کتاب میں کیا گیا ہے کہ POST MASS PRODUCTION سماج میں میڈیا مختلف النوع گروہوں اور مفادوں کے مطابق عمل کر رہا ہے۔ اب ماس میڈیا DE MASSIFY ہو رہا ہے اور دوسری لہر میں ہر میڈیم دوسرے میڈیم سے آزادانہ طور پر کام کر رہا تھا لیکن اب اس تیسری لہر کے زیر اثر میڈیا کا FUSION ہو رہا ہے۔

---

[1]

IT IS THIS DENSE INTER PENETRATION THAT TRANSFORMS THE INDIVIDUAL MEDIA INTO A SYSTEM. COMBINED WITH GLOBALISATION. IT REDUCES THE CLOUT OF ANY SINGLE MEDIUM, CHANNEL, PUBLICATION OR TECHNOLOGY RELATING TO ALL THE OTHERS. BUT IT ENDOWS THE MEDIA SYSTEM-AS-A WHOLE WITH AN ENORMOUSLY ENHANCED POWER THAT PERMEATES THE PLANET. WHAT IS AT WORK, THEREFORE, IS NOT VIDEOCRACY BUT MEDIA FUSION.

"فیوچر شاک" میں ٹافلر نے پہلی لہر کے تحت میڈیا اور سماج کے بدلتے ہوئے رشتوں اور اثرات کے زیر اثر تبدیلی کے عمل پر زور دیا تھا کہ کس طرح تبدیلی عوام اور اداروں کو متاثر کرتی ہے، "دی تھرڈ ویو" میں تبدیلی کی سمت پر زور دیا گیا ہے کہ یہ تبدیلی سماج اور اداروں کو کس جانب لے جا رہی ہے، "پاور شفٹ" میں اس بات کو واضح کیا گیا ہے کہ تبدیلیاں جو ابھی ہوئی نہیں ان پر کنٹرول کے مسائل کیا ہیں؟ میڈیا اور دوسرے اداروں میں جو تبدیلی آرہی ہے اس کی شکل کیا ہوگی اور یہ عمل کیسے جاری ہے؛ اور اس کنٹرول کے باعث اقتدار کے مراکز بھی بدل رہے ہیں۔ اقدار اور اقتدار کی یہ کشمکش ایک نئے دور میں داخل ہو چکی ہے۔ ادیب اور دانشور بھی اقتدار کے مراکز میں تبدیلی اور استحکام کے عمل میں بعض اوقات آلۂ کار بن رہے ہیں (بن چکے ہیں) یا ان کی ثانوی حیثیت ہو چکی ہے۔ اس طرح دانشوری کی روایت اور اس کی ایک ادارے کی حیثیت کے خاتمے کے خدشے نے انسانی آزادی اور وقار کے حمایتی دانشوروں کو سماج میں ترسیل و ابلاغ کے مسائل پر نئے سرے سے غور کرنے پر مجبور کر رہا ہے۔ اور ہم اس امر کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے کہ روایتی، کلاسیکی اور لوک فنی نمونوں اور مختلف النوع طرز تعمیر کو زوال اور فن کے عمل کو ٹکنالوجی کے ذریعے ہی روکا جا سکتا ہے۔ ٹکنالوجی اور الیکٹرانک میڈیا سے منھ موڑ کر دور دراز گاؤں میں بسے لوگوں اور آدی واسی علاقوں میں ادب، فن اور تہذیب کی ترسیل کے دروازے بند کرنا ہوگا۔ آج آڈیو، ویڈیو کیسٹوں کے ذریعے ہم موسیقی، رقص، فنون، ادب، تہذیب، علوم، اطلاعات وغیرہ عوام کے گھروں کے اندر لے جا رہے ہیں۔ ابھی تک خواندگی حروف ابجد اور رسم الخط کے علم تک محدود سمجھی جاتی رہی ہے۔ لیکن آج ترسیل و ابلاغ کی دنیا میں داخل ہو کر تمام حواس کے استعمال کے لیے تعلیم یافتہ ہونے کی ضرورت ہے اور یہ ضرورت پرنٹ کے علاوہ الیکٹرانک میڈیا پورا کر رہا ہے۔ ہمیں اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ خارجی ٹکنالوجی اور انسان کی جسمانی نشوونما کے مقابلے انسان کی ذہنی نشوونما کی رفتار کہیں زیادہ تیز تر ہے۔ اروند گھوش نے اس بارے میں کہا ہے کہ انسان کا مزید ارتقا ہونے والا ہے۔ وہ ماورائے انسان یا اُتی مانو بننے جا رہا ہے۔ اس کا جسم اور ذہن سب کچھ بدل جائے گا۔ اس تغیر کے عمل میں اروند گھوش نے زیادہ زور ماورائے ذہن یا اتی مانس SUPER CONSCIOUSNESS پر دیا ہے انسان کی نشوونما کا اگلا دور جسم کے بجائے ذہنی نشوونما کا دور ہوگا۔ ظاہر ہے کہ اس دور میں انسان موجودہ ٹکنالوجی اور الیکٹرانک میڈیا سے پرے اس SUPER CONSCIOUSNESS کی ترسیل کے لیے نئے ذرائع کی تلاش کرے گا۔

" زیادہ سے زیادہ لوگ اس حقیقت کو دریافت کریں گے کہ ہمارے لیے زندگی کی تفسیر کرنے ہمیں تسلی اور سہارا دینے اور ہماری زندگی کے سرچشمے کو جاری و ساری رکھنے کے لیے ہمیں شاعری کی جانب مڑنا

باقی صفحہ ۱۴۳

Communalism Concerns Us All

ORGANISATION OF UNDERSTANDING & FRATERNITY

ہندی

مقبرہ شاہ شبیر علی

بھیشم ساہنی
ترجمہ حیدر جعفری سید

شاہ شبیر علی کے مقبرے کا قصہ مجھے میرے دادا نے اس وقت سنایا تھا جب میں بہت چھوٹا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ قصہ انہوں نے اپنے دادا کی زبانی سنا تھا اور وہ یہ بھی کہا کرتے تھے کہ ان کے دادا نے یا ہمارے کسی بزرگ نے شاہ شبیر علی کو خود دیکھا بھی تھا۔

اب بھی اس مقبرے کے کھنڈر موجود ہیں اور انہیں دیکھتے ہی سے لگتا ہے کہ مقبرہ شاہ شبیر علی کے نام سے موسوم عمارت کبھی بہت عالیشان رہی ہو گی۔ سیلانی اب بھی گاہے بگاہے اسے دیکھنے چلے جاتے ہیں لیکن جب شاہ شبیر علی زندہ تھا تب تو زائرین کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔ آپ کہیں گے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ آدمی زندہ ہو اور لوگ اس کا مقبرہ دیکھنے جاتے ہوں۔ تو جناب وجہ یہ ہے کہ یہ مقبرہ خود شاہ شبیر علی نے اپنے جیتے جی اپنے لیے بنوایا تھا۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ اس زمانے میں اسے شاہ شبیر علی کا مقبرہ نہیں بلکہ عام طور پر خالی قبر والا مقبرہ ہی کہا جاتا تھا۔ وہ اسی نام سے مشہور بھی ہوا تھا۔ اور اسی لیے لوگ دور دور سے اسے دیکھنے آتے تھے۔ کیونکہ یہ بہت انہونی سی بات تھی کہ جس شخص کو مقبرہ کے اندر دفنایا جاتا ہے وہ باہر گھوم پھر رہا ہو اور اندر اس کی قبر خالی پڑی اس کی میت کا انتظار کر رہی ہو۔ اگر مقبرہ میں قبر خالی ہے تو وہ مقبرہ کیسے ہوا؟ کیا قبر کے بغیر بھی کوئی عمارت مقبرہ ہو سکتی ہے۔

اب تو مقبرہ کا خالی حصّہ کھنڈر ہو چکا ہے لیکن اب بھی ان میں سے دو مینار کھڑے ہیں۔ بھلے ہی ان میں لگے رنگ برنگے جڑاؤ پتھر ٹوٹ ٹوٹ کر گر چکے ہوں، گنبد بھی گردش لیل و نہار کے ہاتھوں نوچا کھروچا جا چکا ہے۔ لیکن سیلانی لوگ اب بھی گنبد کے نیچے کھڑے ہو کر سر اونچا کر کے زور سے "شاہ شبیر علی" پکارتے ہیں، آواز کی بازگشت دیر تک سنائی دیتی رہتی ہے جیسے شاہ شبیر علی نام اب بھی چار سو گونج رہا ہے۔ لیکن ویسے جیسی کھنڈروں کی پہچان ہوتی ہے۔ کہیں اونچی اونچی گھاس اُگ آئی ہے تو کہیں سانپوں نے اپنے بل بنا لیے ہیں۔ رات میں سیار بولتے ہیں اور دن میں قسم قسم کے جانور گھومتے پھرتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ شاہ شبیر علی بہت ہی باحوصلہ بادشاہ تھا۔ اس کی بادشاہت میں صرف مقبرہ شاہ شبیر علی شاندار عمارت نہیں تھی بلکہ اُس کا محل بھی نہایت عالیشان تھا جو اس مقبرہ کے قریب ہی بنا ہوا تھا۔ شاہ شبیر علی اپنے محل کی چھت سے اکثر اس مقبرہ کو دیکھا کرتا تھا جس میں اسے ابدی نیند سونے کے بعد بس جانا تھا۔

کہتے ہیں کہ تخت نشین ہونے کے فوراً بعد اس نے اپنا دارالحکومت بدل دیا تھا اور اس جگہ نیا دارالخلافہ بنایا تھا جہاں اس کا موروثی گھر ہوا کرتا تھا — شبیر علی کے والد ایک معمولی مدرسے میں مدرس تھے اور ماں اَن پڑھ دیہاتن تھی۔ اس کچے مکان کے آثار تو اب ڈھونڈنے پر بھی نہیں ملیں گے۔ لیکن جب اس نے اپنا شاہی محل بنایا تھا تو اپنے موروثی گھر کے نزدیک ہی۔ تاکہ لوگ بچشم خود دیکھ سکیں کہ شبیر علی نے اپنی زندگی کا آغاز کس طرح کیا تھا اور وہ کہاں تک جا پہنچا ہے اسی راجدھانی میں جگہ جگہ اس کے مجسمے بھی ایستادہ تھے کہتے ہیں کہ یہ مجسمے اس کے دور حکومت میں ہی بنائے گئے تھے۔ ایک مجسمہ تو اس کے موروثی گھر کے قریب ہی لگایا گیا تھا۔ کہتے ہیں کہ اس پر سونا منڈھا

ہوا تھا۔ اس میں شیر علی کا بچپن دکھایا گیا تھا بغل میں بستہ دابے ہوئے نگاہیں افق پر مرکوز، دوسرا مجسمہ دار الحکومت کے چوک میں ایستادہ تھا جس میں شیر علی گھوڑے پر سوار، زرہ بکتر پہنے ہوئے، سر پر خود، اور ہاتھ میں دو دھاری تلوار لیے ہوئے۔ وہ مجسمہ اب بھی کسی عجائب گھر میں رکھا ہوا ہے۔ ایسا سننے میں آیا ہے۔

عالم شباب میں قدم رکھتے رکھتے شیر علی کے دل میں بلند عزائم کے طوفان اٹھنے لگے تھے۔ شیر علی نے اپنی سوانح حیات میں کہیں لکھا ہے کہ بچپن میں اس کے والد ایک بار اسے دار الحکومت لے گئے تھے اور اس سفر نے اس کی زندگی کے دھارے کا رخ بدل دیا تھا۔

راجدھانی میں والد کے ساتھ گھومنے کے دوران ہی کچھ انوکھے جذبات اس کے دل میں انگڑائیاں لینے لگے تھے۔ وسیع و عریض سڑکوں پر چلتے ہوئے شیر علی کو محسوس ہوتا کہ جیسے یہ سڑکیں صرف اسی کے لیے بنائی گئی ہیں تاکہ وہ ان پر شان و شوکت کے ساتھ چل سکے۔ جبکہ اس کے مدرس باپ جھکتے ہوتے سڑک کے کنارے چلتے ہوتے۔ اس نے ایک عجائب گھر میں قسم قسم کی پوشاکیں ٹنگی ہوئی دیکھی تھیں ایک سے ایک بڑھ کر منقش، چوغے، اور جانے کیا کیا۔ اس کے والد تو اسے کشیدہ کاری کی باریکیاں سمجھا رہے ہوتے اور شیر علی عالم تصور میں خود وہ پوشاکیں زیب تن کیے ہوتا۔ عجائب گھر میں ایک مجسمہ کسی بارعب سردار کا بھی تھا جو گھوڑے پر سوار تھا تنی ہوئی چھاتی اٹھی ہوئی مونچھیں، سر پر صافہ — اسے دیکھتے ہوئے شیر علی کو محسوس ہوا کہ جیسے وہ مجسمہ کسی اور کا نہیں بلکہ خود اس کا ہے۔

اس نے جلدی سے اپنا چوغہ پہنا دیوار پر لٹکتی تلوار اٹھائی پہرے داروں اور محافظوں کو آواز لگائی اور پلک جھپکتے گھوڑا گاڑی میں بیٹھ مقبرے کے سامنے جا پہونچا۔

راجدھانی میں ایک مقبرہ بھی تھا۔ لوگ اس کی عالیشان عمارت دیکھنے کے لیے دور دور سے آتے تھے شیر علی مسحور ہو کر اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔ شیر علی نے لکھا ہے کہ جب وہ اس گنبد کے نیچے پہنچے جہاں بادشاہ اور ملکہ کی قبریں تھیں تو اس کے والد نے سر اونچا کر کے کہا "کوئی ہے؟" تو اس کے والد کی آواز بہت دیر تک گنبد میں گونجتی رہی تھی لیکن جب گونج ختم ہوئی تو شیر علی نے جیسے اس آواز کے جواب میں کہا "شیر علی!" آواز گونجتی ہوئی، بار بار شیر علی، شیر علی پکارتی ہوئی فضا میں تیرتی رہی شیر علی کو لگا کہ اس کے نام کی گونج گنبد میں ہی نہیں بلکہ اس سے باہر نکل کر میدان اور وادیوں میں پھیل گئی ہے۔ دور دراز کے ملکوں تک جا پہنچی ہے۔ ننھا شیر علی جذباتی ہو اٹھا تھا۔

تب ہی — بقول شیر علی — مقبرے کے باہر نکل کر سڑک پر چلتے ہوتے شیر علی نے کنکھیوں سے اپنے والد کو دیکھا تھا۔ اور پہلی دفعہ اسے سخت مایوسی ہوئی تھی۔ اس کے والد اسے بہت معمولی سے انسان معلوم ہوتے تھے ذرا سی خمیدہ کمر، روکھا سا بے وقار چہرہ، کھچڑی مونچھیں اور انکساری سے جھکی ہوئی گردن — شیر علی لکھتا ہے کہ والد کو دیکھ کر اسے کچھ ذلت سی محسوس ہوئی۔ والد بھی ملے تو کیسے؟ نہ رعب نہ رتبہ۔ شیر علی نے اپنے والد کو دیکھ کر پہلی دفعہ ندامت سی محسوس کی۔ اس کے دل میں آیا کہ اپنے والد سے کہے کہ سینہ تان کر چلیے، مونچھوں کو اوپر اٹھائیے راجدھانی میں بھلا کوئی آپ کی طرح سر جھکا کر چلتا ہے؟

کہتے ہیں کہ شیر علی نے پندرھویں برس میں قدم رکھا ہی تھا کہ ایک دن گھر سے فرار ہو گیا۔ والدین نے

بہت تلاش کیا، ماں نے کافی گریہ وزاری کی لیکن اس کا کوئی پتہ نہیں چلا۔ شبیر علی گیا تو پھر لوٹ کر نہیں آیا۔ کچھ برسوں بعد انہوں نے سنا کہ وہ کسی گروہ میں شامل ہو گیا ہے۔ کاروائیاں کرنے لگا ہے کہتے ہیں ملک میں پھر بغاوت ہو گئی۔ جھڑپیں ہونے لگیں۔ اوسان میں شبیر علی کا نام بار بار سننے میں آتا تھا۔ کافی دن خانہ جنگی ہوتی رہی۔ پھر کسی دن خبر آئی کہ شبیر علی اور اس کے ساتھی فاتح قرار پائے ہیں اور جب فاتح گروہ دار الحکومت میں داخل ہوا تو شبیر علی شمشیر عریاں لئے ہوئے اس کی سربراہی کر رہا تھا۔

شبیر علی نے برسوں حکومت کی تقریباً تیس برس تک۔ خوب دھاک جمائی۔ اپنی مملکت میں اضافہ کیا۔ زمین پڑوسی ملکوں پر پے در پے حملے کر کے انہیں بھی اپنی مملکت میں شامل کر لیا۔ شبیر علی کے نام کی دھوم مچ گئی۔ اس کے نام کے سکے ڈھلنے لگے۔ نئی راجدھانی بن گئی۔ جگہ جگہ اس کے مجسمے نصب ہو گئے۔ ان ہی دنوں شبیر علی کے دل میں اپنا مقبرہ بنوانے کا خیال آیا تھا۔ ہو سکتا ہے یہ خیال اس کے تحت الشعور میں ہو بچپن میں سنی ہوئی اپنے نام کی بازگشت شاید اسے بار بار سنائی دینے لگی ہو یا اسے اندیشہ ہو کہ وفات کے بعد اسے عام آدمیوں کی طرح قبرستان میں دفن کر دیا جائے گا جس طرح میرے بزرگ دفن کیے جاتے رہے ہیں۔ اور مقبرہ بھی ایسا ہو کہ دنیا یاد کرے کہ کبھی کوئی شاہ شبیر علی تخت نشین ہوا تھا۔ دوسرے حکمرانوں کی طرح نہیں کہ دھول اڑاتے آئے اور دھول اڑاتے چلے گئے۔ ایسا مقبرہ کہ دنیا میں اس کی دھوم مچ جائے۔

پھر اس کے تصور میں مقبرے کا نقشہ بننے لگا۔ جو طلے کا پرندہ پنکھ پھیلائے تصور کے آسمان میں اونچی اونچی اڑانیں بھرنے لگا۔ کیسی جھلملاتی یادگار ہوگی۔ اوپر صاف نیلے آسمان کی وسعت پیچھے افق تک پھیلی سرخی مائل وادیاں، پہاڑیوں کے سلسلے اور درمیان میں ہیرے کی طرح دمکتا یہ مقبرہ۔

آخر کار ایک دن مقبرہ واقعی بن کر تیار ہو گیا۔ اسے تیار کرنے میں تیرہ برس لگ گئے۔ اس عرصہ میں شبیر علی کا شباب بھی ڈھلنے لگا۔ اور کمر بھی خمیدہ ہونے لگی۔ لیکن مقبرہ ایسا بنا کہ نظر ٹھہرتی ہی نہ تھی۔ شبیر علی محل کی چھت پر کھڑے ہو کر اسے دیکھتا تو اس کا دل بلیوں اچھلنے لگتا۔ دل کی لگن پوری ہو گئی تھی۔ مقبرے کی شہرت پھیلنے میں بھی دیر نہیں لگی۔ جلد ہی دور دراز کے ملکوں تک میں اس کا تذکرہ ہونے لگا۔ سیاح دور دور سے دیکھنے کے لیے آنے لگے۔ اس کی شان و شوکت سے کہیں زیادہ وہ مقبرے میں بنی اس خالی قبر کو دیکھنا چاہتے تھے جو اپنے مکین کی منتظر تھی۔ اور اس حکمراں کو بھی جسے اس قبر میں مدفون ہونا تھا۔ شاہ شبیر علی بذات خود دن میں ایک آدھ بار اپنی شاہی گھوڑا گاڑی میں بیٹھ کر اپنے متوقع مقبرہ کو دیکھ آتا تھا۔

اس مقبرہ کی شہرت پھیلنے لگی تو شبیر علی نے اس کے بلند و بالا پھاٹک بند کروا دیے۔ یہ مناسب نہیں تھا کہ سیاح اس مقبرہ کو دیکھنے آئیں جس میں قبر خالی پڑی ہو۔ اسے یہ صرف برا ہی نہیں معلوم ہوتا تھا بلکہ وہ اسے بدشگونی بھی سمجھتا تھا۔

اس ممانعت کے باوجود سیاح کثیر تعداد میں آنے لگے۔ "کھلی قبر والا مقبرہ" ان کی دلچسپی کا مرکز بنتا جا رہا تھا ستم ظریفی یہ تھی کہ سیاح اسے بھی دیکھنا چاہتے تھے جس نے اپنی زندگی میں ہی اپنا مقبرہ خود بنوا دیا تھا۔ شاہ نے خود دیکھا کہ جب وہ اپنی شاہی گاڑی میں محل سے نکل رہا ہوتا تو اس کے سیاح اس کی صرف ایک جھلک دیکھنے کے لیے سڑکوں پر کھڑے ہوتے۔ کچھ تو اسے دیکھ کر مسکرا دیتے کبھی کبھی تو اسے جھینپ بھی ہوتی کہ مقبرے سے زیادہ وہ خود سیاحوں کی دلچسپی کا مرکز بنتا جا رہا ہے۔ لوگ پہلے مقبرے کو دیکھتے اور اس کے بعد شاہ کا دیدار حاصل کرنے

کے لیے ادھر ادھر گھومتے پھرتے۔

اگر مقبرہ تیار ہو جانے پر شاہ کی وفات ہو گئی ہوتی سب کچھ ٹھیک رہتا۔ ادھر مقبرہ بن کر تیار ہوتا اُدھر شاہ شبیر علی اپنی آنکھیں ہمیشہ کے لیے موند لیتا۔ اور شان وشوکت تمام عہدے دار اور درباری جنازے کے ساتھ ہوتے۔ دونوں شہزادے اس کے جنازے کو کندھا دیتے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا، شاہ شبیر علی کا انتقال نہیں ہوا۔ بلکہ مقبرہ بن جانے کے بعد اس کی زندہ رہنے کی چاہت بڑھنے لگی۔ ملک اور بیرون ملک سے آنے والے سیاحوں کا تانتا سا لگا رہتا۔ ہزاروں طلائی سکوں کی آمدنی ہونے لگی۔ بھلا یہ کوئی مرنے کا وقت تھا۔؟ ایک بار آنکھیں موند لو تو چاروں طرف اندھیرا مسلط ہو جاتا ہے۔ پھر کبھی شاہی محل کی چھت سے چھٹکی ہوئی چاندنی میں تو کبھی غروب آفتاب کی سرخی کے پس منظر میں تو کبھی ڈھلتی دوپہر میں اپنے مقبرے کو دیکھنے میں جو لطف محسوس ہوتا تھا اس سے شبیر علی محروم نہیں ہونا چاہتا تھا۔

تب ہی ایک انہونی ہو گئی۔ شام کا وقت تھا۔ اور شبیر علی اپنے ذاتی محافظ دستے کے ساتھ اپنے مقبرے کی سیر کر رہا تھا کہ اس نے دیکھا کہ سامنے کی طرف سے اسی کا سپہ سالار بہترین گھوڑا گاڑی میں چلا آ رہا ہے۔ سپہ سالار کی گاڑی قریب سے گذری تو کوچوان نے لگام کھینچ دی۔ سپہ سالار نے گاڑی میں کھڑے ہو کر سلامی دی۔ پھر جھک کر دیر تک آداب بجا لاتا رہا۔ دعا سلام کے بعد وہ آگے بڑھ گیا۔

لیکن شبیر علی کے دل میں کھٹک سی ہوئی۔ سپہ سالار اس طرف کیوں آیا تھا؟ اسے یہاں کیا کام ہو سکتا ہے؟ مقبرے کے قریب کیوں منڈلا رہا تھا؟ وہ مقبرے کو اس طرح کیوں دیکھ رہا تھا جیسے پہلے کبھی دیکھا ہی نہ ہو۔ شبیر علی بے چین ہو گیا۔ لگتا ہے اس کے دل میں کوئی نہ کوئی منصوبہ رہا ہو گا۔ وہ جس طرح جھک کر آداب عرض کر رہا تھا اس سے تو یہ ہی معلوم ہوتا ہے کہ کچھ چھپا رہا تھا۔ آداب کے پردے میں دل میں پلنے والی سازش پر پردہ ڈال رہا ہے۔ یقیناً یہی بات ہے۔ مجھ پر نظر پڑنے سے پہلے کیسی پھٹی پھٹی آنکھوں سے مقبرے کی جانب دیکھ رہا تھا۔

شاہ شبیر علی اس رات دیر تک اپنے محل کی چھت پر کھڑا ہوا نہ جانے کیسی کیسی الجھنوں میں کھویا رہا۔ سپہ سالار ہی کی کیا بات ہے دوسرے لوگ بھی تو اس سے حسد کر سکتے ہیں مجھے تخت سے اتار کر کوئی دوسرا شخص مملکت ہڑپ کر سکتا ہے تاکہ مقبرہ بھی اس کے زیر اختیار ہو جائے۔ پھر مقبرہ بھی اسی کے نام سے موسوم ہو جائے گا۔ اور اُسی کی میت کو اس میں دفنایا جائے گا۔ اس رات کھلی چاندنی کے طلسمی ماحول میں چھت پر دیر تک چہل قدمی کرنے کے بعد شاہ شبیر علی نے طے کیا کہ چوری چھپے کوئی گھناؤنا چکر چل رہا ہے اور اس چکر کو ختم کر دینے ہی میں اس کی بھلائی ہے۔

جس قدر اس کا شک بڑھ رہا تھا اتنا ہی زیادہ مقبرے کی مقبولیت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ زندہ بھی رہنا چاہتا تھا اور ساتھ ہی ساتھ مقبرے سے بھی محروم نہیں ہونا چاہتا تھا۔

وہی ہوا جو ان حالات میں ہوتا ہے اس نے سپہ سالار کو قتل کروا دیا۔ سپہ سالار کو راستے سے ہٹانا اس کے لیے اشد ضروری ہو گیا تھا۔ اس کے قتل سے دوسرے درباری بھی محتاط ہو جائیں گے۔ اور پھر کسی کی ہمت نہ ہو گی کہ آنکھ اٹھا کر مقبرے کی جانب دیکھ سکے۔ اور اس میں دفن ہونے کے خواب دیکھے۔

سپہ سالار کو قتل کرانے کے بعد شاہ شبیر علی مطمئن ہو گیا اب مقبرہ میرے لیے محفوظ ہے۔ اب کوئی مقبرہ نہیں چھین سکتا ہے

لیکن چند ماہ بعد ہی اسے پھر احساس ہونے لگا کہ دربار میں اس کے خلاف کوئی سازش پنپ رہی ہے۔ اسے شک ہوا کہ اس سازش کے پیچھے وزیر اعلیٰ کا ہاتھ ہے اور وہی اُس کا سرغنہ ہے۔ اسے یہ بھی گمان ہوا کہ اُس سے بہت کچھ چھپایا جا رہا ہے کئی درباری اس سے بات چیت کے دوران کنکھیوں سے دوسرے درباریوں کو دیکھنے لگتے ہیں اور جب وہ کوئی فرمان جاری کر رہا ہوتا ہے تو دوسرے درباری کے ساتھ کانا پھوسی کرنے لگتے ہیں۔

اور ایک دن وزیر اعلیٰ کا بھی وہی حشر ہوا جو سپہ سالار کا ہو چکا تھا۔ لیکن شبیر علی کی بے چینی کم ہونے کے بجائے بڑھتی گئی۔ ایک رات وہ سوتے سوتے چونک کر اٹھ بیٹھا۔ اسے محسوس ہوا کہ جیسے عین اسی وقت مقبرے کا بڑا پھاٹک کھول دیا گیا ہے اور کچھ لوگ کسی کا جنازہ کاندھے پر اٹھائے پھاٹک پار کر کے مقبرے کے اندر چلے گئے ہیں۔ اور رات کے سناٹے میں خاموشی سے جنازہ گنبد کے نیچے کھلی قبر میں اتار رہے ہیں۔ پھر سنگ مرمر سے اس قبر کو ڈھک دیا گیا ہے وہ بھی اتنی مضبوطی سے کہ کوئی قبر کھول ہی نہ سکے۔ وہ بار بار آس پاس کھڑے لوگوں سے پوچھ رہا ہے کہ یہ کس کا جنازہ ہے لیکن کوئی بھی اس کے سوال کا جواب نہیں دیتا۔

شاہ شبیر علی ہانپتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا اور جسم پسینے پسینے ہو رہا تھا۔ وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ یہ خواب نہیں حقیقت ہے وہ بڑبڑایا اس نے جلدی سے اپنا چوغہ پہنا۔ دیوار پر لٹکتی تلوار اٹھائی پہرے داروں اور محافظوں کو آواز لگائی اور پلک جھپکتے گھوڑا گاڑی میں بیٹھ مقبرے کے سامنے جا پہنچا۔

لیکن مقبرے کا پھاٹک بند تھا۔ چاروں طرف اندھیرا اور سناٹا تھا۔ کہیں کوئی آہٹ نہیں۔ وہ کچھ دیر تک مقبرے کے اندر سے آنے والی آوازوں کے لیے کان لگائے رہا پھر شمشیر عریاں کو نیام میں ڈال کر شاہی محل لوٹ آیا۔

اس واقعے کے بعد کچھ ہی دن بیتے ہوں گے کہ اس کا بڑا بیٹا شہزادہ مراد اسے سلام کرنے حاضر ہوا اور باتوں ہی باتوں میں مقبرے کا ذکر کرنے لگا۔ شاہ شبیر علی کے کان کھڑے ہو گئے۔ کیا میرا بیٹا بھی میرے خلاف کسی سازش میں شامل ہو گیا ہے؟ کیا وہ بھی نہیں چاہتا کہ اس کے والد کو اس مقبرے میں دفنایا جائے؟ کیا وہ بھی اس مقبرے پر نظر جمائے ہوئے ہے؟ شہزادہ نے صرف اتنی سی بات کہی تھی کہ مقبرے کی شہرت بڑھتی جا رہی ہے اور وہ خزانے کے لیے ٹیکس جمع کرنے کا اچھا ذریعہ ثابت ہو سکتا ہے۔ اس نے اس بات کا اشارہ بھی دیا کہ اسے قومی یادگار کا روپ دے دیا جائے۔ اور ملک کی تمام معزز ہستیاں یہیں دفنائی جائیں اس طرح یہ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ ایک تاریخی حیثیت بھی اختیار کرے گا۔ بیٹے کی یہ گفتگو سننے کے بعد شبیر علی کو محسوس ہوا کہ مقبرے سے وابستہ اس کی امیج دھندلی پڑتی جا رہی ہے اور مقبرہ کسی معمولی اور عوامی قبرستان کی حیثیت اختیار کرتا جا رہا ہے۔

اپنے بیٹے کی اس گفتگو سے شبیر علی بہت متاثر ہوا تھا لیکن وہ بظاہر سنتا رہا، سر ہلاتا رہا، حسب معمول مسکراتا رہا، لیکن شہزادہ کے جانے کے بعد اس کا ذہن صاف ہو گیا — یہ مقبرہ کو قبرستان بنانے کی تجویز نہیں ہے بلکہ مجھے تخت سے اتارنے کی گہری سازش ہے۔

دادا بتایا کرتے تھے کہ اس کے کچھ عرصہ بعد کی بات ہے کہ ایک روز شام کے وقت جب سائے اتر ہی رہے تھے اور سیلانیوں کا ایک گروہ مقبرے کی سیر کر لینے کے بعد بڑے پھاٹک کے پاس اس انتظار میں کھڑا تھا کہ ممکن ہے شاہ شبیر علی ادھر سے گذرے اور وہ اس کا دیدار بھی کر لیں کہ اچانک شاہی محل کی طرف سے ہلکا سا شور سنائی دیا۔ سب اسی طرف بے چینی سے دیکھنے لگے۔ — شاہی محل کی طرف سے ایک شخص چلا آ رہا ہے ننگے پاؤں، ننگے سر، گریباں چاک، انگرکھے کی دوڑی زمین پر گھسٹتی ہوئی — اور انگرکھے کے پلّے بار بار گھٹنوں سے

ٹکراتے ہوئے۔ بیلانی پہلے تو کچھ سمجھ نہیں سکے لیکن جب مقبرے کے چوکیدار آگے بڑھ آئے اور انہوں نے دیکھا کہ اس بھاگتے آدمی کے پیچھے محل کے کچھ ملازمین بھی بھاگتے آرہے ہیں تو وہ سمجھ گئے کہ وہ شخص شاہ شبیر علی ہے۔

وہ شاہ شبیر علی ہی تھا۔ مقبرے کی طرف دوڑتا ہوا آرہا تھا کچھ ہی دیر میں وہ گرتا پڑتا، ہانپتا، کانپتا مجسم بدحواسی بنا ہوا مقبرے کے قریب پہنچ گیا۔ شاہی محل کے ملازمین، محافظ، پہرے دار اس کے پیچھے پیچھے تھے۔

وہ پھاٹک کے قریب ہانپتا ہوا رک گیا۔ اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے بیلانیوں میں سے کبھی ایک کو اور کبھی دوسرے کو دیکھنے لگا۔ اور پھر پلک جھپکنے کی دیر تھی کہ وہ ایک بیلانی پر جھپٹ پڑا اور اسے گلے سے پکڑ لیا۔ محافظوں نے آگے بڑھ کر اس کی گلو خلاصی کرائی ورنہ دیوانوں کی گرفت سے تو کوئی چھوٹتا ہی نہیں۔ فوراً شاہ کے محافظوں نے اس کے گرد حصار باندھ لیا پھر وہ اسے شاہی محل کی طرف واپس لے گئے۔

کہتے ہیں کہ اس کے کچھ ہی دن بعد شاہ شبیر علی کی لاش مقبرے کے بڑے پھاٹک کے پاس پڑی ملی۔

لوگوں کا کہنا ہے کہ موت سے پہلے وہ بار بار اپنے دفنائے جانے کا ناٹک کرتے لگا تھا۔ مقبرے کے پھاٹک کے سامنے پہنچ کر "شاہ شبیر علی، شاہ شبیر علی" چلاتا اور اونچی زمین سے نیچے اتر کر قبر میں لیٹ جانے کا ناٹک رچاتا۔ اور اگر کوئی اسے روکنے کی کوشش کرتا تو وہ اس پر جھپٹ پڑتا۔

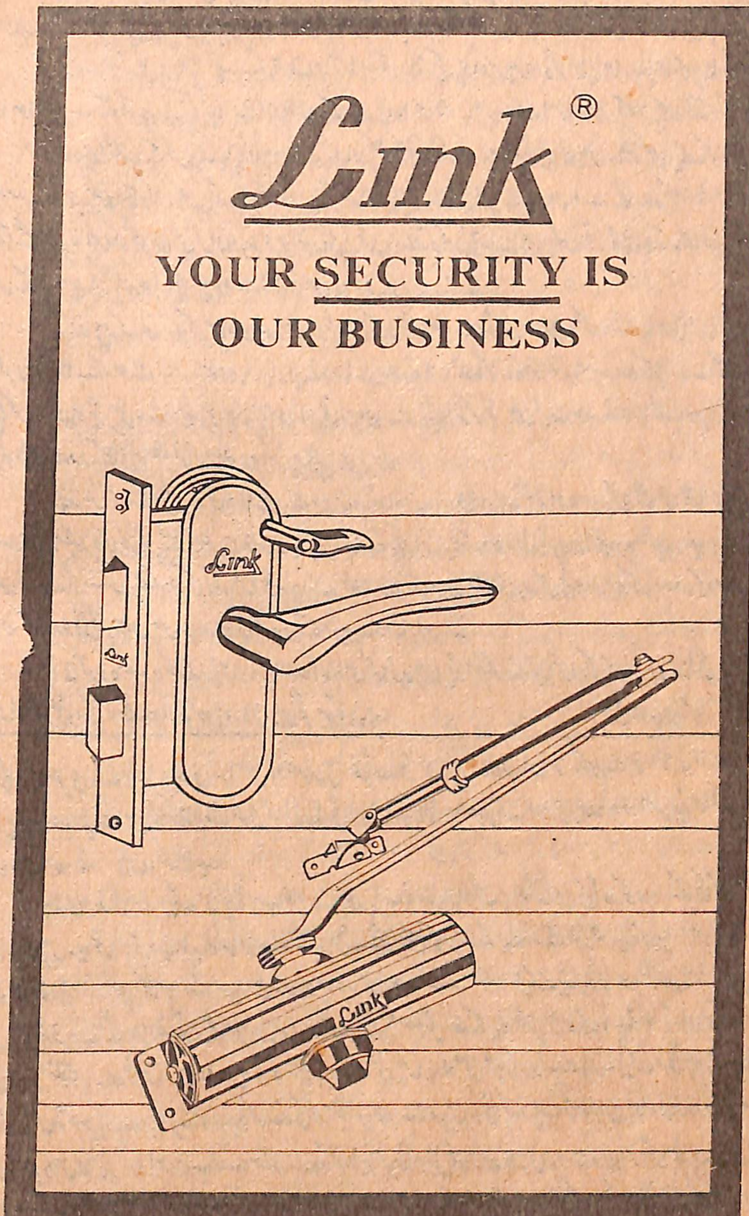
کہتے ہیں کہ شاہ شبیر علی کی وفات کے بعد تمام امراء وزراء، (جن میں شہزادہ مراد بھی شامل تھا) کا یہی فیصلہ تھا کہ مقبرہ کی قبر کو پہلے کی طرح خالی رہنے دیا جائے۔ کچھ اس لیے کہ وہ خالی قبر والا مقبرہ مشہور ہو چکا ہے لیکن خصوصاً اس لیے کہ ان کی نظر میں مقبرہ ایک قہر زدہ مقام بن چکا تھا۔ یہ بھی فیصلہ ہوا کہ اس کی میت کو ان کے موروثی قبرستان میں والدین کی قبروں کے قریب دفنایا جائے۔

آج تو وہ مقبرہ کھنڈر بنتا جا رہا ہے آج اسی کھنڈر میں ہُو ہُو کرتے سیاحوں کی آوازیں سنائی پڑتی ہیں "شاہ شبیر علی" کی گونج نہ جانے کن ہواؤں میں گم ہوگئی ہے۔

باقی ادب میڈیا صفحہ ۱۳۶

ہوگا۔ شاعری کے بغیر ہماری سائنس ادھوری نظر آئے گی اور ہم سے زیادہ تر کے لیے جو فلسفے اور مذہب کے نام پر چل رہا ہے اس کا مقام شاعری لے گی" (میتھو آرنلڈ ۱۸۸۰ء) ایک صدی بعد ۱۹۸۰ء الفریڈ ٹافلر نیو ویو NEW WAVE میں لکھتا ہے

ہماری زندگی میں ایک نئی تہذیب کا طلوع ہو رہا ہے۔ نابینا لوگ ہر جگہ اس کی آمد کو روکنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ نئی تہذیب اپنے ساتھ نئے خاندانی رشتے، کام کاج کے لیے نئے طور طریقے، پیار، اور جینے کے نئے انداز، نیا سائنسی نظام، نئے سیاسی تصادم اور ان سب سے سوا ایک نیا بدلا ہوا شعور لا رہی ہے۔ اس نئی تہذیب کے عناصر آج بھی موجود ہیں۔ لاکھوں لوگ مستقبل کے لیے سُر تال سے اپنے کو ٹیون کر رہے ہیں دیگر مستقبل سے خوف زدہ اور مایوسی کا شکار ہو کر ماضی میں بے معنی فرار کر رہے ہیں۔ ایک مرتی ہوئی دنیا جس نے انہیں جنم دیا ہے۔ پھر سے زندہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ نئی تہذیب کا طلوع ہماری زندگی کی سب سے اہم دھماکہ خیز صداقت ہے۔" صدائے تخم شذر کو خاموش کرنے کا یہی راستہ ہے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ کتابیں کسی میوزیم میں قدیم تہذیب کے کھنڈرات بن کر نہ رہ جائیں تو ہمیں میڈیائی تبدیلی کے عمل، اس کی سمت و رفتار اور اس پر اقتدار حاصل کرنے کے لائحہ عمل کو سمجھنا ہوگا کیونکہ اگر کتاب نابود ہوگی تو تواریخ اور تہذیب کا بھی خاتمہ ہو جائے گا


Link ®
YOUR SECURITY IS
OUR BUSINESS
Link
Link
Link

فون ڈیڈ ہے

نُصرت ظہیر

ایک روز خدا کا کرنا کیا ہوا کہ دہلی مہانگر ٹیلی فون نگم کے دو کرمچاری ہمارے گھر آئے اور پندرہ بیس منٹ تک دیواروں پر ادھر ادھر کچھ فٹنگ کرنے کے بعد ہمیں کھچڑی پور کالونی کا وی آئی پی، بنا کر چلے گئے، ٹیلی فون لگنے کی خوشی میں ہم نے فوراً ہنگامی طور پر محلّہ کے بچوں میں بتاشے تقسیم کرنے کا فیصلہ کیا اور آٹو رکشہ پر پچیس روپے خرچ کر کے گلی بتاشے والی سے سوا روپے کی بتاشے خرید لائے۔

لیکن گھر آئے تو دیکھا دروازے پر محلہ والوں کی لائن لگی ہوئی ہے۔ ابھی ہم یہ سوچ کر حیران ہو ہی رہے تھے کہ ہمارے بتاشے لانے کی بات اتنی جلدی سب کو کیسے معلوم ہو گئی کہ ہمیں آتے دیکھتے ہی قطار ٹوٹ گئی۔ جیسے ہم نہ آئے ہوں۔ ڈی۔ ٹی سی کی بس آگئی ہو۔ سب نے ہمیں گھیر لیا بلکہ بعض نے تو ہمارا بازو اس طرح تھام لیا جیسے وہ ہمارا بازو نہ ہو، بس کے دروازے کا ڈنڈا ہو۔

ہمیں اندیشہ ہوا کہ کہیں یہ سب لوگ ایک ایک کر کے ہم پر سوار نہ ہو جائیں۔ مگر جب ان کی باتیں سنیں تو یہ اندیشہ جاتا رہا۔ دھکم پیل دراصل اس لئے تھی کہ سب کے سب ہمیں مبارکباد دینے کے لئے بے تاب تھے۔

"مبارکباد ہو میاں جی۔ آپ اس گلی میں پہلے سجن ہیں جنھیں ٹیلی فون واسمان پراپت ہویا ہے۔" چوپڑا جی نے گرم جوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

"بہت بہت بدھائی ہو جی۔" خاص وسیع وعریض توندوالے ایک اجنبی صاحب بولے۔ "میں آپ کا سب سے پہلا پڑوسی ہوں۔ سیوک رام! میرے مکان کی دیوار آپ کی دیوار سے ملتی ہے۔ یوں سمجھئے کہ سگا پڑوسی ہوں آپ کا۔"

ایک اور عجیب الخلقت صاحب نے کہا۔ "سینوں بھی تسی اپنا سیوک ہی سمجھو مہاراج! ساڈا چھوٹا بھرا (چھوٹا بھائی) ساڈی چھت تے اُتھے۔ روز پتنگ اڑاندا سی۔ بڑا ہی سوہنا منڈا سی۔" (بڑا ہی اچھا لڑکا ہے۔)

اتنے میں بھاری بھرکم مسز ککڑ کسی بل ڈوزر کی طرح بھیڑ کو روندتی ہوئی ہماری طرف آئیں اور بولیں "بھائی صاحب ہمیں تو آپ بھول ہی گئے۔ ہمارے یہاں آنا جانا ہی چھوڑ دیا۔ بس ایک بار تب آئے تھے جب اس مکان کو کرایہ پر لینے کی بات چل رہی تھی۔ اور آپ نے ہم سے مکان کا پتہ پوچھا تھا۔ کل میں نے بھنڈی اور کدو کی بھاجی بنائی تھی یہ سوچ کر کہ آپ بہت پسند کرتے ہوں گے۔ مگر آپ تو آئے ہی نہیں۔"

جواب میں ہم کہنا چاہتے تھے کہ نہ تو ہمیں بھنڈی اور کدو پسند ہیں اور نہ ہی آپ نے ہمیں دعوت دی تھی کہ ہم آتے، لیکن ہم سے پہلے ایک اور صاحب بول پڑے۔

"بہن جی یہ اخبار والے آدمی ہیں بھلا انھیں فرصت کہاں۔ مگر خیر ہمارے ہاں ٹنڈے پکے ہیں۔ میری گھروالی آج ہی شام کو ایک کٹوری آپ کے ہاں بھیج دے گی۔ آپ تو اکیلے ہی رہتے ہیں نا۔ کھانا بنانے میں بڑی دقت رہتی ہوگی۔۔۔۔"

غرض اسی طرح کی بے سروپا باتوں سے اچانک ہمیں معلوم ہوا کہ گلی کے کافی لوگ ہمیں جانتے تھے اور دہلی میں ہم چاہے کتنے ہی گمنام ہوں مگر اپنی گلی میں خاصے مقبول تھے اور یہ کہ بلاوجہ ہی اپنی گم نامی کو لے کر احساس کمتری میں۔۔

ہوتے رہتے تھے۔

بچوں میں بتاشے بانٹ کر ہم گھر میں داخل ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ کمرہ پہلے ہی سے 'ہاؤس فل' ہو چکا ہے۔ وہاں بھی مبارک باد دینے والے بھرے ہوئے تھے۔ ایک صاحب نے بھیڑ میں سے نکل کر اپنا تعارف کرایا۔

"ہم شری ہنومان جی کے مندر سے آئے ہیں۔ یہ پرتی مندھی منڈل لیکر آپ کا ابھینندن کرنے کے لئے آپ نے گھر میں ٹیلیفون لگوا کر اس گھر کی شوبھا بڑھا دی۔" انھوں نے ہمارے ماتھے پر تلک لگاتے ہوئے کہا ہم نے ہاتھ جوڑ کر ان کا ابھینندن سویکار کیا تو انھوں نے ایک بڑا سا ہار ہمارے نئے نویلے ٹیلی فون کے گلے میں ڈال دیا اور پھر اس کو بھی ایک ٹیکا لگا دیا۔ پچیس افراد پر مشتمل اس وفد کو چائے اور شربت کے ساتھ سموسے کھلا کر اور اپنا ٹیلی فون نمبر بتا کر ابھی ہم نے رخصت کیا ہی تھا کہ نواحی کالونی کی مسجد منتظمہ کمیٹی کا وفد ملاقات کے لئے آگیا۔

"بھئی ماشاءاللہ مبارک ہو۔ ملت کے نوجوانوں کو اس طرح ترقی کرتے ہوئے دیکھ کر بڑی خوشی ہوتی ہے۔ سنا ہے آج ہی لگا ہے۔" ایک بزرگ نورانی صورت نے پوچھا۔

"جی ہاں آج ہی کرنٹ ریلیز ہوا ہے۔"

"بھئی واہ۔ اللہ مبارک کرے۔ ایس ٹی ڈی بھی لی ہے؟"

"جی ہاں۔"

"بھئی سبحان اللہ۔ اچھا دیکھئے آج رات کو بعد نماز عشاء مسجد میں ضرور تشریف لائیے گا تنزانیہ سے ایک مولانا تشریف لائے ہیں ان کے وعظ سے متاثر ہو کر افریقہ کے لاکھوں نوجوان راہ راست پر آگئے ہیں ....."

ابھی وہ اپنی بات پوری بھی نہ کر پائے تھے کہ ایک ماڈرن نوجوان نسوانی صورت کمرے میں آدھمکا۔ "یہ پاپا نے بھیجا ہے انکل۔" لڑکے نے مٹھائی کا ایک ڈبہ ہمارے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔

"ارے۔ اس کی کیا ضرورت تھی۔ واپس جائیے اور اپنے پاپا سے کہئے کہ ....."

"نہیں نہیں انکل۔ رکھ لیجئے۔ یہ ہماری ہی دوکان کی ہے۔"

"اچھی بات ہے۔ وہاں رکھ دیجئے۔" ہم نے اس طرف اشارہ کیا جہاں تک دھاری ٹیلی فون براجمان تھا۔ لڑکے نے مٹھائی کا ڈبہ وہاں رکھ کر ٹیلی فون کو نمسکار کیا اور پھر ریسیور اٹھا کر بولا "انکل ذرا دوکان پر ٹیلی فون کر لوں۔"

ہم نے کہا "شوق سے۔" لیکن لڑکے نے اس سے پہلے ہی سے نمبر گھمانے شروع کر دیئے تھے۔ پھر پندرہ منٹ تک اپنے پاپا سے کھویا، پنیر اور چینی کے اسٹاک اور کاریگروں کی پے منٹ کے بارے میں نہ جانے کیا کیا باتیں کرنے کے بعد ہم سے بولا۔

"انکل۔ پلیز اگر پاپا کا فون آیا کرے تو ہمارے گھر سے کسی کو بلا دیا کیجئے۔ ہم پاس والی دوسری گلی میں رہتے ہیں۔"

لڑکے کی ہدایت پر اس کے مکان نمبر نوٹ کرنے کے بعد ہم بزرگ نورانی صورت اور ان کے رفقاء کی جانب متوجہ ہوئے۔ مگر ابھی ہم نے ان کے لئے بازار سے چائے اور حلوہ لانے کا آرڈر دیا ہی تھا کہ محلہ سدھار کمیٹی کے صدر اور سکریٹری نے قدم رنجہ فرما کر ہماری عزت افزائی کر دی۔ صدر صاحب نے نہ صرف ہمیں مبارکباد دی بلکہ کمیٹی کے دو درجن اراکین کی فہرست بھی مع نام پتہ ہماری سہولت کے لئے دیدی۔ تاکہ اگر ان کی کوئی کال ہماری ٹیلی فون پر آئے تو ہم انھیں بروقت اور بہ آسانی ان کے گھروں سے بلا سکیں۔

"اچھا برادر عزیز۔ اب ہم چلتے ہیں۔" ان کے جانے میں بزرگ نورانی صورت بھی اٹھ گئے مگر جاتے جاتے پھر رک گئے۔

"میاں معاف کرنا۔ ذرا ایک ٹیلی فون کرنا ہے"، انھوں نے کہا۔

"ضرور ضرور۔"

"اپنے لڑکے سے بات کرنی ہے۔" وہ ریسیور اٹھا کر نمبر گھماتے ہوئے بولے۔ "ان دنوں دوبئی میں رہتا ہے۔"

"دوبئی میں؟" ہم بڑبڑا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

"ہاں۔ ماشاء اللہ۔ وہاں ٹیلی فون کے محکمے میں ملازم ہے۔"

اس کے بعد بزرگوار دوبئی میں اپنے بیٹے کو بیس منٹ تک نصیحتیں اور نیک آدمی بننے کی تلقین کرتے رہے۔

"بھئی واہ"، بات مکمل کرنے کے بعد انھوں نے کہا۔ "ایس ٹی ڈی بھی کیا مزے کی چیز ہے۔ پلک جھپکنے میں آدمی ہزاروں میل دور بات کر لیتا ہے۔ سب قیامت کے آثار ہیں۔ خیر۔ تنزانیہ کے مولانا کو یاد رکھنا برخوردار۔۔۔۔" انھوں نے ہمیں نیم مردہ چھوڑ کر جاتے ہوئے کہا۔

اگلے چند روز میں ہم نے تمام صورت حال کا بہ نظر غائر جائزہ لیا تو پایا کہ گھر میں ٹیلی فون لگنے سے پورا محلہ خوش تھا۔ لوگوں نے ٹیلی فون لگنے کی خوشی میں مٹھائی کھلائی، ہار پہنائے، یہاں تک کہ علاقہ کی محلہ سدھار کمیٹی غیر رجسٹرڈ کا پراپیگنڈہ سیکریٹری تک بنا دیا۔

مالک مکان اتنا خوش ہوا کہ اس نے کرائے میں سو روپے بڑھا دیئے۔ گلی میں ہمارے گھر کے آگے بلا ناغہ ہر ہفتے جھاڑو لگانے والی مہترانی کو ایسی دلی مسرّت ہوئی کہ اس نے ہمارے گھر کا ریٹ ۱۰ سے بڑھا کر ۱۵ روپے کر دیا۔ دودھ والا اس قدر شاداں و فرحاں ہوا کہ اس نے دودھ میں فی لیٹر ۲ پیسے اور ۔۔ ملی میٹر پانی کا اضافہ کر دیا۔ اور تو اور مندر، مسجد، گوردوارہ مدرسوں اور پاٹھ شالاؤں کے لئے چندہ اکٹھا کرنے والوں کو بھی نہ جانے کیسے معلوم ہو گیا کہ ہمارا اسٹیٹس بڑھ گیا، چنانچہ انھوں نے بھی ہمارا ریٹ بڑھا دیا۔

خود ہمارا بھی یہ حال تھا کہ ہر چند اپنے ٹیلی فون کا حلقۂ اثر بڑھنے سے عاجز آ گئے تھے پھر بھی ٹیلی فون کا لگ جانا اتنی بڑی بات تھی کہ خوشی چھپائے نہیں چھپتی تھی۔ ہر ایک کو پکڑ پکڑ کر اپنا ٹیلی فون نمبر بتاتے پھر رہے تھے۔ جب بھی کوئی دوست یا شناسا ملتا علیک سلیک کے بعد ہماری خیریت دریافت کرتا تو ہمارا جواب عموماً یہ ہوتا۔

"جی خدا کا فضل ہے۔ آپ کی دعا سے بخیریت ہیں۔ خالہ کے لڑکے کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ ماموں کی ٹانگ ٹوٹ گئی ہے۔ بھانجہ دسویں میں پھر فیل ہو گیا ہے۔ باقی سب خیریت ہے۔ اور ہاں گھر میں ٹیلی فون بھی لگ گیا ہے۔ ڈبل فائیو ڈبل فور ٹو فائیو۔ نمبر نوٹ کر لیجئے۔"

اس مہم کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوا۔ کچھ ہی دنوں بعد ہمارے گھر میں دوستوں اور ہمسایوں کی بھیڑ رہنے لگی۔

کبھی کوئی کونل تشریف لے آتے اور کہتے۔ "اس طرف سے گذر رہا تھا سوچا ذرا آپ کا حال چال بھی معلوم کروں۔" اس کے بعد اس طرف تو ہم اپنا حال سناتے رہتے۔ اور دوسری طرف وہ ناگ پور سے ٹرنک کال ملا کر ایک ٹرک سنترے بھیجنے کا آرڈر دے جاتے۔

ان کے جاتے ہی کوئی چوپڑا صاحب آ دھمکتے اور ہمیں مفت میں ٹیلی فون کرنے کے لئے آنے والوں سے بچنے کے کارگر طریقے بتاتے بتاتے ٹیلی فون پر چاوڑی بازار میں اپنے بھتیجے کی خیریت، نجف گڑھ میں سیمنٹ ڈیلر سے اسٹاک کی پوزیشن، ریلوے انکوائری سے تن سکھیا میل کے چلنے کا وقت اور دوردرشن کے سیپشن روم سے اتوار کی فیچر فلم کا نام پوچھ جاتے۔

ان سب کے علاوہ مسٹر ککلکرنی بھی اپنے پانچوں بچوں سمیت ہم سے ملکی اور غیر ملکی سیاست کے تازہ ترین حالات پوچھنے اور ان پر بحث کے لئے آتے رہتے۔ ان کے آنے پر جب ہم انھیں کمبوڈیا میں پول پوٹ کی واپسی کے امکانات اور نکاراگوا کی نئی صنعتی پالیسی سے ہندوستان اور خلیجی ملکوں کے باہمی روابط پر پڑنے والے اثرات کے بارے میں بتارہے ہوتے تو ان کے صاحبزادے ہمارے ٹیلی فون سے شوق فرماتے رہتے۔

کوئی انٹ شنٹ نمبر ملا کر شرارتاً دوسری طرف سے رسیور اٹھانے والے کے رشتہ دار کا آئی۔ٹی۔او پر ایکسیڈنٹ کرا دیتا، دوسرا ون سیون فور ملا کر، وقت بتانے والی عورت کی نقل اتارنے لگتا۔ ہم اس سے کہتے بیٹے تمہارے ہاتھ میں گھڑی بندھی ہے۔ اس میں وقت کیوں نہیں دیکھ لیتے، مگر وہ یہ کہہ کر لاجواب کر دیتا کہ "انکل میری گھڑی ٹھیک نہیں چلتی ہمیشہ اصل وقت سے دس سکنڈ آگے رہتی ہے۔"

ٹیلیفون خراب ہونے کی سب سے اچھی صورت وہ ہے جب وہ پوری طرح ڈیڈ ہو۔

اس پر مسٹر ککلکرنی انھیں سختی سے ڈانٹ کر رسیور اپنے ہاتھ میں لے لیتے اور پھر اپنے دفتر کے کسی ساتھی کا نمبر ملا کر اس سے آدھے گھنٹے تک دفتر کی پالٹیکس پر تبادلۂ خیالات کرتے رہتے۔ اس کے بعد وہ پھر ہماری طرف متوجہ ہوتے اور کہتے

"معاف کیجئے بھائی صاحب میں آپ کے اس خیال سے متفق نہیں ہوں کہ کمبوڈیا میں لوٹ پوٹ کی واپسی کے بعد"

"لوٹ پوٹ نہیں پول پوٹ،" ہم انھیں یاد دلاتے

"ہاں ہاں وہی۔ پوٹ پول۔"

"پول پوٹ جناب پول پوٹ۔"

"جی ہاں میرا مطلب وہی ہے۔ ٹول پول۔"

"پول پوٹ!" ہم چلا کر کہتے۔

"ارے صاحب کہہ تو رہا ہوں۔ پوپ لوٹ......

ہمیں یاد آیا کہ نہ تو ہمارا نام مقصود ہے نہ ہی ہماری کوئی بیوی ہے اور یوں ہماری جان میں جان آئی۔

"چلئے رچلئے۔ آگے کہئے۔ ہم ہتھیار ڈال دیتے۔

میرا کہنا یہ ہے کہ ٹوپ لول کی نکاراگوا میں واپسی کا کمبوڈیا اور خلیجی ملکوں کے باہمی تعلقات پر کوئی اثر نہیں پڑے گا، اس لئے ہمیں......

"مسٹر ککلکرنی پلیز۔ ہمارے حال پر رحم کیجئے۔ پول پوٹ نکاراگوا سے نہیں کمبوڈیا سے تعلق رکھتا ہے اور ہم ہند اور خلیجی ملکوں کے تعلقات پر گفتگو کر رہے تھے کمبوڈیا اور خلیجی ملکوں کے تعلقات پر نہیں۔"

"کوئی بات نہیں بھائی صاحب۔ کل ہم اس موضوع پر مزید گفتگو کریں گے۔ اب اجازت دیجئے خدا حافظ۔"

غرض اس طرح ہمارا ٹیلی فون ہم سے زیادہ ہمارے دوستوں کے کام آتا رہا اور ان سب کی خاطر تواضع سے ہم بڑی طرح عاجز آگئے۔ یہاں تک کہ مقروض بھی ہو گئے۔ پھر بھی ہم خوش تھے کہ چلو کوئی بات نہیں ٹیلی فون کی ہی بدولت سہی چار آدمی عزت تو کرتے ہیں۔

مگر جب یہ آئے نامراد خراب ہوا ہے تب سے پڑوسیوں کا ہی نہیں ہمارا بھی برا حال ہے۔ نہ دن کو سو سکتے ہیں نہ رات کو۔ ہر وقت بس ایک ہی دعا رہتی ہے کہ خدایا کسی کو ٹیلیفون نہ دے، اور دے تو وہ خراب نہ ہو۔

مشکل یہ ہے کہ ٹیلی فون خراب ہونے کی کوئی ایک نہیں ہزار صورتیں ہوتی ہے۔ اور بدقسمتی دیکھئے کہ ہمیں ان سبھی کا ایک ایک کر کے سامنا کرنا پڑا ہے۔

سب سے پہلی خرابی ہمارے ٹیلیفون میں یہ آئی کہ اس پر دوسری طرف سے غلط کالیں آنے لگیں۔ عام لوگ ایسی صورت میں "ساری! رانگ نمبر" یا "ہشت! رالگ نمبر" کہہ کر رسیور رکھ دیا کرتے ہیں۔ لیکن ہماری ٹریجڈی یہ ہے کہ ہم نے عام آدمی بننے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ کئی ایسے موقعوں پر جب عام آدمی آسانی سے بچ جاتا ہے، ہم پوری طرح پھنس جاتے ہیں۔

مثلاً ایک صبح ہم جوتوں پر پالش کر کے دفتر روانہ ہونے والے تھے کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ لپک کر رسیور اٹھایا تو دوسری طرف سے آواز آئی۔ "ہلو۔ مقصود بھائی ہیں خلیل خاں بول رہا ہوں پھاٹک حبش خاں سے۔ آپ کی بیوی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ تھری وہیلر سے جلدی آیئے۔ اسپتال لے جانا پڑے گا۔

"کیسے؟" ہم نے پوچھا۔

"بیوی کو جناب۔"

اوہ اچھا۔ میں آتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے ہم نے چھلانگ لگائی۔ جلدی جلدی کُرتے کی جگہ کرتا اور پائجامے کی جگہ پائجامہ پہنا۔ دائیں پیر کا جوتا بدقت تمام بائیں پیر میں اور بائیں پیر کا دائیں پیر میں چڑھایا اور بھاگم بھاگ زینہ اتر کر گھر سے باہر چل دیئے۔ مگر یاد آیا رومال تو رہ ہی گیا ہے۔ چنانچہ پلٹے۔ زینہ چڑھ کر کمرے میں داخل ہوئے۔ بڑی مشکل سے رومال ڈھونڈا۔ اور چل دیئے۔ مگر اس مرتبہ خیال آیا کہ شاید کمرے کا تالا لگانا بھول گئے ہیں۔ چنانچہ پھر پلٹے۔ تالہ لگایا واپس چلے مگر بائیں پیر کے دائیں جوتے نے زینے پر نہ جانے کیا حرکت کی کہ پاؤں پھسلا اور تختہ مڑ گیا۔

پڑوسیوں کی مدد سے درد میں چیختے چلاتے، شدّو پہلوان کے ہاں پیر سیدھا کرانے گئے اور وہاں پٹی بندھوانے کے بعد پلٹے تب جا کر یاد آیا کہ نہ تو ہمارا نام مقصود ہے اور نہ ہی ہماری کوئی بیوی ہے اور یوں جان میں جان آئی۔

ان غلط کالوں کا سلسلہ رات کو بھی جاری رہنے لگا۔ کبھی کبھی رات کو تین بجے گھنٹی بجنے لگتی۔ رسیور اٹھاتے تو مسز چھاپڑا کے شوہر مسٹر چھابڑا کی طرف سے ہدایت ملتی کہ مسز چھابڑا کو لیبر پین ہو رہا ہے اس لئے ڈلیوری میں مدد دینے کے لئے فوراً مع آلات آجائیں۔ کبھی کوئی رات کو ایک بجے جگا کر پوچھتا یا پوچھتی۔ "اکیلے ہو کیا؟ بھیجوں کسی کو؟" نتیجہ یہ ہوتا کہ ساری رات بے چینی میں گذرتی۔

تنگ آ کر ٹیلی فون والوں سے شکایت کی تو گھر پر پولس آ دھمکی۔ پتہ چلا کہ ہماری شکایت ٹیلی فون ایکسچینج کی بجائے غلط لائن ملنے سے پولس کنٹرول روم پہنچ گئی تھی۔ پولس والوں کو چا، شربت اور مٹھائی پیش کر کے بدقت تمام ان کے مختلف شکوک رفع کئے۔ اور جب وہ چلے گئے تو سوچ میں پڑ گئے کہ ٹیلیفون خراب ہونے کی اطلاع کیسے ترسیل کی جائے۔ آخر ایک ترکیب سوجھی۔ دھڑکتے دل کے ساتھ ہم نے پولس کنٹرول روم کا نمبر ملایا اور لطف دیکھئے کہ لائن ٹیلی فون نگم سے مل گئی ہم نے جلدی سے شکایت کی اور ان سے فوراً کوئی مستری بھیجنے کو کہا۔

شکایت پر فوراً عمل ہوا اور ٹیلی فون کا مستعد کارندہ ٹھیک ایک ہفتے بعد اور ٹیلی فون ٹھیک کرنے ہمارے گھر آ گیا۔ مگر اس نے نہ جانے کون سا پیچ گھمایا کہ پہلے سے بھی زیادہ غلط کالیں آنے لگیں اور ہر دو منٹ بعد گھنٹی بجنے لگی۔ مجبوراً ایک مستری کو ذاتی خرچ پر بلایا۔ اس بندۂ نیک بخت نے وہ لاجواب حل نکالا کہ گھنٹی ہی بند ہو گئی۔

مگر اب ایک نئی خرابی پیدا ہوگئی۔ ہم جو نمبر ملاتے وہ ہمیشہ انگیج ملتا۔ پہلے تو ہم یہ سمجھتے رہے کہ غالباً لوگ آج کل زیادہ مصروف رہنے لگے ہیں۔ مگر جب ایسے سرکاری دفتروں کا فون بھی مصروف ملنے لگا جہاں کام کو حرام سمجھا جاتا ہے تو ہمارا ماتھا ٹھنکا۔ آخر جب ہم نے خود اپنا نمبر ملایا اور وہ بھی انگیج ملا تو یقین ہوگیا کہ کوئی نہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔ لہٰذا مستری ہٰذا کو دوبارہ مع سفر خرچ وطعام بلایا۔ اس نے کچھ ایسا کمال دکھایا کہ ہم جو بھی نمبر ملاتے کھٹ سے مل جاتا۔ یہاں تک کہ ہم نے اپنا نمبر ملایا تو وہ بھی مل گیا۔

"ہلو! دو سو پچیس چوالیس پچیس؟" ہم نے پوچھا۔

"جی ہاں۔ فرمایئے۔" ہمیں اپنی آواز سنائی دی۔

"ذرا نصرت ظہیر صاحب سے بات کرا دیں۔"

"معاف کیجئے، وہ ٹنڈے لینے بازار گئے ہیں۔ کوئی میسج ہو تو بتایئے۔"

"جی کچھ نہیں۔ مجھے ان ہی سے بات کرنی تھی۔"

لیکن چند روز بعد پتہ چلا کہ اس مرتبہ ایک نئی گڑبڑ ہوگئی تھی۔ اپنے علاوہ ہم جو بھی نمبر ملاتے وہ کسی اور کے نمبر سے مل جاتا تھا۔ ہم بات کرنا چاہتے مکتبہ برہان والوں سے مگر جواب ملتا حاجی کریم انڈے والوں کی طرف سے۔ نمبر ملاتے جماعت اسلامی کا مگر رسیور اٹھا لیتے: آر ایس ایس والے۔ اسی طرح پرگتی میدان میں مفت دکھائی جانے والی فلموں کے بارے میں معلوم کرتے کملا مارکیٹ تھانے کا ایس ایچ او بتانے لگتا۔ "آج انار کلی، چمپا کلی، نوالی، سلمیٰ، سیتا اور گیتا کو دعوتِ عیش دینے پر گرفتار کر کے ان کے گاہکوں کو چھوڑ دیا گیا۔ بتایئے میرے لائق کیا خدمت ہے؟"

اس دفعہ مستری ہٰذا کی خدمات حاصل کیں تو یہ خوبی پیدا ہوئی کہ ہماری کالیں تو ٹھیک ٹھاک جانے لگیں۔ مگر دوسروں کی آنا بند ہوگئیں۔ تنگ آکر پھر ٹیلیفون ٹھیک کرایا تو دوسروں کی کالیں آنے لگیں لیکن ہماری بند ہوگئیں۔ چنانچہ پھر مرمت کرانی پڑی۔ مگر اس دفعہ گھنٹی کی آواز مدھم پڑ گئی۔ گھنٹی ٹھیک ہوئی تو ڈائل ٹون ہلکی ہوگئی۔ پھر وہ ٹھیک ہوئی تو گھنٹی لگاتار بجنے کا عیب پیدا ہوگیا۔ اس سے نجات ملی تو لائن پر صرف کھٹ، پٹ، پھٹ پھٹ سنائی دینے لگی۔ آخر میں یہ ہوا کہ گھنٹی اور ڈائل ٹون بھی بند ہوگئی کالوں کا آنا جانا بھی رک گیا۔ اور جب ہم رسیور اٹھاتے تو دوسری طرف سے ایک ساتھ بہت سے لوگوں کی گفتگو سنائی دینے لگتی۔

"ہاں بھئی کھربیدا۔ کیا حال ہیں۔ شرما اور گپتا سے بات ہوئی؟"

"ہاں آج ہی ہوئی ہے۔ مگر وہ کہہ رہے تھے کہ چوپڑا کالیہ اور تنیجہ سے بھی بات کر لو ورنہ چاولہ کھنہ اور مہتہ ناراض ہو جائیں گے۔ اور ہمیں لگڑ مکڑ تنیجہ کو بھی ٹنڈر میں حصہ دینا پڑے گا"

"یہ تو تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔ میرا خیال ہے کہ گوئل پر بھی نظر رکھو۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ کپور، سبھروال، نوٹیال اگروال اور۔۔۔۔۔

"ہلو رشمی میں سنجے بول رہا ہوں۔"

"تم چپ رہو بھائی ہاں تو پانڈے نے ورما اور تنیجہ سے کہہ دیا تھا کہ جب تک ودھوا اور اروڑہ سے۔۔ میں نے ٹرک بھیج دیا ہے بھائی صاحب۔ صبح ہی آدمی مال لے کر گیا ہے۔"۔۔۔

"تم بھی کیا بات کرتے ہو یار ٹنڈن۔ سچدیوا پر شک کرتے ہوئے۔ ارے وہ تو کل ہی ....."

"رشمی۔ میں سنیجے بول رہا ہوں، ....."

"ابے، کون ہے بے ؟ دیکھو یار ٹنڈن تم کل ٹھیک وقت پر آجانا۔ اور دیکھو گوسوامی، چوہان اور ماتھر کو ساتھ لانا نہ بھولنا۔ ورنہ ملہوترا ....."

"بھائی صاحب وزن پورا ہے۔ ہم کاروبار میں کبھی بے ایمانی نہیں کرتے ....."

"رشمی سنو۔ کل گولچہ پر ملنا۔"

"ابے ہٹ بیچ میں سے۔ کیا مصیبت ہے یار ٹنڈن۔ ذرا بات کو سمجھو۔ شرما اور گپتا کہہ رہے تھے ....."

"مونگ پھلی کا نہیں بھائی بنولے کا تیل۔ چار کوئنٹل اسٹاک کرنا ہے ....."

"گولچہ پر رشمی ....."

"چوپڑا کا یہ نتیجہ ....."

"مونگ پھلی۔ بنولہ ....."

"رشمی میں سنیجے بول رہا ہوں۔ کل گولچہ پر تین بجے۔ زخمی عورت کے ٹکٹ لے لئے ہیں میں نے ....."

"ابے چپ!"

"سبھروال نوٹیال، اگروال ....."

"ہلدی، سرسوں ....."

"گولچہ، زخمی عورت ....."

"ہلو ٹنڈن۔"

"ہلو مشرا جی۔"

"ہلو سیٹھ جی۔"

"ہلو رشمی۔"

"ابے تو، رسیور رکھتا ہے یا نہیں ....."

اور ہم گھبرا کر رسیور رکھ دیتے ہیں۔

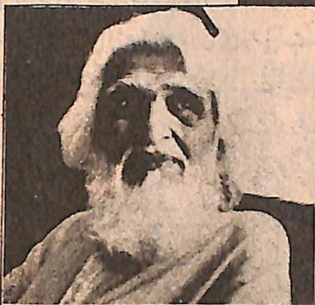
یہ خرابی کئی دن چلی تو آخر ہم نے ایک دن خود ہی ٹیلی فون کا مستقل علاج کر دیا اور ایک ہتھوڑا ڈھونڈ کر رسیور پر بجا دیا۔

یہ اطلاع ملتے ہی ہمارے دوست میاں عبدالقدوس دوڑے دوڑے آئے۔ پورا قصہ سن کر ہماری پیٹھ تھپکی اور فلسفیانہ لہجے میں بولے۔

ٹیلی فون خراب ہونے کی سب سے اچھی صورت وہ ہے جب وہ پوری طرح ڈیڈ ہو!

گذارش ٥ ذہن جدید کے پڑھنے والے اور تقسیم کار اپنی کاپی پہلے سے محفوظ کرالیں کہ شمارہ ۱ تا ۶ فراہمی کے لئے ہمارے پاس نہیں بچے۔


کاروبار کے لیے بڑے شہروں
کے درمیان آنا جانا کبھی
اتنا آسان نہ تھا...
مفت چیک اِن
بڑے بڑے شہروں میں آپ کسی بھی اڑان کے
لیے ہمارے کاؤنٹر سے چیک ان کر سکتے ہیں۔
ٹیلی چیک اِن
'جے' کلاس کے مسافروں کے لیے سہولت' وہ
فون کے ذریعے چیک ان کر سکتے ہیں اور جہاز
اڑنے سے صرف آدھ گھنٹہ پہلے ہوائی
اڈے پر آ سکتے ہیں۔
ڈالر میں کرایہ ادا کرنے
کی رعایتی اسکیم
ڈالر کے ذریعے خریدی گئی ٹکٹوں کے لیے
۲۵ فی صد نشستیں محفوظ رہتی ہیں۔ کینسل
کرانے پر کوئی کٹوتی نہیں۔ ڈالر میں کرایہ
ادا کرنے کی کئی رعایتی اسکیمیں بھی ہیں
ہمارا بیڑا
تمام ۴۸ جہاز جیٹ ہیں۔
۱۱ ایئربس اے ۳۰۰، ۱۸ ایئربس
اے ۳۲۰ اور ۱۹ بوئنگ ۷۳۷
خودکار جواب
ہمیں کسی بھی وقت فون کیجئے۔ اڑان
کے بارے میں خودکار اطلاع کی سہولت
۲۶ شہروں میں موجود ہے۔
فوری ریزرویشن
ہمارے ریزرویشن کا طریقہ ایسا ہے'
جس سے آپ کو تمام جگہ جانے والے
جہازوں میں فوراً ریزرویشن مل جائے
گا، بڑی بڑی انٹرنیشنل ہوائی کمپنیوں
کے جہازوں میں بھی۔
ٹکٹ خریدئیے اور سفر کیجئے
زیادہ تر ٹرنک روٹ کی اڑانوں کے
لیے آپ کاؤنٹر تک آئیے، ٹکٹ
خریدیے اور سفر کیجیے۔
اُسی دن واپسی
میٹرو راستوں پر ہماری اڑانوں کا وقت
ایسا ہے کہ آپ اپنا کام ختم کر کے اسی دن
گھر واپس آ سکتے ہیں۔ سوچیے، ہوٹل
میں ٹھہرنے کے اخراجات میں کتنی بچت ہو گی!
دس نئے راستے
• بمبئی اور دہلی کے درمیان
روزانہ چھ براہِ راست اُڑانیں • بمبئی اور کلکتہ کے
درمیان روزانہ ۲ براہ راست اُڑانیں • بمبئی اور مدراس کے
درمیان روزانہ ۳ براہ راست اُڑانیں • بمبئی اور بنگلور کے درمیان روزانہ
۳ براہ راست اُڑانیں • بمبئی اور حیدرآباد کے درمیان روزانہ ۳ براہ راست
اُڑانیں • دہلی اور کلکتہ کے درمیان روزانہ ۲ براہ راست اڑانیں • دہلی اور
مدراس کے درمیان روزانہ ۲ براہ راست اڑانیں • دہلی اور حیدرآباد کے
درمیان روزانہ ۲ براہ راست اڑانیں • دہلی اور بنگلور کے درمیان روزانہ ۲ براہ
راست اُڑانیں • کلکتہ اور مدراس کے درمیان روزانہ ۲ اُڑانیں۔
• تمام اُڑانیں دونوں طرف سے ہیں۔
زیادہ سیٹیں
یہ آپ کی
ایرلائن ہے
इंडियन एयरलाइन्स
Indian Airlines



مَیں نے اپنی تصویروں کو بطورِ احتجاج اِس لئے ضائع کیا ہے کہ مَیں آرٹ کو 'تجارت' بنانے کے خلاف ہُوں

—— مقبول فدا حسین

• اِس سہ ماہی میں پینٹر حسین نے کئی 'خبریں' بنائیں۔ پہلی خبر تو انھوں نے یہ بنائی کہ وہ امجد علی خاں اور ذاکر علی کی جُگل بندی کو پینٹ کریں گے۔ دوسری خبر یہ بنائی کہ انھوں نے چھ دن میں بنائی چھ دیویوں کی تصویروں کو کلکتے میں واقع ٹاٹا سینٹر میں اخبار نویسوں اور آرٹ شیدائیوں کے سامنے آرٹ کو تجارت بنانے کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے ضائع کر دیا۔ تیسری خبر انھوں نے اس وقت بنائی جب انھوں نے صحافی اور شاعر پرتیش نندی کے اصرار پر اپنی پسند کے ہم عصر بارہ پینٹروں کے نام ترجیحی انداز میں گنوائے۔

• حسین کی ذات اور شخصیت سے جُڑی جب اس طرح کی خبریں میڈیا میں سُرخی بن کر گردش کرتی ہیں تو کافی دنوں تک آرٹ کے حلقوں میں اس پر تبصرے اور چہ میگوئیاں ہوتی رہتی ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ حسین کے اندر ابھی بھی کوئی شریر بچّہ موجود ہے جو انھیں اکثر ایسی باتوں کے لئے اُکساتا ہے، حالانکہ وہ اب ۷۷ برس کے ہو گئے ہیں۔ ان کی سفید داڑھی اور بال اور ان کا ننگے پیر رہنا اور ان کا رنگ برنگے کپڑے اور زیور پہننا افسانوی انداز میں مشہور رہے۔ وہ جہاں بھی جاتے ہیں پہچان لئے جاتے ہیں۔ ان کے آگے پیچھے آج بھی آٹوگراف لینے والے نظر آتے رہتے ہیں۔ وہ دُنیا بھر میں سفر کرتے رہتے ہیں۔ سرکاری اور غیر سرکاری سطح پر ان کی عزّت بھی ہے اور احترام بھی، تو پھر آخر وہ کیوں اپنے تعلّق سے خبریں بنانے کے عمل میں دلچسپی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ان کے بعض نقّادوں کا کہنا ہے کہ ان کے پاس پینٹ کرنے کے موضوعات ختم ہو رہے ہیں۔ حسین نے جو کچھ پینٹ کیا تھا اس میں دانش وری اور فنکارانہ خلّاقی بے پناہ تھی۔ گھوڑے کی علامت سے جب وہ عورت کو ایک علامت بنانے پر آئے تو انھوں نے ایک مرحلے پر اسے دیوی بنا دیا۔ مدر ٹریسا پر ان کی سیریز اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس بار بھی جب انھوں نے اپنی تصویروں کو ضائع کرنے کا فیصلہ کیا تو انھوں نے چھ دنوں تک پس منظر میں جاری موسیقی کے ساتھ بیک وقت چھ کینوس پر دُرگا، پاروتی، لکشمی، سرسوتی، کالی اور ابدی ماں کی تصویریں بنائیں۔ آخری دن اخبار نویسوں سے بات چیت کرتے ہوئے حسین نے اپنے مقاصد کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ وہ چاہتے تھے کہ ان کے تصویر بنانے کے عمل میں لوگ بھی شامل ہوں کیونکہ عموماً پینٹر اپنی تصویریں تنہائی میں بناتے ہیں۔ اس طرح لوگ تصویر کو تخلیق کے مختلف مرحلوں سے گذرتے ہوئے بھی دیکھ سکتے ہیں۔ اپنی ہی بنائی ہوئی

تصویروں کو سب کے سامنے ضائع کرنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے حسین نے وضاحت کی کہ ان کے خیال میں پینٹنگ کی تکمیل اس کی موت کا اعلان بھی ہوتی ہے۔ اصل سرخوشی تو تصویر بنانے میں پوشیدہ ہے جب تصویر کو منزل سمجھا جائے تو تخلیقی عمل کا کیا ہوگا؟ دیکھئے اللہ نے اپنے لئے کس قدر تخلیقی آزادی رکھی ہے وہ انسان کو پیدا کرکے FORM اور CONTENT کا ایک نیا تجربہ کرتا ہے اور جب اس کی یہ تخلیق مکمل ہونے لگتی ہے تو اسے شمشان گھاٹ یا قبر میں نابود کر دیتا ہے۔ تو اس طرح تخلیقی عمل کی سرخوشی کا اور سرشاری کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ جس دن دنیا میں موت کا خاتمہ ہوگا اسی دن تخلیقی عمل کی بھی موت ہو جائے گی۔ حسین نے تصویروں کو ضائع کرنے کی آخری وجہ بناتے ہوئے کہا کہ وہ اپنے اس عمل سے آرٹ کے تاجروں کے ہاتھوں آرٹ کو تجارت بنانے کے رویے کے خلاف احتجاج بھی کرنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ آرٹ ڈیلر ایک شارک مچھلی کی طرح آرٹ اور آرٹ کے نمونوں پر پوری طرح قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔

حسین نے اس موقعہ پر اپنے اس تاثر کا بھی اظہار کیا کہ آرٹ کے مغربی نقاد ہندوستانی مصوروں کے بارے میں بڑے تنگ نظر اور متعصب ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہم ہندوستانی پینٹر مغرب زدہ ہیں اور ان کے اسلوب اور رنگ آمیزیوں کی نقل کرتے ہیں۔ ایک بار ہیں نے نیپال کے مندروں کے مجسموں پر فلم بنائی تھی تو کچھ نقادوں نے یہ کہہ دیا کہ یہ تو پکاسو کے NUDES کی کاپی ہیں۔ حسین نے مغربی نقادوں کے بارے میں اس رویے کو بعض لوگوں نے یہ کہہ کر بے وزن بنانے کی کوشش کی ہے کیونکہ حسین کی تصویریں مغرب کی آرٹ گیلریوں میں توجہ کا مرکز نہیں بن پاتیں اس لئے وہ مغرب پر برس پڑتے ہیں۔

شاعر اور صحافی پرتیش نندی نے اب "سنڈے آبزرور" کی ادارت سنبھال لی ہے۔ وہ بھی خاصے مہم جو اور سنسنی خیزی میں یقین رکھنے والوں میں ہیں۔ حال ہی میں پرتیش نے حسین سے ایک ملاقات میں بے حد اصرار کرکے (بقول ان کے) ہم عصر پینٹروں کی ایک ترجیحی فہرست بنوائی اور اسے "سنڈے آبزرور" کے ایک پورے رنگ دار صفحے پر حسین اور ان بارہ آرٹسٹوں کی تصویروں اور ناموں کے ساتھ شائع کیا ہے۔ پرتیش نندی کے مطابق حسین ہمیشہ اس طرح کی فہرست بنانے سے کتراتے رہے ہیں اور یہ پہلا موقع ہے کہ انھوں نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ نئے پینٹروں میں کون قابل ذکر ہے۔ پرتیش نندی نے حسین کے حوالے سے جو ترجیحی فہرست شائع کی ہے وہ اس طرح ہے:

سومناتھ ہورے۔ جوگن چودھری۔ رام کمار۔ ارپتا سنگھ۔ گنیش پائنے۔ چترو وانو مزمدار۔ طیب مہتہ۔ بال چھابڑا۔ رنبیر کالیا۔ جے سوامی ناتھن۔ رامیشور بروٹا اور شمشاد حسین۔

حسین کی فہرست میں جو بارہ پینٹر شامل نہیں ان کے نام ہیں:

فرانسس نیوٹن سوزا۔ وی۔ ایس۔ گئی ٹونڈے۔ منجیت باوا۔ ویکاس بھٹا چاریہ۔ ایس۔ ایچ۔ رضا۔ انجلی ایلامینن۔ جہانگیر سباوالا۔ ستیش گجرال۔ این۔ ایس۔ بندرے۔ کے۔ کے۔ ہیبر۔ اکبر پدمسی۔ کے۔ جی۔ سبرامنیم

حسین چھ سال راجیہ سبھا کے ممبر رہنے کے بعد مئی میں آر کے نرائن اور امرتا پریتم اور روی شنکر کے ساتھ ایوان سے وداع ہو رہے ہیں۔ اس عرصے میں حسین نے ایک بار بھی ایوان میں لب کشائی نہیں کی۔ ان کا کہنا ہے کہ ان کی زبان کچھ اور ہے وہ رنگوں کی زبان میں بات کرتے ہیں چنانچہ انھوں نے راجیہ سبھا میں بیٹھ کر کئی SKETCHES بنائے ہیں اور بقول حسین وہی بولے ہوئے لفظ کے مترادف ہیں۔

تھیٹر



تخلیقی نوعیت کے ایسے ادارے کہ جہاں فنون کے مظاہرے کی تربیت دی جاتی ہے انہیں چلانے کے لیے مختلف النوع صلاحیتوں کے مالک افراد کی ضرورت ہوتی ہے۔ محض اس بنا پر کہ ایک آئی۔ اے۔ ایس افسر بہت اچھا منتظم ہے آپ اسے ڈرامہ اسکول چلانے کا کام نہیں سونپ سکتے۔ اگر آپ کے پاس تخلیقی نظر نہیں ہے تو پھر آپ کی انتظامی صلاحیت بھی کام نہ آسکے گی۔ اسی طرح اداکاری کی صلاحیت، پڑھانے کے لیے درکار صلاحیت سے مختلف ہوتی ہے۔

نیشنل اسکول آف ڈرامہ NSD کو چلانے میں جو غلطی سرزد ہوئی وہ یہ ہے کہ جو اچھے اداکار اور ہدایت کار تھے انہیں پڑھانے کا کام سونپ دیا گیا — نتیجہ انہوں نے مایوس اُستاد اور مایوس طلبا پیدا کیے۔ اگر آپ منوہر سنگھ کی صداکاری سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں تو اسے اسٹیج پر صداکاری کرتے ہوئے دیکھیے۔ اسے کلاس روم میں لے جانا درست نہیں۔ اس کے برخلاف اگر میری طرح   . جو ہدایت بھی دے سکتا ہے اور پڑھا بھی سکتا ہے جو اداکاری بھی کر سکتا ہے اور اس کی تعلیم بھی دے سکتا ہے جس کے پاس آواز بھی ہے اور صداکاری کے رموز بھی منکشف کر سکتا ہے ... ایسے تربیتی اداروں کے لیے بے حد مفید اور کارآمد ہو سکتا ہے۔

اگر آپ تھیٹر کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو آپ دیکھیں گے کہ تھیٹر کے فروغ کا سارا منظر نامہ ایسی ہی متنوع اور مضبوط شخصیتوں کے فیضان کا مرہون منت ہے۔ روس میں کنسٹنٹن استانسلاوسکی نے تیس برس تک شوقیہ تخلیقی تھیٹر کمپنی کی سربراہی کی جہاں اداکاری کی تربیت کا ایک منفرد طریقہ اختیار کیا گیا تھا۔ دراصل تھیٹر کمپنیاں ایسے مضبوط افراد کے سہارے ہی فروغ پاتی رہی ہیں جو مختلف صلاحیتوں اور افراد کی شیرازہ بندی کا ہنر جانتے رہیں۔

ابراہیم الفاضی ——

القاضی کی واپسی (۲)

● ہندی اور انگریزی تھیٹر میں جس ہدایت کار کا خاصا چرچا رہا ہے وہ ابراہیم القاضی ہیں. پچھلے دنوں جب القاضی نے پندرہ برس بعد نیشنل اسکول آف ڈرامہ کی ریپٹری کمپنی کے لیے تین ڈراموں کی ہدایت دینے پر اپنی آمادگی کا اظہار کیا تو اس خبر کو تھیٹر والوں نے اشتیاق اور حیرت کی ملی جلی کیفیتوں کے ساتھ سنا ہی. پریس نے بھی اسے آغاز ہوتے ہوئے سال کی اہم واردات کا نام دیا. القاضی کے بے شمار انٹرویو شایع کیے اور مختلف اختلافی سوالوں اور ان کے جوابات کو ہوا بھی دی. ذہن جدید کی گذارش پر القاضی نے کچھ ایسے سوالوں کے جواب دینے کے لیے وقت نکالا جو یا تو پوچھے ہی نہیں گئے تھے یا جن پر روشنی ڈالنے سے گریز کیا گیا. پیش ہے القاضی کے ساتھ بات چیت کی تفصیل۔ القاضی کے جوابات انگریزی میں تھے۔

● ابراہیم القاضی آپ نے تھیٹر کی دنیا سے پندرہ سال کی خود عائد کردہ علاحدگی کے بعد واپس لوٹ آنے کا فیصلہ کسی دباؤ میں کیا یا یہ تھیٹر کرنے کی وہ منہ زور خواہش تھی جس کے آگے آپ نے ہتھیار ڈال دیئے.

مجھے اس عرصے میں ایسا محسوس ہوا کہ میں اپنی ذمہ داری سے بچ نہیں سکتا. نیشنل اسکول آف ڈرامہ جس کی تشکیل اور استحکام میں میں نے اپنا حصہ اور کردار ادا کیا تھا. اس نے اپنے قیام کے دنوں سے ہندوستانی تھیٹر کو زندگی دینے کی پرخلوص کوشش کی. اس عرصے میں, میں بھی اس سے کافی عرصے تک وابستہ رہا میرے بعد چار یا پانچ ڈائریکٹر اور بھی آئے اور ان میں سے کوئی بھی دو سال سے زیادہ عرصے تک کسی نہ کسی وجہ سے ٹک نہیں سکا. اس عرصے میں تھیٹر کے نظام میں بہتری لانے کے خیال سے ایکسپرٹ کمیٹی کا قیام عمل میں لایا گیا اور اس نے ملک کے مختلف حصوں میں جاکر تھیٹر کی دنیا سے تعلق رکھنے والے اداکاروں, ہدایت کاروں سے تبادلہ خیال کیا. میں بھی ایکسپرٹ کمیٹی سے وابستہ رہا اور لوگوں سے رابطہ اور تعلق کا تجربہ مجھے بھی ہوا. اس عرصے میں یہ بات کھل کر سامنے آئی کہ این ایس ڈی نے اپنے قیام کے سالوں میں جو ترقی کی تھی وہ سب ان چودہ برسوں میں زوال پذیر رہی. لوگوں کے اس احساس اور اعتراف نے مجھے بھی ایک طرح کے جرم کا احساس دلایا یعنی یہ کہ مجھے اپنی اس عائد کردہ لاتعلقی کو ختم کر کے تھیٹر کی سیاست میں الجھے بغیر این ایس ڈی کی تھیٹر کی پیش کش کی سطح کو اوپر اٹھانے کے لیے جو بھی ممکن ہو کرنا چاہیئے. تو صورت حال ایسی ہوئی کہ گریش کرناڈ نے اپنے ڈرامے رکت کلیان کا مجھ سے ذکر کیا. میں نے گریش کا ڈرامہ 'تغلق' این ایس ڈی کی ریپٹری کمپنی کے لیے اسٹیج کیا تھا. اس کے ساتھ ہی شیکسپیئر کے ڈرامے جولیس سیزر کا ہندی روپ رام گوپال بجاج کے

پاس تھا تو اس طرح میرے لیے تھیٹر کرنے کی وجہ اور فضا موجود تھی۔ چونکہ ان دونوں ڈراموں میں عورتوں کے کردار کم تھے تو ریپرٹری کی FEMALE ARTISTS کو موقعہ دینے کے لیے لورکا کے ڈرامے کا "دن کے اندھیرے ہے" کے عنوان سے جتیندر کوشل نے ترجمہ کیا اور یوں ایک تسلسل میں تین ڈراموں کو اسٹیج کرنے موقع مل گیا۔

● ان تین ڈراموں میں این ایس ڈی کے ہی آرٹسٹ تھے۔ تو کیا ان سب میں اپنے کرداروں کے ساتھ انصاف کرنے کی صلاحیت تھی؟ اور کیا یہ سب آپ کی ہدایت کاری کے تقاضوں کو پورا کر پائے تھے۔

جی ہاں، قطعی طور سے، صلاحیتوں کی کمی نہیں ہے۔ شاید انہیں پوری طرح ابھر کر سامنے آنے کے مواقع میسر نہیں آئے اور شاید انہیں اس طرح استعمال نہیں کیا گیا جس کی وہ متقاضی یا مستحق تھیں۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ سب ہی نوجوان آرٹسٹ اپنے کاموں کے سلسلے میں بے حد پر خلوص ہیں۔ یقین کیجئے مجھے ان کے ساتھ شب و روز کام کرتے ہوئے بڑی خوشی ہوئی۔ صبح سے شام تک ہم نے ان تین ڈراموں کی پیش کش کے مختلف پہلوؤں پر محنت کی۔ دو ماہ کے قلیل عرصے میں ایسے بڑے ڈراموں کا اسٹیج کرنا دشوار مرحلہ تھا۔ لیکن ان آرٹسٹوں کی بدولت اس قلیل مدت میں یعنی دو ماہ میں تین پروڈکشن کرنا ممکن بن گیا۔ میرا تاثر یہ ہے کہ اگر ان آرٹسٹوں کے پاس مطلوبہ صلاحیت نہ ہوتی تو اس معیار کو پانا ممکن نہ تھا جو ان تینوں ڈراموں کو پیش کرتے ہوئے قایم ہو سکا۔ کسی بھی چیز کو بہتر بنانے کے امکانات تو ہمیشہ ہی رہتے ہیں۔ لیکن ایسا ایک لمبے عرصے کی محنت اور ریاضت سے ہی ممکن ہے۔ یورپ میں لندن اور نیویارک میں تھیٹر کرنے سے پہلے وہ اپنی پیش کش کو ملک کے اندرونی حصوں میں، مضافات میں لے جاتے ہیں جسے TRYOUT کہا جاتا ہے۔ وہاں لوگوں کا ردِ عمل دیکھتے ہیں چونکہ جب تک ڈرامہ مختلف دیکھنے والوں کے تبصرے اور ردِ عمل کی زد میں نہ آئے اس کے دیکھنے والوں کا حلقہ اور دائرہ پھیلے اور بڑھے نہیں تب تک ڈرامے کی پیش کش میں پختگی نہیں آپاتی اور یورپ میں اسے میٹرو پولیٹن شہروں میں اسٹیج نہیں کیا جاتا۔ یہ طریقہ کار اداکار، ہدایت کار اور دوسرے عناصر کے ساتھ آرٹسٹک INTER ACTION کو ممکن بناتا ہے جیسے سیٹ، لائٹ، کاسٹیوم، مومنٹ، اداکار کا مکالمہ یہ سب ہی ایک دوسرے سے مربوط ہو جاتے ہیں اور اس طرح پوری پیش کش ایک کل TOTALITY کی صورت میں سامنے آجاتی ہے۔

● آپ کے اس اعتراف کے بعد آپ سے منسوب پھر اس بات میں کتنا سچ رہ جاتا ہے کہ این ایس ڈی چودہ برسوں میں اچھے اداکار پیدا کرنے میں ناکام رہی اور اداکاری کی تربیت کا نظام ٹھیک نہیں رہا۔

میں ایسے بے سرو پا بیان نہیں دیتا۔ میں دلائل کے ساتھ بات کرتا ہوں۔ اب میں اپنے تجربے کی روشنی میں بات کرتا ہوں۔ میں جب ۱۹۴۸ میں لندن میں تین سال تک رائل اکاڈمی آف ڈرامٹک آرٹ RADA میں تھا۔ وہاں اداکاری کی تربیت دینے والا بے حد با صلاحیت اسٹاف تھا۔ یہاں میں نے بہت کچھ سیکھا اور یہ بھی سیکھا کہ جب میں اسی نوعیت کے اپنے کسی ادارے میں رہوں گا تو کن باتوں سے ادارے کو محفوظ رکھنے کی کوشش کروں گا۔ میں نے RADA کے علاوہ روسی، فرانسیسی اور امریکی تھیٹر کی بعض اہم شخصیتوں کے اثرات بھی قبول کیے اور ان کے کاموں کا مشاہدہ بھی کیا۔ ان مقامات پر تجرباتی تھیٹر نے نئے

ذہن جدید

خیالات، نئی زبان اور نئی صورتِ حال کو متعارف کرایا۔ یہ تھیٹر کمرشیل تھیٹر سے، لندن کے براڈ وے اور پیرس کے بورو الڈ کے تھیٹر سے مختلف تھا۔ اس تھیٹر نے دنیا کے کلاسک کو بھی نئی تخلیقی آنکھ سے دیکھا جس میں عصری رویوں کا عکس بھرپور تھا۔ میں نے اس تجرباتی تھیٹر کے ساتھ ساتھ ابسن، چیخوف کے تھیٹر کا بھی مطالعہ کیا کہ یہ تھیٹر ہندوستانی صورتِ حال میں موزوں ڈرامے لگتے ہیں۔ میں نے اس پورے سلسلے کا ذکر اس لیے کیا کہ آپ کو اندازہ ہو کہ جب آپ تھیٹر کے سلسلے میں بات کریں تو کن کن باتوں کو ذہن میں رکھنا ہوگا اور ہماری فکر اور سوچ کا دائرہ کس قدر پھیلا ہوا ہو۔ اس لیے جب ہم ایک اداکار کی تربیت کی بات کرتے ہیں تو اس کو محض باڈی، آواز یا پھر کسی مارشل آرٹ کی تربیت تک محدود نہیں ہونا چاہیے، دماغ احساس اور تخیل کی تربیت بھی تو ضروری ہے۔ تھیٹر کی تربیت میں کلاسک کا مطالعہ اور ان سے واقفیت بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ یہ کلاسک خواہ ہمارا اپنا ہو یا کسی دوسرے ملک کا، شیکسپیئر اور یونانی المیہ تو اب ہماری اپنی زندگی اور اس کا تجربہ بن چکے ہیں۔ تو یہ TOTALITY یہ آفاقی وژن ہے جس کی کمی کا احساس مجھے اپنے یہاں کے تربیتی نظام میں ہوتا رہا۔

تھیٹر کی تربیت میں کلاسک سے واقفیت بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے

میرے نزدیک 'بولنے' کی تربیت میں زبان اور اس کے پورے نظام سے واقفیت بھی ضروری ہے۔ ویسے تو ہم کثرت میں وحدت کا نعرہ لگاتے ہیں لیکن سچ یہ ہے کہ ہم ایک دوسرے کے کلچر، زبان اور اس کے کلاسک سے بڑی حد تک ناآشنا ہوتے ہیں۔ اس لیے میں نے اس بات پر ہمیشہ زور دیا کہ ایک آرٹسٹ کو اپنے کلچر سے واقف ہونا ہی چاہیے۔ یہ صورتِ حال اس کا تقاضا کرتی ہے کہ این ایس ڈی میں ایک ایسی لائبریری ہو جو اس ملک کے مختلف کلچر، زبان اور اس کے نئے پرانے ادب سے باخبری اور آگاہی دے سکے۔ یعنی آسامی آرٹسٹ کو اردو اور ہندی کے بارے میں مناسب معلومات اپنی زبان کے توسط سے میسر آنی چاہیے۔ تو آپ جو بھی تربیتی نظام اپنائیں وہ ایسا ہو کہ وہ ان کو واضح انداز میں سامنے لا سکے۔ دوسرے معنی میں علاقائیت کے مثبت احساس کے ساتھ ساتھ قومی اور آفاقی احساس اور وژن بھی پرورش پائے تب ہی تو آرٹسٹ کو اپنی جڑوں میں پیوست ہونے کا احساس رہے گا اور ساتھ ہی اس پوری کائنات کا ایک حصہ بنے کا احساس بھی زندہ رہے گا۔ آرٹسٹ کی تربیت میں اگر کمرشیل تھیٹر کی بات کی جاتی ہے اس کے نقاضوں کی بات کی جاتی ہے تو میں کہوں گا کہ کمرشیل تھیٹر ہے کہاں، بنگلہ علاقائی زبانوں میں ایسا تھیٹر نہیں ہے۔ تو پھر آپ تین سال کے تربیتی کورس کے ذریعے جو آرٹسٹ پیدا کر رہے ہیں وہ کس تھیٹر کے لیے ہے۔ میرے خیال میں تھیٹر تحریک کسی ایک شخص کے ذریعے ممکن نہیں کہ اس کے لیے سرکاری اعانت بھی ضروری ہے کیونکہ یہ ایک اجتماعی تحریک ہے۔ جس میں اداکار، ہدایت کار، موسیقار، ڈانسر، اسٹیج سٹنگ والے وغیرہ سب ہی ملوث ہوتے ہیں۔ میں نے تھیٹر کے آرٹسٹوں کا فلم اور ٹیلی وژن سے ربط قایم رکھنے کے سلسلے میں دس سال تک جدوجہد کی اور ان کی تربیت کو فلم انسٹی ٹیوٹ پونے سے جوڑا جس کے نتیجے میں نصیرالدین شاہ، اوم پوری، روہنی ہٹنگڑی، اینتا کنور جیسے آرٹسٹ تھیٹر سے فلم میں کامیابی سے داخل ہو سکے۔ لیکن اب اس ربط کو توڑ دیا گیا۔ این ایس ڈی اب پونے فلم انسٹی ٹیوٹ کا حصہ نہیں رہا۔

● کیا ہندی تھیٹر اپنے کسی ماضی سے جڑا ہے؟ اس میں کوئی تسلسل کا احساس آپ کو ہوتا ہے۔

جہاں تک ہندی تھیٹر کا تعلق ہے ہمیں جے شنکر پرشاد کی طرف لوٹنا پڑے گا۔ ایک وضاحت میں اپنی معلومات کے سہارے یہ بھی کردوں کہ ہندی تھیٹر میں تھیٹر کی وہ پرانی روایت اور اس کا تسلسل نہیں ہے جو ہمیں مراٹھی، بنگالی یا کسی حد تک اردو زبان میں ملتا ہے۔ ادھر یہ بات بھی ہوئی کہ جس طرح ہندی فلم نے اپنی ایک عام فہم زبان بنالی تھی وہ ہندی تھیٹر میں نہ آسکی۔ مثال کے طور پر موہن راکیش نے جب "اساڑھ کا ایک دن" ڈرامہ لکھا تو وہ سنسکرت زبان کی وجہ سے بوجھل اور مشکل ہو گیا تھا۔ میرے اصرار پر انہوں نے جب زبان کو عام فہم اور سہل کرتے ہوئے "آدھے ادھورے" لکھا تو وہی ڈرامہ زبان کے اعتبار سے، مثالی بن گیا۔ میرے خیال میں اگر ہندی تھیٹر موہن راکیش کے اسلوب کو اپناتا رہتا تو ہندی تھیٹر اور بھی ثروت مند ہوتا ادھر اور لوگ بھی آئے جیسے سریندر ورما اور ریلراج پنڈت جنہوں نے ہندی کے اچھے ڈرامے لکھے۔

اگر ہندی تھیٹر موہن راکیش کے اسلوب کو اپناتا رہتا تو ثروت مند رہتا

● آپ کا اس بات پر زور کیوں نہیں رہا کہ ہندی تھیٹر کو نئے اسکرپٹ ملتے رہیں۔

میں اتفاق نہیں کرتا۔ ادھر کئی نئے اسکرپٹ آئے، دھرم ویر بھارتی کا "اندھا یگ" بہت اچھا اسکرپٹ تھا۔ وہ اگر موہن راکیش کی طرح صحافت کو خیرآباد کہہ کر تھیٹر کے ہو جاتے تو ہندی تھیٹر کو وہ اور بھی اچھے اسکرپٹ دے سکتے تھے۔ اردو میں پارسی تھیٹر، آغا حشر کے ڈرامے اور پھر پرتھوی تھیٹر LIVING THEATER کے طور پر سامنے آیا۔ ان کے پاس اسکرپٹ تھے اور ڈرامہ نگار خود بھی ڈراموں میں حصہ لیتے تھے۔ میرے نزدیک تھیٹر گروپ اور ڈرامہ نگاروں کے درمیان ایک قریبی ربط بہت ضروری ہے۔ انگلینڈ میں ایک چھوٹا تھیٹر گروپ رائل کورٹ اس کی بہترین مثال پیش کرتا ہے۔

● کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ہمارے یہاں تھیٹر کلچر موجود ہے۔

ہاں، ہے، جب میں نے "اساڑھ کا ایک دن" اسٹیج کیا تو لوگوں نے کہا تھا کہ دلی پر اردو کلچر حاوی ہے یہ ڈرامہ سنسکرت آمیز ہے نہیں چلے گا۔ مگر لوگ اسے دیکھنے آئے اور اسے پسند کیا۔ اسی طرح "اندھا یگ" کے بارے میں تاثر تھا کہ یہ تو ریڈیو اسکرپٹ ہے مگر جب میں نے فیروز شاہ کوٹلہ کے بیک گراونڈ میں وہ ڈرامہ کیا تو اسے غیر معمولی کامیابی ملی۔ میں نے دلی کے پرانے آثاروں کو جب جب دیکھا تو مجھے لگا کہ ان کو تاریخی موضوعات کے ڈراموں کو کرنے کے لیے ایک اسٹیج کی صورت استعمال کی جانا چاہیئے، چنانچہ جب میں نے تغلق اور سلطان رضیہ کے لیے پرانا قلعہ کو ایک کھلے اور لمبے چوڑے اسٹیج کے طور پر استعمال کیا تو اس تجربے کو لوگوں نے بے حد پسند کیا لیکن این ایس ڈی سے میرے چلے جانے کے بعد اس اسلوب کو فراموش کر دیا گیا۔

● تھیٹر جو روایتی FORMS ہیں جیسے جاترا، تماشا، نوٹنکی، یکشن گان بھاوئی وغیرہ انہیں این ایس ڈی نے اپنانے کی کیوں کوشش نہیں کی۔

یہ صورت حال واقعی افسوس ناک ہے۔ ضرورت ہے کہ رنگ منچ کے ان پرانے اسالیب کو ذہن جدید

اپنایا جائے لیکن یہ تب ہی ہو سکتا ہے جب ان شیلیوں کا گہرائی اور تفصیل سے مطالعہ کیا جائے۔ میں ان اسالیب کو بھونڈے اور غیر مصدقہ انداز میں اپنانے کے حق میں نہیں ہوں کہ جس طرح فلم کے پردے پر ان اسالیب کو پیش کر دیا جاتا ہے۔ اس کے جو مستند اور مانے ہوئے فنکار رہے ہیں ان کے تعاون سے ان اسالیب میں تھیٹر کو پیش کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ نہ بھولیے کہ ان شیلیوں کو مقبول عام ہونے اور ایک کامیاب صورت اختیار کرنے میں ایک لمبا عرصہ لگا ہے آپ چند دنوں کی کاوش یا جدوجہد سے اسے ہو بہو یا اس کی نقل نہیں کر سکتے۔ آپ کو ان تمام شیلیوں کے آرکائیوز، ویڈیو فلم، کیسٹ سب کچھ بنانے ہوں گے۔ این ایس ڈی کے آرٹسٹوں کو سالوں کے وقفے کے ساتھ ساتھ ان مختلف اسالیب سے قریب لانے کا عمل اپنانا ہوگا۔ ان شیلیوں کے اصل آرٹسٹوں کو سماج میں اور خود اپنے نصابی نظام میں قابلِ عزت بنانا ہوگا۔ انہیں قدر کی نگاہ سے دیکھنا ہوگا تب ہی آپ ان سے کچھ لے پائیں گے۔

● تھیٹر سے وابستہ آرٹسٹ کی مالی ضرورتوں کے مسئلے کو آپ کس نظر سے دیکھتے ہیں۔

میں اس مسئلے کو تھیٹر کی بقا سے جڑا ہوا محسوس کرتا ہوں۔ اس سلسلے میں حکومت کو آگے آنا چاہیئے اور رعایتی مالی وسائل تھیٹر آرٹسٹ تک پہونچانے چاہئیں۔ یورپ میں تو بڑے پیمانے تھیٹر کو فراہم کی جاتی ہے۔ ہمارے ملک میں جو مختلف شہروں میں ریپرٹری کمپنیاں ہیں انہیں اگر رعایتی سرکاریں مالی وسائل اور رعایتیں فراہم کریں تو تھیٹر سرگرمیوں کے تسلسل کو یقینی بنائے رکھنے میں بے حد مدد ملے گی۔ اس سے وابستہ لوگ بھی اِدھر اُدھر مالی وسائل کے حصول کے لیے بھاگ دوڑ نہیں کریں گے۔ ہمارے ملک میں جو لوگ کلچر اور اس کے فروغ کی ذمہ داری سنبھالے ہوئے ہیں انہیں ایسا ویژن اپنانا چاہیئے۔ یہ ویژن اشفاق حسین، یوں کبیر جیسے لوگوں کے پاس تھا یا پھر پنڈت نہرو تھا جن کی ایما پر این ایس ڈی جیسے اداروں کا قیام عمل میں آیا تھا۔ پنڈت جی کے اسی ویژن کو اس وقت عملی جامہ پہنانے کی ضرورت ہے۔

● آپ کا یہ کہنے سے کیا مطلب ہے کہ ہم ایک CULTURAL DESERT میں رہ رہے ہیں۔

اس وقت کلچر کا بڑا غیر واضح تصور ہے۔ اس سلسلے میں ایک وسیع تصور اپنانے کی ضرورت ہے۔ ہمارا سارا کلچر سیاست کے زیر اثر ہے اور جب ایسی صورت حال ہو تو پھر اصل کلچر کہاں رہے گا میرے خیال میں پنڈت نہرو اور مولانا آزاد کے پاس ہندوستانی تہذیب کا واضح تصور تھا۔ بلکہ یوں کہیے کہ ان دونوں کا وجود، ان کی شخصیت ہی، کلچر کا احساس دلاتی تھی۔ وہ خود تہذیبوں کی علامت تھے۔ پنڈت نہرو نے فنونِ لطیفہ کے فروغ کے خیال سے مختلف اکاڈمیوں کو قایم کیا تاکہ پورے ملک میں کلچر سے متعلق سرگرمیوں کو بڑھاوا ملے۔ مگر بدقسمتی سے نہرو کا یہ خواب بکھر کے رہ گیا۔

● جی ہاں۔ یہ اکاڈمیاں تو اب فنون لطیفہ کا GRAVEYARD بن گئی ہیں۔

شاید پوری طرح ایسا نہیں۔ اصل میں یہ اکاڈمیاں صرف کلچر، یا فنونِ لطیفہ کے فروغ، ان کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی سے متعلق امور اور سرگرمیوں کے انتظام کو ڈھنگ سے چلانے کا کام کر سکتی ہیں۔

فرانس میں آرٹ کی سربلندی کا سہرا آندرے مالرو کو جاتا ہے

اور کلر نا بھی چاہیئے۔ ان سے کسی تخلیقی عمل کی توقع کرنا درست نہ ہوگا کہ اکاڈمیوں کا کام آرٹسٹ پیدا کرنا نہیں

ہے. فرانس میں اگر آرٹ اور آرٹسٹ کو سر بلندی حاصل ہوئی تو اس کا سہرا تمام تر آندرے مارلو کو جاتا ہے. اس کے برخلاف مارگریٹ تھیچر کے زمانے میں انگلینڈ واقعی کلچر کا قبرستان بن گیا تھا. ایسے حالات میں ذمہ داری بڑے فنکاروں پر آتی ہے جنہیں ہم اور آپ بلند قامت گردانتے ہیں مثلاً آپ ایم ایف حسین کو لے لیجئے. اگر حسین کے فن میں مسلسل ارتقاء یا عروج کا ہمیں احساس ہوتا رہے تو ہم کہتے ہیں کہ مصوری کی مجموعی صورت حال اچھی ہے لیکن اگر حسین اپنے فن اور اس کے خط کشیدہ معیار سے گرتے ہیں اور وہ غیر اہم اور بے معنی پینٹ کرنے لگتے ہیں تو ہم ان پر انگلی اٹھانے کے ساتھ ساتھ مصوری کے پورے منظر نامے کو زوال آمادہ گردانتے ہیں. گویا بڑے فنکاروں پر، ہم عصر آرٹ کے اہم ناموں پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ مصالحت سے گریز کریں. میرے خیال میں اہم فنکار ہمیشہ ہی کسی طرح کا سمجھوتہ کرنے سے انکار کرتا ہے وہ قطعی فن کی سطح پر مصالحت کو قبول نہیں کرتا. کسی دباؤ کے آگے نہیں جھکتا. میں سمجھتا ہوں کہ ہم عصر فنون لطیفہ کی دنیا سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے وجود اور شناخت کے لیے ایسا غیر مصالحتی رویہ اختیار کرنا ضروری ہے.

● تھیٹر کو فائیو اسٹار ہوٹلوں میں لے جانے والی کوششوں کو آپ کس نظر سے دیکھتے ہیں.

تھیٹر تو کئی طرح کے ہو سکتے ہیں. ہم آخر یہ کیوں فیصلہ کریں کہ تھیٹر کو کہاں ہونا چاہیئے اور کہاں نہ ہونا چاہیئے. تھیٹر کرنے کی جگہیں تو بہت سی رہی ہیں وہ مندروں، بازاروں، چوک اور چوراہوں، گلی کے نکڑ پر بھی ہوتا رہا ہے. رام لیلا کو نہ جانے کب سے کھلے میدانوں میں اسٹیج کیا جا رہا ہے ادھر سیاسی نظریات کی تبلیغ کی غرض سے اسٹریٹ تھیٹر بھی ہو رہا ہے. ایسی صورت میں ایک بند ہال میں گنی چنی AUDIENCE کے سامنے ہی تھیٹر کرنا تو سب کچھ نہیں ہے. اگر کوئی تھیٹر کو فائیو اسٹار کلچر کا حصہ بنانے کی کوشش کرتا ہے تو اس میں کیا مضائقہ ہے. میں اس خیال سے متفق نہیں ہوں کہ یہ کوشش تھیٹر کو IMPURE کرتی ہے. ہاں ایک بات اور فائیو اسٹار ہوٹل میں تھیٹر کی ہر طرح کی پیش کش ممکن نہیں. یعنی آپ وہاں المیہ نہیں کر سکتے. شیکسپیر کے ڈراموں کے لیے یا گریش کرناڈ کے ڈرامے ,,رکت کلیان،، کے لیے فائیو اسٹار ہوٹل کی فضا موزوں نہیں ہو سکتی. وہاں صرف آپ تفریح یا ہلکے پھلکے موضوعات کے بامزاج کے ڈرامے کر سکتے ہیں جو فائیو اسٹار کلچر کے دائرے میں قابل قبول تصور کیے جا سکیں.

● یک نفری تھیٹر کے بارے میں آپ کا کیا ردعمل ہے. اس طرح کی پیش کش میں اضافہ ہی ہو رہا ہے جیسے گدھا گان، غیر جنمے بچے کے نام یا نربھیک و دھرو ہنی.

پی. ایل دیش پانڈے، سوہاسنی مڈگاؤنکر نے ایک لمبے عرصے تک یک نفری مظاہرہ کر کے مہاراشٹر میں اپنی ایک AUDIENCE بنائی. دیش پانڈے کے یہ مظاہرے طنزیہ اور ان مسائل سے متعلق ہوتے تھے جو آس پاس کی زندگی سے جڑے ہوئے تھے. انہوں نے جتنے بھی کردار کیے ان سے دیکھنے والے فوراً مانوس ہو جاتے تھے. پی. ایل میں AUDIENCE کو کافی دیر تک بلکہ پیش کش کے آخر تک دیکھنے والوں کو اپنی گرفت میں رکھنے کی غیر معمولی صلاحیت تھی. اگر ایسا نہ ہو تو پھر SOLO پیش کش رائیگاں چلی جاتی ہے. میرے نزدیک ایسے SOLO یک نفری مظاہروں میں REPEAT VALUE بھی کم ہوتی ہے. بجز اس کے فنکار اپنے دیکھنے والوں سے بے حد قریبی تعلق نہ استوار کر لے. SOLO تھیٹر کی ایک اور وجہ مالی وسائل کی کمی بھی ہوتی ہے. یہ مظاہرہ

بڑی حد تک میوزک کے SOLO مظاہروں جیسا ہی ہوتا ہے۔

● تھیٹر اور سماجی بیداری کے تصور کے بارے میں آپ کہنا پسند کریں گے۔

میں تھیٹر کی سماجی معنویت کا قائل ہوں کہ اگر کسی ڈرامے میں سماجی حقیقت نگاری اور مسائل نہیں ہیں تو دیکھنے والا خود کو اس تھیٹر میں ABSORB ہوتا محسوس نہیں کرے گا۔ جب ہم تھیٹر میں سماجی شعور کی بات کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ ڈرامہ پوری طرح سیاست زدہ ہو یا اس میں کسی قسم کی سیاسی نعرہ بازی ہو یا مینی فیسٹو ہو۔ ڈرامے کو صرف انسان، اس کے معاشرے اور اس سے جڑے مسائل کو سامنے رکھنا چاہیئے، اور اسے المیہ، طربیہ، طنزیہ، مزاحیہ مختلف صورتوں میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ بنیادی بات یہ ہے کہ ڈرامے کے کرداروں میں اور دیکھنے والوں کی زندگی میں نظر آنے والے کرداروں میں کوئی مماثلت یا مشابہت کا ہونا ضروری ہے۔

● آپ کو شاعری سنانے RECITE کا ہنر بھی خوب آتا ہے۔ ایلیٹ کی نظم ویسٹ لینڈ اور فور کوارٹرس وغیرہ کو بڑے خوبصورت اور ڈرامائی انداز میں سنایا گیا ہے لگتا ہے کہ تھیٹر اس کے مقابلے میں آپ کے نزدیک اولین حیثیت رکھتا ہے

دلی میں میرا قیام میری زندگی کا بہترین حصہ ہے

نہیں ایسا نہیں۔ میری تو یہ کوشش تھی کہ ہندوستان کی سب ہی علاقائی زبانوں کی شاعری سنانے کو این ایس ڈی کے نصاب کا حصہ بنایا جائے۔ میرے نزدیک این ایس ڈی کے ہر طالب علم کو اپنی علاقائی زبان کی شاعری سے اچھی خاصی واقفیت ضروری تھی۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ ایکئے اور روا تساتن کی شاعری کسی بھی طرح اپنے شعری آہنگ اور معنوی تنوع کے اعتبار سے مغرب کی شاعری کے نمونوں سے کم نہیں تھی۔ یہی صورت حال مجھے مراٹھی بنگالی، پنجابی اور اردو جیسی زبانوں کے شعری سرمائے اور ادب کے بارے میں بھی محسوس ہوئی۔ اس لیے میں اس سلسلے میں بے حد پر جوش تھا کہ این ایس ڈی کے طلبا شاعری سنانے پر بھی اس کی ڈرامائی قرأت میں بھی ویسی ہی دلچسپی لیں جیسی وہ اداکاری یا پھر دوسرے پہلوؤں میں لیتے ہیں۔ میں یہ بھی چاہتا تھا کہ وہ علاقائی زبانوں کے اہم شاعروں کے ساتھ بیٹھ کر ان سے INTERACTION کریں اور ان شعری حصوں پر لب ولہجے کے اعتبار سے قدرت حاصل کریں جنہیں سنانا RECITE کرنا مقصود ہوتا کہ وہ اس طرح خود 'PART OF A LIVING CULTURAL SCENE بنا سکیں سوائے رگھو ویر سہائے کے ساتھ کچھ نظموں کو اسٹیج کرنے کے یہ سلسلہ آگے نہیں بڑھایا گیا۔

● آپ کی زندگی کا وہ کون سا حصہ ہے جو اتفاقی کا اپنا تھا۔

(ہنسی) یقینی طور سے دلی کے قیام کو میں اپنی زندگی کا وہ حصہ تصور کرتا ہوں جو میرا من پسند یا میرا اپنا تھا ۱۹۶۲ سے ۱۹۷۷ تک کا عرصہ میری زندگی کا RICHEST PERIOD تھا۔ یہی وہ عرصہ تھا جب پہلی بار مجھے ہندوستانی تہذیب وثقافت کی VITALITY کا ادراک ہوا تھا۔ اس عرصے میں میں نے تھیٹر کی دنیا میں خاصے تجربے کیے اور اس میڈیم کو کھنگالنے کا جتن بھی کیا۔

"رکت کلیان" میں نشری ولبھ ویاس اور رُوی کھنیکر





"جب شہر ہمارا سوتا ہے" میں جوہی ڈوگرہ اور پیوش مشرا



"کالی کُسلا" میں وی ایم بڈولا اور ترنم احمد (درمیان میں) "دن کے اندھیرے میں" زہرہ سہگل اور دوسرے فنکار۔

ادارہ

اس سہ ماہی کے ڈرامے

دن کے اندھیرے

• فیڈریگو گارسیا لورکا

• ترجمہ ——— جے۔ این۔ کوشل

• ہدایت ——— ابراہیم القاضی



زہرہ سہگل

پچھلے دنوں القاضی کی ہدایت میں جو تین ڈرامے نیشنل اسکول آف ڈرامہ کی ریپرٹری کمپنی نے اسٹیج کئے ان میں لورکا ڈرامہ 'دن کے اندھیرے' سب سے کامیاب ڈرامہ تھا، کوشل نے لورکا کے ڈرامے کو اتر پردیش کے ترائی کے علاقے میں بسے ایک مسلم گھرانے سے IDENTIFY کیا۔ ۱۹۵۰ کے آس پاس کا یہ مسلم گھرانہ اپنی اقدار اور روایتوں کی بڑی سخت گیری کے ساتھ پاسداری کرتا ہے۔ گھر کے سربراہ خان ذوالفقار خاں کا انتقال ہو گیا ہے۔ اور اُن کی بیوہ قدسیہ بیگم اپنی پانچ جوان لڑکیوں کے ساتھ مرنے والے کا سوگ مناتی ہیں، بیگم قدسیہ اصولوں کی پابند، روایت کی اسیر اور باپ دادا کے نام و ناموس کو ہر طرح کا تحفظ دینے کا جتن کرتی ہیں۔ اور اپنی لڑکیوں کو حکم دیتی ہیں کہ وہ ایک سال تک خاندانی روایت کے مطابق اپنے مرحوم والد کا سوگ منائیں گی، لڑکیاں آن بان والی ماں کی ہدایتوں کو گرہ میں باندھ لیتی ہیں اور باہر کی طرف کھلنے والی ہر کھڑکی بند کر دی جاتی ہے، ماں کی چشمِ نگہدار لڑکیوں سے ہر پل اُن کی ٹھنڈی گرم سانسوں کا حساب مانگتی رہتی ہے۔ لڑکیاں حبس اور گھٹن کی وجہ سے ایک دوسرے سے اکثر الجھ پڑتی ہیں۔ بڑی بہن فاطمہ کا نورالدین میاں کے ساتھ بیاہ کی سلسلہ جنبانی کا پتہ جب چھوٹی بہن عائشہ کو چلتا ہے تو وہ چونک اٹھتی ہے کہ وہ تو نورالدین کو اُن جانے میں چاہنے لگی تھی بہنوں میں رُقابتوں کی آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ جو آمنا سامنا ہونے پر شعلہ کی طرح لپک اٹھتی ہے، قدسیہ بیگم کے گھر کے سارے بھید جاننے والی خادمہ زینب بُوا عائشہ کو نورالدین میاں سے دور رہنے کی ترغیب دیتی ہے۔ مگر بے اثر۔ ایک دن پتہ چلتا ہے کہ نورالدین میاں آدھی رات کے بعد دوبارہ قدسیہ بیگم کی حویلی کے آس پاس دیکھے گئے، باہر گلی میں شور مچتا ہے، پتہ چلتا ہے کہ پڑوس کی ایک کنواری لڑکی نے اپنے نوزائیدہ کو مار دیا ہے، سب لوگ اسے موت کی سزا دینے کی مانگ کرتے ہیں، لیکن عائشہ اسے دُرگذر کرنے کی وکالت کرتی ہے۔ ایک رات

ایک عزیزہ کی رات کے کھانے پر دعوت کے موقع پر اچانک ایک گرمائے ہوئے منہ زور گھوڑے کی دُلتیاں پھینکنے کی آواز آتی ہے، قدسیہ بیگم گھوڑے کو کھلے میں چھوڑنے کی ہدایت کرتی ہیں، اور جب مہمان عزیزہ رخصت ہو جاتی ہے تو وہ فاطمہ سے بیاہ کے بارے میں بات کرتی ہے۔

ادھر خادمہ زینب کسی اَن ہونی کا اشارہ کرتی ہے مگر قدسیہ بیگم اُس کی وارننگ کو ٹال جاتی ہے عائشہ اسی رات اندھیرے میں نکل کر نورالدین میاں سے ملنے چلی جاتی ہے، اس کی ایک بہن اسے روکتی ہے مگر وہ پرواہ نہیں کرتی اور اندھیرے میں باہر نکل جاتی ہے۔ قدسیہ بیگم کو اسکی اطلاع ملتی ہے۔ گولی چلنے کی آواز آتی ہے۔ اور نورالدین میاں ڈھیر ہو جاتے ہیں، عائشہ کے لئے یہ صدمہ ناقابل برداشت ہے۔ اور وہ اپنے کمرے کو بند کر کے خودکشی کر لیتی ہے، بیگم قدسیہ عائشہ کی موت سے خود کو لمحے کے لئے بے جان ہوتی ہوئی محسوس کرتی ہیں، مگر دوسرے ہی لمحے ایک مضبوط عورت کے روپ میں اپنے خول میں واپس لوٹ آتی ہیں۔

• زُہرہ سہگل نے بڑے ٹھسّے سے اپنا رول نبھایا۔

کوشل نے تین ایکٹ والے لورکا کے ڈرامے THE HOUSE OF BERNARDA ALBA کی توانائی کو نہ صرف اپنے ترجمے میں برقرار رکھا، اس کی تہہ داریوں کو کاٹ دار، تیکھے اور تیز مکالموں سے زیادہ موثر بنایا۔ القاضی اسٹیج کی آن بان اور زیبائش اور پُرشکوہ ہونے کے بڑے قائل ہیں، انھوں نے دن کے اندھیرے، کے سیٹ کو بھی کہانی سے مشابہ رکھنے کی کامیاب کوشش کی۔ ہندوستانی اسٹیج کی مشہور اداکارہ زہرہ سہگل (۸۱ سال) نے اس ڈرامے میں قدسیہ بیگم کا مرکزی کردار، بڑے اعتماد اور ٹھسّے کے ساتھ ادا کیا، پیرانہ سالی نے نہ اُن کی زبان میں کوئی جھول ڈالا ہے، اور نہ ہی اُن کی اداکاری کی صلاحیتوں کو دھندلا دیا ہے، تعجب ہوا کہ وہ ایک بار بھی نہ لڑکھڑائیں، اور نہ ہی انھوں نے کوئی بھول چوک کی۔ وہ اس عمر میں بھی ناظرین کو اپنی اداکاری اور اس کی ساحری میں اسیر رکھنے میں کامیاب رہیں۔ اس ڈرامے کا دوسرا اہم کردار خادمہ زینب کا تھا، جسے ہیما سنگھ نے بڑے موثر انداز میں نبھایا۔ اس پورے ڈرامے میں قدسیہ بیگم کی اسّی سالہ ماں جہاں آرا (انکا امین) دوبار اسٹیج کے عقب سے داخل ہوتی ہے اور دونوں ہی بار وہ کسی جوان، بانکے اور کٹیلے گبرو سے بیاہ کرنے اور جنسی اختلاط کی لذتوں کو پانے کا پاگل پن کے انداز میں اظہار کرتی ہے، شاید اس بوڑھے کردار کی یہ جنسی گھٹن اور ایک جوان جسم کی چاہت اُن پانچ کنواری لڑکیوں کے اندر پلنے والی منہ زور جنسی بے چینی کی علامت تھی، مگر یہ کردار تاثر نہیں دے سکا، اور ایک پیوند سے زیادہ کچھ اور نہ معلوم ہو سکا، القاضی اس طرح کے تھیم کے لو بھی رہے ہیں۔ انھوں نے این، ایس، ڈی کے فنکاروں سے بہت بہتر کام لیا اور ڈرامہ دیکھتے ہوئے یہ تاثر تو بہرحال قائم ہوتا تھا۔ کہ القاضی نے اس ڈرامے کی FEMALE آرٹسٹوں سے ان کی بہترین صلاحیتوں کے مطابق کام لیا ہے۔

دلچسپ بات یہ تھی کہ ڈرامہ ختم ہونے کے بعد بھی اپنے تاثر سے نکلنے نہیں دیتا، اسے القاضی کی ڈرامائی شخصیت کا جادو کہئے کہ ان کے ڈراموں کو دیکھنے کے لئے تھیٹر کے شائقین کی ایک بھیڑ اُمڈ پڑی تھی۔

رکت کلیان

• گریش کرناڈ
• ترجمہ رام گوپال بجاج
• ہدایت ابراہیم القاضی

گریش کرناڈ کے کنڑ ڈرامے "تلے دنڈ" کا یہ ہندی روپ تھا جسے این ایس ڈی کے رام گوپال بجاج نے انگریزی اسکرپٹ سے ہندی میں ترجمہ کیا تھا۔ یہ انگریزی اسکرپٹ بھی گریش کرناڈ کا لکھا ہوا تھا۔ اس سے قبل القاضی نے گریش کے ڈرامہ تغلق کی ۱۹۷۳ میں ہدایت دی تھی۔ ۱۵ منظروں میں بٹا ہوا اور بے شمار کرداروں کا حامل یہ ڈرامہ دراصل سیاسی اقتدار کا حصول، سماجی اصلاحات روحانی طہارتوں کو پانے سے متعلق تھا۔ ڈرامہ، شاعر، سنت اور روحانیت سے سرشار کنڑ کے شاعر باسونا کی زندگی سے متعلق ہے جو کنڑ تاریخ کا ایک ایسا کردار تھا۔ جو ۱۱۰۶ء میں پیدا ہوا اور ۱۱۶۷ء میں وفات پا گیا۔ ڈرامے کا مرکزی کردار باسونا ہے اس کے علاوہ دو اور اہم کردار ہیں، راجہ بجالا اور جگدیو، باسونا راجہ کا وزیر خزانہ ہے۔ ریاست میں اس کے عقیدت مند کافی ہیں۔ راجہ باسونا کو کافی مانتا ہے کہ باسونا ایمان دار بھی ہے۔ اور راجہ کا وفادار مشیر بھی۔ راجہ کا بیٹا اور درباری پروہت راجا اور باسونا کے ربط و تعلق کو پسند نہیں کرتے۔ ادھر باسونا ایک ایسے فرقے کی روحانی رہنمائی کرتا ہے جو ذات پات اور نسل سے ماورا ہو کر سوچتا ہے۔ اور قادر مطلق کے تصور میں یقین رکھتا ہے۔ ایک برہمن زادے کی جب ایک چمار کے لڑکے سے شادی کا معاملہ درپیش ہوتا ہے تو یہ بالآخر راجہ کے خلاف درباری برہمن لابی اور اعلیٰ طبقے کی جیت اور راجہ کی بیٹے کے ہاتھوں برطرفی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ ادھر باسونا کا اسکے پیروکاروں میں اثر رسوخ کم ہو جاتا ہے۔ پورے راج میں سماجی برابری کے خلاف طوفان اُٹھ جانے کے خوف سے برہمن لڑکی اور چمار لڑکی کے والدین کو ختم کر دینے کی سازشیں ہوتی ہیں۔ راجہ بھی ہلاک کئے جانے کی زد میں ہے۔ لیکن وہ شیشوُ سے اپنی عقیدت کے سہارے بچ جاتا ہے۔ لیکن بالآخر جگ دیو کے ہاتھوں مارا جاتا ہے۔ جو خود بھی خودکشی کر لیتا ہے۔ اور آخر میں راجہ کا بیٹا جو اقتدار کی ہوس میں اپنے باپ کا دشمن ہو گیا تھا۔ اقتدار سنبھالنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

ڈرامہ بکھر گیا



گریش

گریش کرناڈ کے حال ہی میں اسٹیج ہوئے ڈرامے 'ناگ منڈل' کے بعد اس ڈرامہ سیزن میں کھیلا جانے والا یہ اُن کا دوسرا ڈرامہ تھا۔ ڈرامے کا بنیادی خیال سماجی مساوات اور ایسے معاشرے کی تشکیل کو یقینی بنانے سے تعلق رکھتا ہے، جہاں ذات پات، رنگ، نسل اور اس طرح کے دوسرے تعصبات انسانی رشتوں کو دائمی شکل دینے کی راہ میں حائل نہ ہوں، لیکن سیاست داں سماجی نابرابری، بھید بھاؤ کو برقرار رکھنے میں اپنے وجود کو بے خطر سمجھتا ہے۔ اس لئے وہ سازش کرتا ہے اقتدار کی رسہ کشی

SHIV

کو طول دیتا ہے، روحانی اقدار کو بے معنیٰ بنانے کی کوشش کرتا ہے اور بالآخر کامیاب ہو جاتا ہے، باسٹونا دوراندیشی، سماجی انصاف اور روحانی طہارت کی علامت تو ہے۔ مگر وہ سماج میں اپنی جڑوں کو مضبوط نہیں کر پاتا۔

القاضی نے مرکزی خیال کی ترسیل کرنے کی کوشش تو کی مگر پورا ڈرامہ بکھرا بکھرا لگا۔ اس ڈرامے سے امید تھی کہ تھیٹر کی نئی ذہانتوں کو تیکنیک، اسلوب اور پیش کش کے اعتبار سے کچھ دیگا، اس اعتبار سے ڈرامہ زیادہ کچھ نہیں دے سکا، لیکن مجموعی طور پر یہ کسی حد تک گوندھا ہوا لگتا تھا، راجہ بجالا کے طور پر شری ولبھ ویاس، جگ دیو کے روپ میں سنیل کمار اور باسٹونا کے روپ میں روی کھنیلکر کی اداکاری بے حد جاندار اور اثر آفریں تھی۔ شری ولبھ ویاس نے اپنی آواز اور پر وقار حرکات و سکنات سے اپنے کردار کی گرفت کو بنائے رکھا۔

• البرٹ کامیو

کالی گُلا

• ترجمہ ــــ شرد چندر
• ہدایت ــــ اروِن لگریجہ

دلّی کے مقبول ڈرامہ گروپ رُوچیکا نے اپنی بیسویں سالگرہ مناتے ہوئے تین مشہور ڈراموں کو وقفے وقفے سے اسٹیج کرنے کا اعلان کیا ہے۔ ان میں پہلا البرٹ کامیو کا ڈرامہ CALIGULA تھا جو تین دن دلی کے سری رام سینٹر میں کھیلا گیا۔ باقی ڈرامے جو اپریل مئی میں اسٹیج کئے جائیں گے وہ سوفوکلیس کا راجہ اوڈی پس اور ژاں انوہل کا اینٹی گون ہے۔

روچیکا کے اہتمام میں اسٹیج ہونے والے ان تینوں ڈراموں کی ہدایت اروِن لگریجہ کے ذمے ہے، اروِن نے یونانی اور رومن پس منظر میں لکھے گئے ان ڈراموں کو اسٹیج کرنے کی تاویل دیتے ہوئے کہا کہ ان ڈراموں کو اسٹیج کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ان میں انسان، اس کی عظمت اور باضمیری کو ایک وسیع تر مفہوم میں پیش کیا گیا ہے۔ اروِن لگریجہ نے کالی گُلا پر مبنی فلم کا LOGO اسٹیج کے عقبی پردے پر بڑے بڑے معنیٰ خیز انداز میں آویزاں کیا تھا۔ کامیو نے روم کے بے لگام شہنشاہ کالی گُلا کی لامحدود آزادی حاصل کرنے کی شدید خواہش اور اپنی اس خواہش کی تکمیل کی خاطر اپنے درباریوں، صلاح کاروں اور روم کے عوام پر طرح طرح کے ظلم و ستم کرنے کے پاگل پن کو بے حد کاٹ دار انداز میں بیان کیا ہے، کامیو چونکہ زندگی کی لایعنیت میں یقین رکھتا تھا اور موت کے سلسلے میں اُس کا رویہ ہمدردانہ تھا۔ اس لئے اس پورے ڈرامے میں وہ اپنی فلسفیانہ سوچ کے سہارے معاشرے میں انسان کی بے بسی اور اس پر موت کی برتری کا قصیدہ خواں ہے۔ ڈرامے میں وہ حصہ کامیو کے موت سے متعلق سوچ کو واضح کرتا ہے۔ جب کالی گُلا اپنے درباریوں کو ایک منٹ کے وقفے میں موت کے موضوع پر فی البدیہہ نظم لکھنے اور سنانے کی ایک طرح سے سزا ہی دیتا ہے۔ کالی گُسلا کے ظلم و ستم کے خلاف اندر ہی اندر دلوں میں اور دماغوں میں پلتی ہوئی بغاوت کو ہدایت کار نے بڑے موثر انداز میں ڈرامہ کے ناظرین تک پہونچانے کی کوشش کی ہے۔ آخر میں جب کالی گُسلا کے ظلم کرنے کی آزادی بے حساب اور بے دریغ ہونے لگتی ہے

تو اس کی زندگی کو ختم کرنے کی تحریک پھوٹ پڑتی ہے۔ مختلف سمتوں سے کالی کُسلا پر ہونے والے وار اسے بے دم ہونے نہیں دیتے کہ شاہی آمریت کا خاتمہ اتنا آسان نہیں کالی کُسلا ایک جھٹکے میں بے دم ہو جاتا ہے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے وہ کراہتا ہوا کھڑا ہو جاتا ہے اور اعلان کرتا ہے میں زندہ ہوں، دیکھو میں زندہ ہوں میں مرا نہیں۔

اردن لگریجہ کو ڈر یہ تھا کہ القاضی کے تین ڈراموں کے تازہ تازہ کامیاب پروڈکشن کے بعد نہ جانے تھیٹر کے ناظرین ان کی اِس پیش کش کو پسند بھی کریں گے یا نہیں۔ لیکن ہوا یہ کہ ناظرین نے کالی کُسلا کو سراہا۔ کالی کُسلا کے مرکزی کردار میں وی۔ ایم بڈولا کی اداکاری بے حد منجھی ہوئی اور پُر اعتماد تھی۔ بڈولا نے آہستہ آہستہ اپنی باڈی اور آواز کے RANGE کو بڑی مہارت اور پختگی کے ساتھ استعمال کیا۔ شروع شروع میں ان کی اداکاری سمٹی سمٹی سی لگی تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ وہ پورے ڈرامے پر حاوی ہو گئے۔ سنجیدہ لمحوں کے ساتھ ساتھ طنز و مزاح کے ٹکڑے بھی انھوں نے آواز اور باڈی لینگویج کے سہارے بڑی خوبی سے نبھائے اس کے علاوہ CAESONIA کے روپ میں ترنم احمد کی اداکاری میں جو ٹھہراؤ اور دھیماپن تھا وہ متاثر کرنے والا تھا۔ کئی مناظر کالی کُسلا اور کسوینا کے درمیان ایسے تھے جو اسٹیج INHIBITIONS کو پوری طرح توڑنے اور رد کرنے والے تھے کالی کُسلا کا ایک اور اثر آفریں پہلو اسکی روشنی تھی جسے آر کے ڈھینگرہ نے بے حد تخلیقی انداز میں استعمال کیا تھا۔ اسٹیج تکنیک میں روشنی بھی منظر کو اثر آفریں بنانے میں بڑا اہم کردار ادا کرتی ہے۔ کالی کُسلا میں ڈھینگرہ نے روشنی کو ہلکے گہرے، زرد، مدھم، روشن اور تیز دائروں کے ساتھ استعمال کر کے ڈرامے کے تاثر کو تہہ دار بھی بنایا اور اس کو تنوع بھی بخشا۔

جب شہر ہمارا سوتا ہے • تحریر پیوش مشرا

• ہدایت —— این، کے شرما



"ایکٹ۔ وَن" دلی میں ایک نیا ڈرامہ گروپ ہے اس گروپ نے اس سے پہلے نیٹو اور ہولی جیسے مقبول ڈرامے اسٹیج کئے ہیں۔ اس بار ایکٹ۔ وَن نے براڈوے تھیٹر کا مقبول میوزیکل WEST SIDE STORY اسٹیج کرنے کا فیصلہ کیا WEST SIDE STORY نے ماضی میں اتنی دھوم مچائی ہے۔ اسے اس قدر انعام ملے ہیں کہ کسی گروپ کا اسے ہندی میں پیش کرنے کا فیصلہ خاصا آزمائش اور جرأت کا حامل ہے۔ اصل پیش کش میں، دو گروہوں کے درمیان جو ٹکراؤ اور تصادم تھا۔ وہ ہندی روپ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے دو نوجوان گروپوں کے درمیان ہے جو کریم پورہ نامی ایک علاقے میں اپنی برتری اور تسلط جمانے کے لئے ایک دوسرے سے ہر آن ٹکر لیتے رہتے ہیں۔ کسی بھی خون خرابے کی نوبت آنے سے پہلے وہاں پولس پہنچ جاتی ہے۔ اور چنگاری ہر بار شعلہ بننے سے رہ جاتی ہے۔ اسی بیچ مسلم گروہ کے سرغنے اسلم (پیوش مشرا) کی بہن ہندو نوجوانوں کے گروہ کے سرغنے ولاس (گجراج راؤ) کے ایک صلح جُو ساتھی آبھاس سے ایک ملاقات کے بعد عشق کرنے لگتی ہے

ایک بار جب یہ دونوں گروہ فیصلہ کن ٹکراؤ کے لئے ایک دوسرے پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ تو آبھاس کے ہاتھوں اسلم کا قتل ہو جاتا ہے۔ اسلم کی بہن ترنم (جوہی ڈوگرہ) کو اس خبر سے بے حد صدمہ پہونچتا ہے۔ اور وہ آبھاس سے جذباتی سطح پر دور ہو جاتی ہے اسی بیچ ترنم کا ایک کزن اسلم کے خون کا بدلہ لینے کے لئے آبھاس پر جب وار کرتا ہے تو ترنم اسے بچانے کے لئے آگے آجاتی ہے۔ اور یوں رومیو اور جیولیٹ والی کہانی کے انداز میں ڈرامہ ختم ہو جاتا ہے۔

ڈرامے میں چھوٹے چھوٹے منظر ہیں اور تھوڑے تھوڑے وقفے سے سین کے تبدیل ہونے سے ڈرامے کے تسلسل CONTINUITY کو خاصا دھکا لگتا ہے، ڈرامے کے TENSE تناؤ کو کم کرنے کے لئے پیوش مشرا کے گیت کافی اچھے ہیں، جو تیز گستی کے ساتھ ڈرامے کے تھیم کو معنوی تہہ داری دیتے ہیں۔ دراصل یہ ڈرامہ فرقہ وارانہ تصادم اور اس کے ہاتھوں ہونے والی تباہی سے زیادہ آج کے نوجوان میں پائے جانے والے غصے، نا امیدی، اور سماج میں اپنی UTILITY کے نہ ہونے سے زیادہ تعلق رکھتا ہے۔ اسٹیج پر بھیڑ CROWD کبھی کھلتا ہے اور کبھی RELEVENT معلوم ہوتا ہے۔ اسلم اور رولاس کے کردار میں پیوش مشرا اور رنجراج راؤ کی اداکاری نوجوانوں کے غصے اور احتجاج اور اُبال کو موثر انداز میں ظاہر کرتی ہے۔ ترنم اور آبھاس کے درمیان جذبے اور احساس کی سطح پر ربط اور تعلق ہی دراصل رواداری اور ایک دوسرے کو تسلیم کرنے، قبول کرنے کا استعارہ ہے۔ ڈرامہ نگار نے مسئلے کی گہرائی تک جانے کی کوشش کی ہے، اقلیتی فرقے کے اندر پائے جانے والے اضطراب۔ خوف، ناانصافی اور عدم تحفظ کے احساس کو اسلم کے مکالموں میں مختلف صورتوں میں جگہ دی ہے۔ مجموعی طور پر یہ ایک خوشگوار میوزیکل پیش کش تھی۔ جو اس سہ ماہی میں تھیٹر والوں کے نزدیک قابل تذکرہ تھی۔

قطرہ قطرہ ....

اس سہ ماہی میں جن ادیب دوستوں نے ذہن جدید کی سالانہ سرپرستی قبول فرمائی۔ ان کے ہم بے حد ممنون ہیں۔ ابھی اس سلسلے کو اور طویل ہونا ہے

اقبال مسعود، گلزار (بمبئی) بلراج کومل، کرشن موہن، کنور سین، پرکاش تیواری
جنیت پرمار، فیاض رفعت، ناصرہ شرما، منظر بھوپالی، ریاض لطیف،
راشد آذر، راحت اندوری، یوسف عارفی، عبدالقادر ادیب، مظفر مجاز
تاج مہجور، مصحف اقبال توصیفی، حسن جمال، اظہار عثمانی، سطوت زہرا سطوت
عرفان زیدی، کے سی کیشپ، ڈاکٹر رفعت اختر، بھگوان داس اعجاز،
گور بخش سنگھ، نصرت ظہیر، سرشار بلند شہری، امان اللہ خان،
کمار پاشی، د پریتم سنگھ راہی، عرفان صدیقی، نثار احمد فاروقی

افسوس کہ فروری میں شاعر تاج مہجور کا دل کا دورہ پڑنے سے حیدرآباد میں انتقال ہو گیا

میں انسانی دردمندی کی بات کرنا چاہتا ہوں
شاید یہی میری آئندہ فلم کا کلیدی موضوع بھی بن جائے

مرنال سین



بنگالی فلموں کے ہدایت کار مرنال سین کو پچھلے اکتوبر میں انٹرنیشنل فیڈریشن آف فلم سوسائٹی IFFS کا صدر چنا گیا اس خبر کے پھیلتے ہی مرنال سین بہت دنوں تک اخبار والوں کیلئے خبروں کا موضوع بنے رہے۔ مرنال سین کے لئے IFFS کی سربراہی ایک بے حد خوشگوار مژدہ تھی۔ اس سلسلے میں راج شری داس گپتا نے ان کی کلکتہ رہائش گاہ پر ملاقات کی۔ پیش ہے اس گفتگو کے کچھ حصے۔

● جب آپ نے آئی ایف ایس کے صدر چنے جانے کی خبر سنی تو آپ کو کیسا لگا تھا؟

جب میرا نام تجویز ہوا تو میں ہال میں موجود نہیں تھا۔ کچھ دیر کے بعد جب میں ہال میں داخل ہوا تو تالیوں کا شور برپا ہو گیا۔ لوگوں نے مجھے مبارک دی۔ یہ سب کچھ ظاہر ہے مجھے اچھا لگا تھا۔ گذشتہ سال جب میں برلن میں تھا تو میرے کان میں یہ بھنک پڑی تھی مجھے آئی ایف ایف ایس کا صدر بنانے کی تجویز ہے۔ تب میں نے اعتراضاً یہ کہا تھا کہ میں کمیٹی کا آدمی نہیں ہوں۔ انھوں نے جواباً کہا کہ مجھے کچھ زیادہ نہیں کرنا پڑے گا جس طرح IFFS کے ایک اور صدر FRANCIS TRUFFAUT کو بھی کچھ خاص نہیں کرنا پڑا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ میرا صدر بن جانا سوسائٹی کے لئے مددگار ہوگا۔

● ایک ہندوستانی ہدایت کار کو صدر بنانے میں کیا مصلحت تھی؟

IFFS کا زیادہ تر یورپی کردار رہا ہے۔ ممبر سوسائٹی کی اس صورت گری کو بدل دینے پر مصر تھے اور وہ اس بار ایک غیر یورپی صدر کو لانا چاہتے تھے۔ مجھ سے پہلے اٹلی کے مشہور ہدایت کار CARLO LIZZANO اس کے صدر تھے۔ اس سے پہلے سابق مشرقی جرمنی کا پختہ کار اور معمر ہدایت کار KURT MAAPGIZ اس کا صدر تھا اسے صدارت کا منصب FRANCIS TRUFFAUT سے منتقل ہوا تھا۔

● IFFS کا رول کیا ہے؟

یہ ایک مرکزی سوسائٹی ہے اور سب ملکوں کی فلم سوسائٹیوں کا الحاق اس سے ہے۔ اس سوسائٹی نے فلم تحریک کو فروغ دینے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ اس سوسائٹی سے امریکہ کی فلم سوسائٹی کا الحاق نہیں ہے۔ میرا تاثر یہ ہے کہ امریکی یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے ملک کے علاوہ کسی اور کا کوئی وجود نہیں ہے۔

● مشرقی یورپ کے بارے میں آپ کا تاثر کیا ہے؟

مشرقی یورپ کی صورت حال خاصی دلچسپ ہے۔ روس میں ہونے والی تبدیلیوں کے نتیجے میں سوسائٹی میں روس، یوکرین، مولداویہ، اور اسٹونیا کے چار نمائندے ہیں۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ آنے والے دنوں میں اور کتنے اس کے ممبر بن جائیں۔ گو جرمنی اب متحد ہو گیا ہے۔ لیکن دونوں جرمنی کے نمائندے اس میں موجود ہیں مشرقی جرمنی کی فلم سوسائٹی زیادہ فعال اور طاقت ور ہے۔

● IFFS کے صدر کی حیثیت سے آپ کن امور پر توجہ دیں گے؟

یوں تو سوسائٹی کو بہت سے مسائل کا سامنا ہے مگر میں سب سے پہلے بنگلہ دیش کا مسئلہ لونگا بنگلہ دیش میں ہندوستان کے برخلاف سب ہی فلموں کو وہاں کی فلم سوسائٹی سنسر کرتی ہے کسی بھی غیر سنسر شدہ فلم کی بنگلہ دیش میں نمائش کے نتیجے میں تین ماہ کی جیل ہو سکتی ہے۔ میں بنگلہ دیش کی وزیر اعظم بیگم خالدہ کی توجہ اس طرف دلانا چاہتا ہوں تاکہ وہ مروجہ قانون کو رد کر دیں۔ میرا تاثر یہ ہے کہ بنگلہ دیش کے ہدایت کار سخت و مشکل حالات میں اچھی فلمیں بنا رہے ہیں۔ اس کے برخلاف مشرقی جرمنی کی ایک ممبر نے یہ کہا کہ گو انھیں کافی آزادی مل گئی ہے لیکن اس آزادی کے نتیجے میں ہر فلم کی نمائش ہونے لگی ہے۔ جرمنی کے تھیٹر ہالی وڈ کی جرائم ساز فلموں کے ہنیروں سے اَٹ گئے ہیں۔

● یورپین سینما کو آپ کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

اگر فلم سازی کے عالمی منظر نامے پر نظر ڈالی جائے تو اچھی فلموں کی تعداد زیادہ نہیں ہے اس عرصے میں تکنالوجی میں غیر معمولی ترقی ہوئی ہے۔ فلمیں کافی پروفیشنل انداز اور معیار سے بنی ہیں لیکن افسوس کی بات یہ ہے ان میں کچھ کہنے والی بات نہیں ہے۔ یہ بات دنیا کے مشہور فیسٹول کے بارے میں کہی جا سکتی ہے۔ یہ میرے خیال میں خطرناک صورتِ حال ہے۔ ہم ایک طرح کی خشک سالی کے دور سے گذر رہے ہیں شاید اس کی وجہ سمتوں کا واضح نہ ہونا اور سیاسی رہنمائی کا فقدان اور ان میں رونما ہونے والی تبدیلیاں ہیں یہ صورت حال فلم ہی تک نہیں ہے۔ ادب، تھیٹر اور مصوری میں نئی سوچ، نئے خیال اور نئی فکر کا فقدان ہے اب نہ پکاسو ہے اور تھامس مان۔ ہمیں کامیو جیسے کسی فرد کی ضرورت ہے جو ہمیں تساہل کے گڈھے سے باہر نکال سکے۔

● کیا مشرقی یورپ کی سیاسی تبدیلیاں کسی نئی تخلیقی رَو کو پیدا کرنے کا سبب بنی ہیں؟

مشرقی یورپ میں بننے والی زیادہ تر فلموں کا مرکزی تھیم اسٹالن کی مخالفت ہے۔ یہ ساری مضحکہ خیز فلمیں ہیں۔ یہ کسی بھی طرح حقیقت آمیز نہیں ہیں۔ آج کے سیاسی منظر نامے میں آپ کو اسٹالن مخالف فلم بنانے سے کوئی روک نہیں سکتا۔ آپکو اس سلسلے میں حکومت کی حمایت اور حوصلہ افضائی بھی ملے گی۔ آپ کو اسٹالن پرست بن کر ایسی فلموں کو رد کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ کہنے کی بھی ضرورت نہیں کہ وہ بُری ہیں۔ میری دلچسپی یہ ہے کہ میں یہ دیکھوں کہ روسی مسیحا آج کے بدلے ہوئے حالات میں ان روسی فلموں کو کس نظر سے دیکھتے ہیں جو انقلاب کے بعد بنائی گئیں اور جنھیں عظیم گردانا گیا جو مجھ پر بھی اثر انداز ہوئیں



END OF ST. PETERSBURG جیسی فلم کا کیا ہوگا کیا اس کا عنوان بدل دیا جائے گا۔

میرے خیال میں ہر جگہ فلم سازی بحران کا شکار ہے اس کی ایک وجہ ٹی وی اور ویڈیو کی بھاری مقبولیت ہے۔ لیکن اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ میں ان کی اہمیت کو کم نہیں کر سکتا۔ یہ سب کچھ سائنس اور تکنالوجی کی دین ہے۔ جب فوٹو گرافی آئی تو پینٹروں کو اپنا وجود خطرے میں محسوس ہوا تھا۔ اسی طرح جب سینما آیا تھا تو فکشن لکھنے والوں نے اسے اپنا حریف سمجھا تھا اور کہا تھا کہ سینما انسان کے اندر جھانک کر دیکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

ذہن جدید

● فلم تحریک نے ہندوستان میں کیا رول ادا کیا ہے؟

فلم سوسائٹی موومنٹ کا بنیادی مقصد سینما کے میڈیم کو سمجھنے کے لئے مناسب اور موزوں فضا اور ماحول کو بنانا ہے۔ کلکتہ میں کئی ناکام کوششوں کے بعد ۱۹۴۸ء میں فلم سوسائٹی کا قیام ممکن ہو سکا۔ اس کی سرپرستی کرنے والوں میں فلم ساز ستیہ جیت رے اور فلم نقاد سدانند داس گپتا جیسے لوگ شامل تھے۔ گو میں اس کا ممبر نہ تھا مگر چونکہ اس سے وابستہ سب ہی میرے دوست تھے۔ اس لئے میں اس کے سارے فلم شوز دیکھتا تھا۔ لیکن اس وقت بھی مسئلہ یہ تھا کہ اچھی فلم کس طرح حاصل کریں۔ کلکتہ فلم سوسائٹی نے جو پہلا کام کیا وہ یہ کہ اس نے EISENTEIN کی فلم BATTLESHIP POTEMKIN ۱۶ ایم ایم حاصل کی۔ میں نے اس فلم کو کئی بار دیکھا تھا۔ مختلف سفارت خانوں نے اچھی فلموں کے حصول میں ہماری مدد کی۔ ایک بار ہمیں چیک فلمیں جو غیر سنسر شدہ تھیں دیکھنے کو مل گئی تھیں۔ غیر سنسر شدہ فلمیں دکھانا جرم تھا لیکن ہم نے حکومت کی منظوری حاصل کئے بغیر ایسی فلموں کو دیکھنے کا انتظام کر لیا۔ یہ ساری فلمیں غیر معمولی تھیں۔ ان میں ایک فلم روسی انقلاب کے بارے میں تھی۔ اور ایک فلم دوسری عالمی جنگ میں چیکوسلاویہ کی مزاحمت کے بارے میں تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ انقلاب کے بعد روس ہی میں سب سے زیادہ اچھی فلمیں بنائی گئی تھیں۔

ادھر ہندوستانی حکومت کو فلم تحریک اور فلم سوسائٹی کے توسط سے اچھی فلموں کو دیکھنے کی مہم سے دلچسپی نہیں تھی۔ حکومت دراصل فلم تحریک کی افادیت سے باخبر نہیں تھی۔ اس کے برخلاف اسے خدشہ تھا کہ کہیں یہ تحریک کچھ اور نتائج کی حامل نہ بن جائے۔ کچھ عرصے کے بعد ملک میں جگہ جگہ ایسی سوسائٹیاں بننے لگیں اور تب اس میں مرکزیت پیدا کرنے کا خیال آیا۔ اب ہمارے ملک میں فیڈریشن آف فلم سوسائٹی آف انڈیا قائم ہے جس کا IFFS سے الحاق ہے۔

● بہت سے لوگوں کا خیال یہ ہے کہ آپ کی فلم سازی کا محور اور مرکز بدل گیا ہے۔

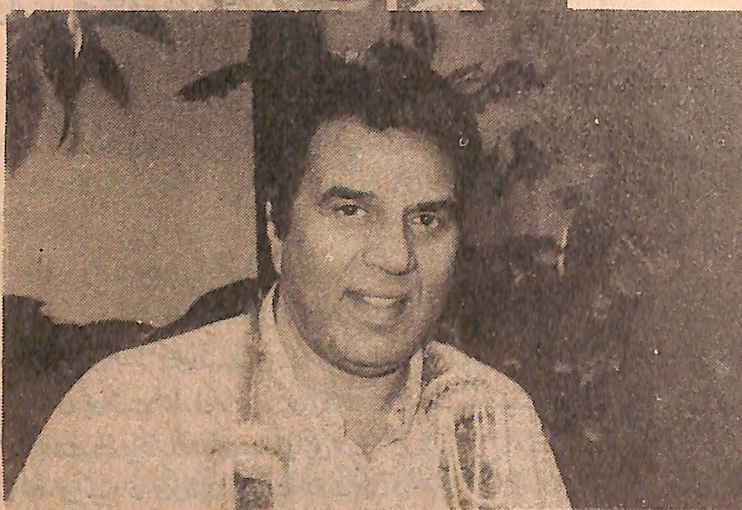
۱۹۶۰ اور ۱۹۷۰ میں جب میں نے فلمیں بنائی تھیں تو ماحول میں خاص بے چینی اور غصہ تھا میرے لئے اس سے گریز یا فرار یا چشم پوشی ممکن نہ تھی۔ فلم میں جمال پرستی اور اسے بے مقصد تصور کرنے والوں نے مجھے اس زمانے میں اشتہار باز کہا تھا۔ جس کا مجھے ذرا بھی ملال نہیں ہوا کیونکہ میرا خیال تھا کہ اگر میں جذباتی سطح پر صحیح ہوں تو پھر اپنے فن کی سطح پر بھی میں حق پر ہوں۔ میری فلموں کا لہجہ سیاسی تھا اور وہ بڑی دوٹوک تھیں میں نے جان بوجھ کر دوٹوک ہونے کی بات کی ہے۔

ایک بار جب میں ایک افریقی فلم دیکھ کر ایک برطانوی فلم ساز کے ساتھ سینما ہال سے باہر نکلنے لگا تو میں نے اس سے فلم کے بارے میں اس کی رائے پوچھی جسے ایک اینگلو انڈین نے نوآبادیات کے خلاف بنایا تھا۔ برطانوی فلم ساز کا جواب تھا کہ مرنال اس فلم میں لطیف عنصر نہیں ہے۔ میں نے کہا آپ کے پیش روؤں نے ہم سے ہماری حس لطیف چھین لی۔ اس لئے جب بھی ہم کچھ کہنا چاہتے ہیں وہ نعرہ بن جاتا ہے۔ میری فلم کلکتہ ۷۱ میں نئی داخلیت کے مقابلے میں خارجی جارحیت زیادہ تھی۔

ہمارے ملک میں ہونیوالی سیاسی تبدیلیوں نے ہمیں مستقبل کے بارے پُرامید بنا دیا تھا لیکن کچھ بھی نہیں ہوا۔ یہ وہ وقت تھا جب میں نے سوچا اور اپنے اندر جھانک کر دیکھا۔ ۱۹۷۲ء میں جب نکسلائٹ تحریک عروج پر تھی تو میں نے PADATIK کے عنوان سے فلم بنائی۔ میرے بعض بائیں بازو سے

باقی صفحہ ۲۱۷





میں اس فلم بین طبقے کو پسند کرتا ہوں جو کاسٹ کے بجائے فلم
اور اس کی کہانی اور اس کے کرداروں کو اہمیت دیتا ہے

• دھرمیندر
ملاقاتی • زبیر رضوی

ہماری فلمیں۔ خواب بیچتی ہیں

دھرمیندر

● آپ کی فلموں اور آپ کے کام سے فلم بیں طبقے کی دلچسپی غیر معمولی ہے۔ پھول اور پتھر اور شعلے جیسی فلموں کے بعد تو آپ سینما بینوں کو ٹکٹ کھڑکی تک لانے میں بے حد کامیاب رہے ہیں۔ ایک اور بات جو میں نے آپ سے ایک دو ملاقاتوں میں محسوس کی ہے وہ یہ کہ آپ بڑے ملنسار ہیں آپ کا ایکٹر بننا اتفاقی ہے یا سوچا سمجھا منصوبہ۔

فلم میں آنے کے سلسلے میں زیادہ تر لوگ تو یہی کہتے ہیں کہ انھیں فلموں میں کام کرنے سے دلچسپی نہیں تھی بس وہ فلموں میں آگئے۔ میں سچ مچ فلموں میں آنے کے لئے بے چین رہتا تھا گو میں نے بارہ سال کی عمر تک کوئی فلم نہ دیکھی تھی۔ مجھے تب تک پتہ ہی نہیں تھا کہ فلم چیز کیا ہوتی ہے۔ میں نے اسی عمر میں جو پہلی فلم دیکھی وہ دلیپ صاحب کی "شہید" تھی۔ اس فلم کو دیکھنے کے بعد مجھے ایسا لگا کہ مجھے بھی فلم میں جانا چاہیئے۔ ہو سکتا ہے کہ میں بھی لوگوں کو پسند آؤں۔ لیکن میں آج بھی نہیں بتا سکتا کہ میں لوگوں کو کتنا پسند آتا ہوں۔

● تو آپ کے پہلے آدرش دلیپ کمار تھے۔

جی ہاں۔ وہ میرے پہلے آئیڈیل تھے اور ہیں۔ دلیپ صاحب سے مجھے بے پناہ پیار ہے، عقیدت کی حد تک کیونکہ میں نے انھیں دیکھ کر محسوس کیا ہے کہ وہ میرے اپنے بھائی جیسے ہیں۔ فلم انڈسٹری میں ان کی طرح ہر دل میں سما جانے والا اداکار ابھی تک میری نظر سے نہیں گزرا۔ ان کی جب بھی کوئی فلم ریلیز ہوتی ہے میں اس کا پہلا ہی شو دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔

● فلم 'شہید' آپ کو بمبئی لے آئی۔ پھر.....

بمبئی آنے کے بعد میری سب سے پہلی خواہش تو یہ تھی کہ میری دلیپ صاحب سے ملاقات ہو جائے۔ لیکن ان سے ملنے کے لئے جھجک اور شرم بھی آڑے آتی رہی۔ میں ایک دن شوٹنگ کر رہا تھا تو وہ بمل رائے سے ملنے آئے میرا جی چاہا کہ کوئی مجھے ان سے متعارف کرا دے لیکن میں بس انھیں دیکھتا رہا۔ نہ جانے کیوں مجھے یہ محسوس ہوتا تھا کہ اگر میں خود ان سے ملنے جاؤں تو وہ مجھ سے شاید اچھی طرح نہ ملیں۔ میں بمبئی میں رہتے ہوئے بہت دنوں تک ان سے نہ مل سکا۔ پھر ایک دن ان کی بہن فریدہ سے ملاقات ہو گئی وہ فلم فیر میں کام کر رہی تھیں۔ میں نے ان سے کہا کہ میں دلیپ صاحب سے ملنا چاہتا ہوں تو انھوں نے کہا کہ کل شام کو چھ بجے آپ آجائیے۔ میں وقت مقررہ پر ان کے گھر پہونچ گیا۔ آپ کو یقین نہیں آئے گا کہ شام چھ بجے سے رات دو بجے تک ان سے باتیں ہوتی رہیں۔ بس وہ بولتے رہے اور میں انھیں سنتا رہا تھا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ میں ان کی فیملی کا ایک ممبر ہوں۔ مجھے زندگی میں ایسے انسان بہت کم ملے ہیں۔

● اس ملاقات تک کیا آپ کی فلمیں آچکی تھیں۔

جی نہیں۔ تب تک میری ایک بھی فلم ریلیز نہیں ہوئی تھی۔ میری پہلی فلم تھی — دل بھی تیرا ہم بھی تیرے۔ اس فلم کو دیکھنے کے بعد مجھے لگا تھا جیسے میں غلط جگہ آگیا ہوں یا یہ جگہ میرے لئے مناسب نہیں ہے۔ اس فلم کو دیکھ کر مجھے اتنی وحشت ہو رہی تھی کہ میں فلم لائن ترک کر کے اپنے گاؤں جانے کی بابت سوچنے لگا تھا۔

ذہن جدید

● تو پھر وہ کون سی فلم تھی جس نے آپ کو فلم لائن ترک کرنے سے روکا۔

سکون تو مجھے ابھی بھی نہیں ملا ہے۔ فلم شعلہ اور شبنم جیسی فلم ضرور تھی جس کو دیکھ کر لوگوں نے میری حوصلہ افزائی کی۔ اس فلم کے سلسلے میں اور میرے کام کے بارے میں باہر سے خط بھی کافی آئے۔ انھیں لگا تھا کہ ایک نیا ہیرو آہستہ آہستہ ضرور جم جائے گا۔ مجھے بھی لگا تھا کہ اگر مجھے ایسی کہانی ملتی رہے تو میں ضرور اپنی جگہ بنا لوں گا۔

● پھول اور پتھر۔ شعلے جیسی کئی فلموں کے بعد لوگوں کا یہ خیال بن گیا کہ آپ ACTION فلموں کے لئے یا جن فلموں میں THRILL تھرل ہونا ہے۔ ان کے لئے آپ موزوں ہیں۔

ایسی بات نہیں ہے کہ ایکشن فلم کی وجہ سے میں کوئی بڑا ہیرو بنا یا بنا رہوں گا۔ ویسے یہ بات بڑی عجیب ہے کہ ایکشن فلم یا پھر میوزیکل فلم ہی سُپر ہٹ ہوتی ہیں۔ ڈسٹری بیوٹر۔ پروڈیوسر سب ہی ایسی ہی کہانیاں ڈھونڈھتے ہیں جو ان کی جیب بھر سکیں۔ کوئی فلم ہٹ ہوتی ہے تو اس کے ساتھ ہیرو بھی ہٹ ہو جاتا ہے۔ پھول اور پتھر جب بن رہی تھی تو۔ انوپما۔ جیسی فلم بھی میری نہایت کامیاب بھی جا رہی تھی۔ اس وقت فلم سازوں نے مجھے 'ٹائپ' کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس وقت میں فلموں کے بارے میں کسی تجزیے یا تجربے کا مالک بھی نہیں تھا میرے لئے فلمی دنیا ایک سمندر کی طرح تھی۔ اور میری کیفیت اس نئے تیراک کی طرح تھی جو گاؤں سے اچانک آ گیا تھا مقابلہ کرنے کے لئے۔ مجھے اس وقت یہ بھی اعتماد نہیں تھا کہ میں اس وقت سب کے ساتھ چل بھی پاؤں گا یا نہیں۔ اسی گھبراہٹ میں میں اچھی فلمیں SELECT نہیں کر پایا۔ جیسی فلمیں مجھے ملتی گئیں میں لیتا چلا گیا۔ ان میں زیادہ تر فلمیں ACTION والی تھیں اور بیشتر فلمیں کامیاب رہیں۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ اگر آپ کا ہدایت کار اچھا ہے اور کہانی اچھی ہے تو آپ ایکشن فلموں کی طرح کامیاب ہو سکتے ہیں۔ جیسے میں نے نیا زمانہ' ستیہ کام میں کامیاب رول کئے ہیں۔ اپنی اب تک کی فلموں میں مجھے فلم ستیہ کام۔ میں کام کر کے فنکارانہ خوشی ہوئی تھی۔

مجھے ابھی بھی یہ احساس نہیں ہے کہ میں کچھ کر پایا ہوں
کوئی اچھا رول کوئی اچھی سانس لیتی ہوئی کہانی مل جائے تو شاید کچھ بات بن جائے۔

● پرتگیہ۔ میں آپ نے کامیڈی کی اور شعلے میں بھی آپ بے حد پسند کئے گئے۔

کہا جاتا ہے کہ اگر آپ اس طرح کرداروں کو زیادہ اپنائیں تو شاید آپ اپنے اندر چھپی ہوئی صلاحیتوں کے ساتھ زیادہ انصاف کر سکیں۔ یہ بڑے COLOURFUL کردار ہوتے ہیں۔ لوگوں کو بے حد پسند آتے ہیں۔ تو اس طرح کے خیالات کے ساتھ ہی میں نے خود کو سنبھالنا شروع کر دیا تھا۔ میں نے اپنے رول پسند اور ناپسند کرنے شروع کر دیئے تھے کہ لوگ مجھے ٹائپ کرداروں میں بار بار دیکھ کر اکتانے بھی لگے تھے

● دیوداس جیسی فلم کرنا جو پہلے بھی دو بار بن چکی تھی۔ آپ نے کیوں پسند کیا۔

میں نے یہ فلم چیلنج سمجھ کے قبول نہیں کی تھی۔ اس فلم میں کام کرنے کی رضامندی کی وجہ دیوداس جیسے کردار کی عوامی مقبولیت تھی۔ پہلی فلم میں سہگل دیوداس بنے تھے۔ وہ بے حد کامیاب ہوئی۔ پھر ایک لمبے عرصے کے بعد دوسری فلم بنی تو اس بار دلیپ صاحب دیوداس تھے۔ لوگوں نے اسے بھی سراہا اور پسند کیا۔ تو اس لئے میرا خیال یہ تھا کہ یہ

فلم جب ۲۵ سال بعد پھر ایک نئے اداکار کو لے کر بنے گی تو پھر پسند کی جائے گی۔ دوسرے معنی میں کہانی میں اس کے کرداروں میں آپ کا اعتماد پختہ ہے تو پھر ان کو کرتے ہوئے وہ اعتماد کہیں لچک نہیں کھاتا۔

● آپ کو کن آرٹسٹوں کے ساتھ کام کرتے ہوئے لطف آیا ہے۔

ویسے تو میں جس کے ساتھ کام کرتا ہوں اسے ENJOY کرتا ہوں۔ میں نے سب ہی طرح کے آرٹسٹوں کے ساتھ کام کیا ہے۔ کیونکہ میں مینا کماری کا فین تھا فلم میں آنے سے پہلے۔ تو ان کے ساتھ کام کرتے ہوئے مجھے عجیب سا نشہ محسوس ہوتا تھا وہ ایک عظیم انسان تھیں۔ انھوں نے کبھی سیٹ پر ساتھ کام کرتے ہوئے اپنے بڑے آرٹسٹ ہونے کا مجھے احساس نہیں دلایا۔ ان کے ساتھ کام کرنا آسان لگتا تھا۔ ان کے ساتھ عجیب قسم کا رشتہ بن گیا۔ ان کے ساتھ میری کئی فلمیں ہیں۔ پھول اور پتھر۔ زیادہ مقبول ہوئی میں کاسٹ میں ان کا نام سن کر فلم میں کام کرنے کے لئے رضامند ہو جاتا تھا۔ ان کے ساتھ میری فلمیں زیادہ تر کامیاب نہیں ہوتیں۔ میں یہ محسوس نہیں کر سکا کہ کہانی اچھی نہ ہو اور مینا کماری ہوں تو ضروری نہیں کہ فلم چلے۔ میں تو کہوں گا کہ اگر کہانی اچھی ہے تو سب لوگ خوبصورت لگتے ہیں ورنہ تو کچھ اچھا نہیں لگتا۔

● آپ کی نظر میں "اچھی کہانی" کیا ہوتی ہے

دیکھئے میں بڑا سچ بولنے والا انسان ہوں اور جھجکتا نہیں ہوں۔ میں کہوں گا کہ ہماری فلم انڈسٹری میں اچھی کہانیاں بنی ہی نہیں ہیں۔ ہمارے یہاں ہر سال ڈھائی سو سے زائد فلمیں بنتی ہیں مگر سال میں صرف پانچ سات فلمیں ہی کامیاب ہوتی ہیں۔ ان میں بھی دو تین کہانیاں ہی ایسی ہوتی ہیں جن کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ زندگی کے بہت قریب سے لی گئی ہیں۔ ان کرداروں کو دیکھ کر اور جی کر لگتا ہے یہ کردار کہیں ہیں۔ ہمیں ملتے ہیں۔ ہم لوگ تو ایسا لگتا ہے کہ خواب بیچتے ہیں۔ عام جنتا کے لئے۔ ان کو تو وہ چیز اچھی لگتی ہے جو انھوں نے کبھی دیکھی نہیں۔ فلم ان کے لئے ایک طرح کا REFUGE ہے۔ وہ محرومیوں کو رد کرنے کا احساس دلاتی ہے۔ ناچ، گانے، بھڑکیلے لباس، شوخ اور طرار مناظر، یہ سب دیکھ کر انھیں خوشی ہوتی ہے اور یوں فلم انھیں وقتی تفریح دے کر ہٹ بن جاتی ہے۔ لیکن سچ یہ سب کچھ خواب اور خوابوں کی دھند میں ڈوبا لگتا ہے اور زندگی کی سچی کہانی کے مقابلے میں یہ خواب دکھانے والی کہانی ہٹ ہو جاتی ہے۔

● کم بجٹ کی فلمیں جو غیر فارمولا ہوتی ہیں جیسے انکور، رجنی گندھا، سارا آکاش۔ ان میں آپ کام کرنے کو ترجیح نہیں دیتے۔

دیکھئے میری ہمیشہ یہ خواہش رہی ہے کہ میں ایک ایسا کردار کروں ایسی کہانی کروں جو زندگی سے لیا گیا ہو اور جو ایک جیتا جاگتا کردار ہو۔ مگر مجھے ایسی کہانی نہیں ملتی۔ اب اگر میں غیر فارمولا فلموں میں کام کروں جیسے آپ نے نام لئے تو میری مصیبت یہ ہے کہ سینما ہال میں لوگ مجھ سے اور میرے فلمی کردار سے کچھ توقعات وابستہ کر کے داخل ہوتے ہیں اور اگر میں ویسے کردار کروں تو پھر میرا فلم بیں مایوس ہونے لگتا ہے اس کے ساتھ جو ڈسٹری بیوٹر ہے وہ بھی ایسی فلموں پر پیسہ نہیں لگاتا۔ وہ نہ جانے کس طرح یوں کہوں سونگھ لیتا ہے کہ دھرمیندر کی یہ فلم یا وہ فلم نہیں چلے گی ہدایت کار اور کہانی کار اور پھر کچھ فلم کے میڈیم کو سمجھنے اور اس سے دلچسپی رکھنے والے تو ایسی فلموں کو پسند کر لیتے ہیں مگر عام آدمی تو خالص تفریح چاہتا ہے۔ ہماری کمرشیل فلموں کو دیکھتے دیکھتے وہ ایک خاص طرح کی اداکاری

اور رول کا عادی ہو جاتا ہے اس لئے اگر وہ غیر متوقع رول یا اداکاری کو دیکھے تو پھر مایوس سا ہو جاتا ہے میں اس طبقے کی خاطر ہی فلم میں کام نہیں کرتا مگر اس طبقے کی اکثریت کافی ہے اور یہی دراصل کسی فلم کی کامیابی یا ناکامی کا سبب بھی بنتا ہے۔ میں یقینی طور سے اس فلم بیں طبقے کو پسند کرتا ہوں جو کاسٹ وغیرہ کے بجائے فلم، اس کی کہانی۔ اس میں شامل کردار اور اس کی مجموعی پیش کش کو زیادہ اہمیت دیتا ہے مگر یہ طبقہ بہت کم ہے۔ میری دعا ہے کہ سارے لوگ اس طبقے میں شامل ہو جائیں اور اس کی تعداد بڑھ جائے۔ ایسی فلموں کا ہمیں ایک فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ ہمیں تصنع، بناوٹ اور غیر معمولی میک اپ سے نجات مل جاتی ہے۔ کیونکہ کہانی فطری انداز میں جیتی اور سانس لیتی ہے۔ تو ہمارے لئے بھی اس کہانی اور اس کے کردار کو پردے پر جینا بے حد آسان اور فطری لگتا ہے۔ ایسی فلموں میں کام کرتے ہوئے آپ کی اداکاری میں بے ساختہ پن آجاتا ہے۔

● بیک وقت کئی فلموں میں کام کرنے کو آپ کس نظر سے دیکھتے ہیں۔

مجھے لگتا ہے کہ اس سسٹم کو بند کرنا یا اس پر روک لگانا مشکل ہے۔ میں نے خود بھی کئی بار سوچا ہے کہ میں سال میں چار پانچ فلمیں ہی کروں اور آگے نہ بڑھوں۔ زیادہ فلموں میں کام کرنے کا مقصد پیسہ کمانا ہی نہیں ہے۔ دراصل ہے کیا کہ انڈسٹری میں مقبول ہیرو یا اداکار بیک وقت چار پانچ سے زائد نہیں ہوتے اور فلمیں سال میں ڈھائی تین سو کے قریب بنتی ہیں۔ ہر فلم ساز اپنی فلم میں کامیاب ہیرو اور اداکارہ کو لینا پسند کرتا ہے اور اس کے لئے بھاگ دوڑ بھی کرتا ہے۔ کبھی ہم فلم ساز کے گرفت میں آجاتے ہیں اور کبھی کہانی، کاسٹ اور دوسرے کئی معاملات فلم کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

● اگر پرانے آرٹسٹ کم فلمیں کریں تو نئی صلاحیتیں قدرتی طور پر سامنے آئیں گی۔

نئے چہرے، نئے آرٹسٹ، نئے لڑکے، لڑکیاں تو آنے ہی چاہئیں۔ کیونکہ میں بھی کبھی نیا تھا اور تب میں بھی یہی سوچتا تھا کہ پرانے آرٹسٹ نئے کلاکار کے لئے جگہ چھوڑیں۔ اس طرح فلم بیں طبقہ بھی ایک طرح کی تبدیلی محسوس کرے گا۔ لیکن فلم ساز اور ڈسٹری بیوٹر نئے چہروں پر روپیہ لگاتے ہوئے جھجکتا ہے۔

● کبھی آپ نے فلموں میں اپنے کام کا محاکمہ کیا ہے۔

میں ابھی تک اپنی فلموں اور ان میں اپنے کام سے مطمئن نہیں ہوں۔ جب جب میں نے اپنی کوئی فلم دیکھی ہے تو مجھے گھبراہٹ سی ہوئی ہے۔ ایک واقعہ سناؤں۔ میری فلم "یادوں کی بارات"۔ اس کا ٹرائل تھا۔ میں عموماً ایسے شوز تنہا ہی دیکھنا پسند کرتا ہوں کہ آپ اکیلے ہوں تو اپنی خامیاں اور کمزوریاں جلدی نظر آجاتی ہیں۔ تو اس دن پتہ چلا کہ ٹرائل دیکھنے دلیپ صاحب بھی آرہے ہیں۔ میرے علم میں یہ بات اُس وقت آئی جب ٹرائل شروع ہونے والا تھا۔ تو میں بھاگنا چاہتا تھا مگر بھاگ نہیں پایا۔ بدقسمتی سے میری اور ان کی سیٹ برابر برابر میں تھی۔ اور میرے ہاتھوں میں پسینہ اُتر آیا۔ میں بے حد نروس تھا۔ پتہ نہیں کیوں مجھے آج بھی لگتا ہے کہ میں فلمی دنیا میں نووارد ہوں۔ مجھے نہیں لگتا کہ میں نے ابھی کچھ کیا ہے۔ ہاں یہ احساس نہیں ہے کہ میں کچھ کر پاؤں گا۔ کوئی اچھا رول کوئی اچھی سانس لیتی زندہ کہانی مل جائے تو شاید کچھ بات بن جائے۔ دیوداس اور ڈاک تار بابو جیسی فلموں میں مجھے اپنی اداکاری میں مصنوعی پن نہیں لگا تھا۔

باقی صفحہ ۲۰۵

● فلم کے علاوہ آپ کن مشاغل کو ترجیح دیتے ہیں۔

ذہن جدید



کمار گندھرو کا سنگیت عوامی اپیل اور دانش ورانہ پسند کا حسین امتزاج تھا

کمار گندھرو ہمارے عہد کے نامور گانے والوں میں تھے انھوں نے سُر، لے، اور راگ کی گود میں آنکھ کھولی۔ وہ سنگیت کے آنگن میں پلے اور بڑھے تھے۔ ان کے بارے میں یوں تو کافی کچھ لکھا گیا ہے۔ لیکن ہمیں وہ سب پڑھتے ہوئے لگا تھا کہ ان کی گائیکی کا صحیح تجزیہ نہیں ہو سکا۔ اس تعلق سے ہم نے ممتاز گائیکہ سوہاسنی کوراٹکر اور سنگیت شناس آر۔ سی۔ بھٹ کو ذہن جدید کے لئے اظہارِ خیال کی دعوت دی۔ ان کا مکالمہ کمار گندھرو کے سنگیت پر کئی انداز سے روشنی ڈالتا ہے۔

بھٹ • کمار گندھرو کے سنگیت کا میں پریمی بھی ہوں اور ان کی گائیکی کا ایک مشاہد بھی۔ میرے نزدیک تو وہ گنوں والے سنگیت کار تھے۔ میں جب ۶۲-۶۱ میں بھوپال میں تھا تو میرے ایک دوست تھے۔ رمیش ٹنکرنی۔ جو کمار جی کے بھی بڑے دوست تھے۔ ہم دونوں ہی اکثر دیواس جایا کرتے تھے۔ تو دیواس میں کمار جی کے گھر میں ہمیں اکثر راتوں کو ٹھہرنے کا اتفاق بھی ہوا۔ تب میں نے انھیں قریب سے دیکھا اور میرے اس خیال کو بڑی تقویت ملی کہ آرٹسٹ کے فن اور اس کے مظاہرے PERFORMANCE کا اس کے رہن سہن طرزِ سلوک کھانا پینا اور اس کے لباس اور قدرت NATURE کے بارے میں اس کے رویئے کا بھی تعلق ضرور ہوتا ہے۔ یہ سب باتیں کسی نہ کسی صورت میں اس کی تخلیقی شخصیت پر ضرور ہی اثر انداز ہوتی ہیں۔ مثلاً کمار گندھرو جی کے گھر پر جب بھی کوئی جاتا، مہمان بنتا تو وہ اسے بڑے پیار اور خلوص سے خوش آمدید کہتے، اس کی خاطر تواضع کرتے، اسے اپنا گانا بھی سناتے۔ اور ہر طرح اس کے لئے آرام کا خیال رکھتے تھے۔ خود بھی کھانے کی چیزیں بناتے تھے اور اپنے ہاتھ کی بنی ہوئی چیزوں کو کھلانے کے لئے بڑے پیارے انداز میں للچاتے تھے۔ ان کی خاطر تواضع ایک آرٹسٹ کی خاطر تواضع ہوتی تھی جس میں بجز پیار اور خلوص کے اور کچھ نہ ہوتا تھا۔ میں نے دیکھا تھا کہ وہ جب صبح ہی سویرے اٹھتے تو ریکارڈ کیا ہوا میوزک ایک سوئچ دباتے ہی شروع ہو جاتا۔ وہ سنگیت کی اس مدھرتا کا لطف لیتے ہوئے منہ دھوتے، کلی کرتے اور پھر دھیرے دھیرے اپنے باغیچے میں آجاتے تھے۔ اور پھر مجھے اور ٹنکری کو اپنے قریب لا کے کلیوں کے کھلنے، ان کے پھول بننے کی باتیں سناتے۔ وہ جس طرح ڈوب کر گاتے تھے۔ اسی طرح پھول، پتی، کیاری اور پودوں دیکھ دیکھ کر اور ان کی

چھون میں ڈوب سے جاتے تھے۔ ہر معاملے میں ان کے استغراق کا عالم بڑا دیدنی ہوتا تھا۔

سوہاسنی ۔ میں بھی اس بات کو مانتی ہوں کہ آرٹسٹ کا جو جیون ہوتا ہے۔ وہ اس کے فن کے دریچوں سے آڑھا ترچھا، آدھا ادھورا جھانکتا ضرور ہے۔ کمار جی کے بارے میں یہ بات سب جانتے ہیں۔ کہ وہ ایک طفلِ اعجاز تھے CHILD OF PRODIGY انھوں نے دس گیارہ سال کی عمر میں اپنے مستند عہد کے گانے والوں کو چونکا دیا تھا۔ اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ جو ایسے اعجاز صفت بچے ہوتے ہیں وہ کچھ دن تو دھوم مچاتے ہیں۔ انعام و اعزاز کی ان پر بارش ہوتی ہے۔ مگر پھر نہ جانے وہ کہاں گم ہو جاتے ہیں، لیکن کمار گندھروجی نے اپنا سنگیت کا ریاض پروفیسر دیودھر کی سرپرستی میں جاری رکھا۔ انھوں نے سنگیت یا اپنے گائن کا آغاز اپنے زمانے کے بڑے بڑے سنگیت کاروں کی نقل کر کے کیا، وہ بے حد اچھی نقل کرتے تھے اور ہو بہو گاتے تھے۔ اگر وہ ایسا کرتے رہتے تو شاید کب کے گمنام ہو گئے ہوتے۔ چونکہ سنگیت ORIGINALITY مانگتا ہے اور تخیّل کو کلیدی حیثیت دیتا ہے، اس طرح دیکھیں تو کمار جی نے کچھ اپنا گانے کی کوشش کی۔

ان کا جو فن تھا وہ سننے والے کے خیال اور گمان سے آگے ہوتا تھا۔ یہ پتہ چلانا یا چلنا بڑا مشکل ہوتا تھا کہ وہ کیا گائیں گے اور کیسے سَم پر آئیں گے۔ ویسے ان کے سُر اتنے سچے تھے کہ جو سننے والے شاستریہ سنگیت سے واقف نہ ہوتے تھے وہ بھی اس میں کھو جاتے تھے۔ اسکو یہ تو معلوم نہیں ہوتا تھا کہ انھوں نے کب کہاں کون سا سُر لگایا مگر ان کی گائیکی دل کے اندر اُتر جاتی تھی۔ میری نظر میں اُن کی گائیکی کی خوبی یہ تھی کہ اس میں سیدھا پن تھا اور فنی نزاکتیں بھی تھیں۔ دراصل ان کا سنگیت عوامی اپیل اور دانشورانہ پسند دونوں کا ایک پُر کشش امتزاج تھا۔ اُن کے سنگیت کے اسی امتزاج نے اپنے عہد کے سنگیت کاروں کو چونکا دیا تھا۔ میں نے ان کو اپنے بچپن سے سنا ہے اور الگ الگ مرحلوں اور زمانوں میں بھی اُن کے سنگیت کو سنا ہے مجھے اب تک وہ منظر یاد ہے۔ جب انھوں نے پونہ کے ایک کنسرٹ میں بلاس خوانی گایا تھا۔ بلاس خوانی توڑی کو سنتے ہوئے جب اُن کی گندھار آتی تھی، کومل گندھار تو اسے آج بھی یاد کر کے میرے رونگٹے یہ سوچ کر ہی کھڑے ہو جاتے ہیں کہ یہ کیا اور کیسا سُر لگ گیا ہے، اور کیسے لگا ہے۔ ہندوستانی سنگیت میں شورتری کا پریوگ سب ہی ضروری سمجھتے ہیں۔ لیکن یہ بہت گائیکوں میں معیاری انداز میں سنائی دیتا ہے ہر ایک راگ میں کیا شورتری لگے گی اس کا اندازہ بڑی بات ہے۔ کمار جی صحیح سُر لگانے میں ماہر تھے اسی لئے ان کی گائیکی میں تاثر بڑھ جاتا تھا۔

بھٹ ۔ آپ نے جو نقل کی بات کی تھی تو یہ واقعہ ہے کہ کمار جی نے اپنے سنگیت کا سفر نقل سے شروع کیا تھا اور اُستاد عبدالکریم خاں صاحب سے لیکر اُستاد فیاض خاں صاحب تک جتنے بھی گویئے تھے انھوں نے ان کی محض نقل ہی نہیں کی تھی۔ ہر کلاکار کے گانے

کا جو اسٹائل، گائیکی کے جو جھٹکے، سُر کا لگاؤ جو تھا اُسے اپنایا اور اس طرح انھوں نے اپنے گلے کو مانجھا اور پھر وہ منزل بھی آئی جب وہ اپنا سنگیت اپنی گائیکی کو صورت دینے کے قابل ہو گئے۔ یہ جو ان کے بارے میں ایک خاص بات کہی جاتی ہے کہ وہ گھرانوں کی قید سے آزاد تھے وہ کسی گھرانے سے بندھے ہوئے نہیں تھے۔ یہ صحیح ہے اس کی وجہ میرے نزدیک یہ ہے کہ انھوں نے ہر معتبر گانے والے اور اس کے گھرانے کی وہ سب ہی خوبیاں اپنا لیں جو سنگیت کو نبھانے والا بناتی ہیں۔ اس طرح انھوں نے ان سب کے امتزاج سے گائیکی کی اپنی ایک شیلی بنائی۔ ایک اور بات یہ ہے کہ وہ سنگیت کو عوام تک لے جانے اور اس میں ان کو شامل کرنے کے حق میں تھے۔

سوہاسنی ۔ یہ عجیب بات ہے کہ بھارتی سنگیت گھرانوں میں اتنا بٹا ہوا ہے کہ اس کے باہر ہم جا نہیں سکتے۔ لیکن یہ کمار گندھرو ہی تھے جو گھرانوں کی روایتوں سے اور ان کے اثرات سے دامن بچا کے نکل گئے۔ ایسا نہیں کہ انھوں نے گھرانے داروں کی سنگیت کی روایتوں کو نکارا ہو۔ انھوں نے اسکی افادیت سے انکار نہیں کیا۔ اس سے فائدہ بھی اٹھایا مگر اس طرح کہ ان کی گائیکی ایک آزاد پنچھی کی اڑان بن گئی۔ اندر اندر ممکن ہے کہ وہ روایت سانس لے رہی ہو مگر باہر جو کچھ بھی سننے والے کے حصے میں آتا تھا وہ کمار جی کو اپنا لگتا تھا۔ وہ ہاتھوں میں مٹی ضرور لیتے تھے مگر اس سے جو آکار ان کی انگلیاں اور ہاتھ بناتے تھے وہ ان کے اپنے خیال کی دین ہوا کرتا تھا۔ وہ آکار بناتے ہوئے سوچتے بھی ہیں، تجربہ بھی کرتے ہیں اور خطرہ بھی مول لیتے ہیں۔

اسی لیے وہ اپنے عہد کے ایک مختلف اور متنازعہ گائک گنے جاتے تھے کچھ لوگ انکو جینئس کے طور پر مانتے تھے اور کچھ نہیں۔

انھوں نے ایک اور کام یہ کیا تھا کہ کلاسیکی سنگیت میں لوک سنگیت کو ملا دیا۔ یا یوں کہئے کہ اسے گھول دیا حالانکہ کلاسیکی سنگیت کا آدھار تو لوک سنگیت ہی ہے۔ مگر کمار جی نے اپنے سنگیت میں لوک شیلیوں کو کچھ اس طرح گوندھ لیا تھا کہ وہ سننے والے کو دیر تک اپنے جادو اور اس کے اثر میں رکھتا تھا۔ یہ تجربے انھوں نے اس زمانے میں کئے جب انکی صحت اچھی نہیں تھی خرابی صحت کے باعث انھیں جس قسم کی جسمانی اور اعصابی کمزوریوں کا سامنا کرنا پڑا تھا اس کے پیش نظر انھوں نے اپنی آواز اور گائیکی کے اسلوب کو چنا۔ آپ کو معلوم ہوگا ان کا ایک پھیپھڑا نکال دیا گیا تھا۔ یہ ایک بڑی بات تھی کہ ایک گانے والا اپنی جسمانی اور اعصابی LIMITATIONS کو دھیان میں رکھتے ہوئے اپنے لئے گانے کی راہیں متعین کر لے۔ اور جب گانے بیٹھے تو سننے والے کو یہ احساس تک نہ ہو کہ گانے



سوہاسنی

والا اپنی LIMITATIONS کے ساتھ گا رہا ہے۔ ان کا گائیکی میں جو وقفہ ہے PAUSE ہیں وہ سچی بات یہ ہے کہ اپنی LIMITATIONS کی وجہ سے ہیں۔

بھٹ • میں اس بات کو اس طرح کہوں گا کہ ایک راگ جو گھرانے دار گائیک گاتے ہیں تو وہ اپنے مروجہ PHRASES کے ساتھ گاتے ہیں۔ ہر گھرانہ دو چیزوں سے جانا جاتا ہے ایک تو سُر کا لگاؤ اور دوسرے جو سروں کے PHRASES ہیں جو COMBINATION ہیں ان کے استعمال سے گھرانے جانے جاتے ہیں کمار گندھرو نے سنگیت میں جو اُتھل پُتھل کی وہ یہ ہے کہ انھوں نے سروں کے PHRASES کی پُری بھاشا ہی بدل دی یعنی اگر یمن میں نی۔ رے۔ گا روایت بن کر چلا آرہا ہے تو انھوں نے نی۔ رے۔ گا کو تو مانا لیکن اگر وہ نی۔ رے۔ گا کہنا چاہتے ہیں تو نی رے۔ گھا کر کے بھی کہہ سکتے ہیں۔ نی۔ ما۔ رے۔ گا کر کے بھی کہہ سکتے تھے تو انھوں نے یہ جو سُروں کے سسٹم تھے COMBINATION تھے اُن کو اُن کے تجربہ کرنے والے مزاج نے بدل دیا۔ دوسرے ہمارے راگوں کی بڑھت میں جو وقفے آتے ہیں جو خالی پن آتا ہے اس کو انھوں نے اپنی پُر زور آواز اور تانوں سے ایسا گوندھا ہوا سنگیت بنا دیا تھا جو اور گانے والے اسے اس ڈھنگ سے اسے SHAPE نہیں کرتے ہیں۔ شبدوں کی پرانی بندشوں کے پیٹرن کو انھوں نے گایا لیکن اس میں انھوں نے راگ کے بھاؤ اور سُروں کے مطابق شبدوں کو کمپوز کر کے نئی بندشیں ہی بنائیں۔ ایک اور بات کہ انھوں نے نئے راگ نہیں بنائے۔ وہ خود بھی اس کا دعویٰ نہیں کرتے تھے۔ راگ تو موجود تھے۔ انھوں نے ان راگوں کو اپنی تخلیقی اُپج اور سنگیت کی جمالیات کے حوالے سے ان سُروں کے مختلف COMBINATION کر کے ان کے THEME تھیم کی بنیاد پر راگوں کو بنایا اور ان کے نام رکھے۔

سوہاسنی • میں تو یہ کہوں گی کہ کمار گندھرو کا ایک بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے اپنی تخلیقی اُپج کے بل بوتے اور اپنے تجربے کی بنا پر یہ دکھا دیا کہ گھرانوں کے باہر رہ کے بھی گائیکی ممکن ہے،

بھٹ • ان کے آلاپ کو سن کر یا ان کے الاپ کی شیلی کو دیکھ کر کسی گھرانے کی جھلک نہیں ملتی تھی لیکن دوسرے لمحے یہ بھی لگتا تھا کہ ان کی گائیکی میں سب گھرانوں کی جھلک بھی ہے۔ راگوں کی بڑھت تان لینے کا ڈھنگ، مُرکیوں اور گمک کو لینے کا انداز اور سرگم کہنے کا رنگ ان کا بالکل مختلف اور نیا تھا۔

سوہاسنی • ان میں ایک اور بات تھی کہ تین چار سُر لے کر ہم ان میں کتنے پیٹرن بُن سکتے ہیں، یہ انھوں نے کر کے دکھایا وہ چھوٹے چھوٹے بولوں کو بے شمار انداز میں ادا کرتے تھے۔ آدھی ماترا رہ جاتی تھی تو اس میں بھی وہ کوئی کمال دکھا دیتے تھے۔ کس نوٹ یا سُر پر رکیں، سُروں کا COMBINATION کیسے بنائیں۔ کسی دوسرے سُر پر اچانک رُک جانا اور پھر اس رُکنے کو یعنی نیاز کو وہ کبھی کبھی بدل دیتے تھے۔ کبھی وہ نی پر رُک جاتے اور کبھی گا پر۔ سُر ایک ہی ہوتا مگر اُن کا رُکنا اُسے کچھ عجیب ہی ڈائی منشن دیتا تھا۔ کافی بٹر یا جائیو سک وہ بلاول میں ایسی خوبصورت بندشیں کرتے تھے کہ حیرانی ہوتی تھی۔

ذہن جدید

ایک اور بات جو ان کے سنگیت کے بارے میں کہی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ موضوعاتی گائن کے بھی موجد تھے۔ چونکہ کلاسیکی موسیقی موضوع کو سامنے رکھ کے یا اسے مرکزی خیال کا درجہ دینے کی روایت سے خالی تھی۔

بھٹ • اس سلسلے میں میں یہ کہنا چاہوں گا کہ انھوں نے کئی برسوں پہلے ایک پروگرام ہولی پر اندور میں کیا تھا۔ ہولی کو ہم سب برج کی دین مانتے ہیں کیونکہ کرشن اور گوپیوں کا اور رادھا کا جتنا بھی پرسنگ ہے وہ سب برج میں ہوا تھا۔ کمار جی نے "مت مارو پچکاری" اس طرح سے عنوان رکھا۔ اور ساری بندشیں ایسی لیں جو ہولی کے رنگوں، جوش اور جذبے کو پیدا کرنے والی تھیں یعنی کرشن جب گوالوں پر رنگ ڈالتے ہیں تو کتنے بے باک تیز اور طرار ہیں، اور جب گوپیوں اور رادھا پر پچکاری چلاتے ہیں تو اس میں کتنی کومل تا اور رومانس تھا۔ کمار گندھرو نے یہ سب اپنے گانے اور گانے کی بندشوں سے ظاہر کیا ان کے گانے میں ایک پنٹیر کی سی خوبی تھی۔ وہ چیزوں کو مجسم یا پیکروں کی صورت میں دیکھتے تھے۔ اور پھر اسے اپنی گائیکی کے ذریعے ویسے ہی آکار دیتے تھے۔ یا ایک اور مثال لیجیے کہ پنہیارن کا ہمارے لوک جیون میں بڑی بھومیکا رہی ہے۔ عام طور سے نرتیہ میں یا پھر پنٹیر یا پھر شاعر پنہیارن اور اسکی چال، گاگر، پنگھٹ اور پانی بھرنے کو موضوع بناتے رہے ہیں۔ کمار گندھرو نے پنہیارن کو اپنی گائیکی کے حوالے سے اس طرح متحرک اور مجسم کرنے کی کامیاب کوشش کی جو ایک کتھک رقاص کرتا رہا ہے۔

سوہاسنی • موضوعاتی THEMATIC کی بات کرتے ہوئے آپ نے جو ان کی کلپنا شکتی کی بات کی ہے یا مصورانہ رویے کی بات کی ہے اس کے علاوہ موضوعاتی سنگیت کی پیش کش کیلئے یہ ضروری ہے کہ آرٹسٹ کو طرح طرح کا ریاض یا مشق ہو جیسے انھوں نے گوڈ ملہار کے بارے ایک پروگرام کیا تھا تو میں سمجھتی ہوں کہ اس پروگرام کو کرنے کے لئے انھوں نے بھاتکھنڈے اور دوسرے سبھی سنگیت کاروں کی کتابیں کھنگالی ہوں گی اور گوڈ ملہار کے مختلف روپ رنگ تلاش کئے ہوں گے تو میں کہنا چاہتی ہوں کہ



THEMATIC سنگیت کی پیش کش آسان نہیں ہے وہ خاص ریاض اور کلپنا مانگتی ہے۔ اس طرح انھوں نے مراٹھی تھیٹر کے مشہور گائیک بال گندھرو کے گائن کو بھی اپنایا۔ حالانکہ یہ بہت مشکل تھا اس لئے بال گندھرو کے گانے کا جو انداز تھا وہ بالکل مقرر اور بندھا ہوا تھا۔ کمار جی نے بال گندھرو کے سنگیت کو سنا اور پھر اسے اپنے انداز سے پیش کیا۔ ان کی نقل نہیں کی۔ "میں جو سمجھا ہوں بال گندھرو کو" یہ عنوان دے کر انھوں نے مراٹھی تھیٹر

کے اس عظیم فنکار کی گائیکی کو ایسے جی دار انداز میں پیش کیا کہ لوگ بے اختیار داد دے اٹھے اسی طرح انھوں نے بھگتی کوی سنت ٹکا رام ایک درشن، تلسی ایک درشن، ماوہ کی لوک دھنیں، رتو چکر ۱، ترمی وینی، گیت، ہیمنت، گیت وسنت، ٹھمری، ٹھپا، ترانہ جیسے عنوان دے کر بڑے کامیاب پروگرام کیئے تھے۔

• بھٹ — مجھے ایسا لگتا ہے کہ کمار گندھرو میوزک کی ترسیل COMMUNICATION کے حق میں تھے۔ ان کی سنگیت کی ہر پیش کش میں اس بات کو اہمیت بھی حاصل تھی اور ترجیح بھی کہ وہ جو کچھ گا رہے ہیں وہ سننے والے تک پہونچے۔ اس کی سماعت کا حصہ بنے۔ اور وہ اس کا آنند بھی لے سکے۔ وہ کیسے اپنے سنگیت کو عوامی رنگ دینے کی کوشش کرتے تھے۔ اس کی ایک مثال میں دوں کہ وہ ریل سے سفر کر رہے تھے اور کسی اسٹیشن پر قلی نے سامان اٹھانے سے متعلق ان کے کہے کو سُنا ان سُنا کر دیا اور تب ہی انھوں نے "لا دے لا دا دے" جیسی بندش کو رواج دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ جہاں ہم نے کلاسیکی سنگیت میں انگنت راگ اور بندشیں اپنائیں وہیں ایسی شبداولی بھی (بول) ہوں جو کرداروں کے بارے میں ہوں۔ اسی طرح ان سے ہم نے پوچھا کہ آپ نے بیہڑ بھیر دیں نام کیوں رکھا۔ کیونکہ بھیر ویں میں تو خود ہی ڈراونا پن اور خوفناکیت ہے تو پھر بیہڑ (سنسان) اس کے ساتھ لگانے کی کیا ضرورت تھی تو انھوں نے کہا میں نے بیہڑ اس کا یوں نام دیا ہے کہ جو نرجن اور سنسان میں بیٹھتا اور جو آدمی کی بھیانکتا۔ نظر آتی ہے اس میں اور بڑے شہروں کی بھیانکتا میں فرق ہے اس لئے انھوں نے بیہڑ شبد بھیر ویں کے ساتھ لگا دیا یا پھر انھوں نے گندھار کے ساتھ لگن بڑھا دیا تھا۔ تو یہ جو وہ راگوں کو نئی صورتیں دینے کے لئے اپنا اختراعی ذہن استعمال کرتے رہتے تھے تو اسکی وجہ یہی تھی کہ پرانا سنگیت اور اس کی کئی شیلیاں انھیں اپنے اظہار کے لئے ناکافی لگتی تھیں اور وہ اپنے اظہار کے لئے وسعتوں اور پہنائیوں کے متلاشی اور آرزو مند رہتے تھے۔ اسی لئے ان کا ولاس یا راگ ولاس ایک طرح کا ایسا سنگیت گرنتھ ہے جن میں لوک سنگیت، لوک سبھیتا یا سنسکرتی سے زیادہ اثر قبول کرتا ہے۔

• سوہاسنی — ان کی زندگی کا یہ پہلو بھی دلچسپ ہے کہ وہ جب ٹھیک ہوئے لمبی بیماری کے بعد تو انھوں نے کسی بڑے تجارتی شہر میں سکونت اختیار کرنے کی بجائے دیواس جیسے چھوٹے سے علاقے کو سکونت کے لئے پسند کیا۔ وہاں انھوں نے ایک چھوٹی سی پہاڑی پر اپنی بیوی کے نام پر بھانو کل، بنایا تھا۔ دیواس راجستھان اور مہاراشٹر کے قریب تھا تو وہاں کا انھوں نے لوک سنگیت بھی خوب سنا۔ جو ان کی گائیکی کی شیلی پر اثر انداز ہوا۔ اس لوک سنگیت میں اور خاص طور سے راجستھانی گیت جو ایک طرح کا سا لگتا ہے۔ جو پکار ہے۔ وہ ان کے یہاں بھی آئی۔ ان کا سنگیت ایسا تھا جو دھیرے دھیرے تیرتا ہوا ماحول اور فضا میں تحلیل ہو جاتا تھا۔ وہ مار وجی کا مار وجی کچھ اس ڈھنگ سے لگاتے تھے کہ سننے والے بے چین ہو اٹھتے تھے۔

ان کا بھگتی سنگیت بھی بے مثال تھا۔ انھوں نے نرگن بھجن گائیکی میں کمال کیا تھا۔ یہ کم لوگ جانتے ہیں کہ وہ سنگیت کے ساتھ ساتھ بھگتی درشن میں بھی ڈوبے ہوئے تھے۔ انھیں بھگتی کے جتنے بھی مرحلے یا منزلیں ہوتی ہیں ان سب کا انھیں عرفان اور گیان تھا۔ بھگتی میں کیرتن، اسمرن، بھجن، پوجا، ارچن یہ کئی روپ ہیں مگر انھوں نے نرگن کو چنا ان کا ایک پروگرام تروینی بڑا مقبول ہوا تھا جس میں انھوں نے میرا، جو سگن بھگتی دھارا کی شاعرہ تھیں اور کرشن کی دیوانی اس کے بھجن اور پھر بالکل اُس کے متضاد انھوں نے نرگن کوی کبیر کو لیا اور پھر انھوں نے مریاداہ پرشوتم کے گائیک تلسی کو لیا تھا۔ "رگھوور کی ساھاو تی یا تیرا میرا منوا کیسے ایک ہوئے رے تو کہتا کاغذ کی دیکھی میں کہتا انکھین کی دیکھی۔ انھوں نے بھیر دیں اس کی بیسک کمپوزنگ بنائی ہے۔ اگر وہ گھرانے دار ہوتے تو وہ کومل سر لگائے سیدھے بھیرویں یا مشر بھیرویں میں بنا کے وہ اس امتزاج کو امر کر سکتے تھے۔ مگر وہ اس لیے امر ہوئی ہے کہ انھوں نے اس میں دو چیزیں لی ہیں۔ تیرا میرا من ایک ہوئے رے، ہوئے رے۔ کی بات جب وہ کہتے تھے تو ان کے اندر کی بھگتی کی بھاؤ امڈ پڑتی تھی۔ یہ سچی بات ہے کہ وہ نرگن دھارا کے بے مثال بھگتی گائیک تھے اور انھوں نے اس شیلی میں جیسا اور جتنا گا لیا ہے وہ زندہ رکھنے کے لئے کافی ہے۔

سوہاسنی • کمار جی کے بارے میں یہ بہت بڑا سوال ہے کہ ان کی گائیکی آگے چلے گی کوئی گا سکے گا، یا اس کا کوئی اثر باقی رہے گا یہ کہنا بڑا کٹھن ہے کہ کوئی ہو بہو ان کی طرح سے گا سکے گا کچھ نئے کلاکار جن کا کلا تیار ہے جن کی آواز کے SHADES ان کی آواز سے ملتے جلتے ہیں۔ وہ ان جیسا بننے کا ریاض ضرور کرتے ہیں۔ ہم جانتے تو ہیں کہ وہ کیسے اور کس طرح گاتے تھے مگر یہ راز جان لینے کے بعد بھی اگر کوئی ان جیسا گانے کی کوشش کرے تو کامیاب پھر بھی نہ ہو گا

باقی صفحہ ۱۹۷

فلم میں کام کرتے ہوئے دوسرے مشاغل کے لئے وقت کم ملتا ہے لیکن میں پھر بھی وقت نکالتا ہوں اور اپنی صحت اور اس کے حوالے سے خود کو صحت مند رکھنے کو ترجیح دیتا ہوں۔ اور خود کو چاق و چوبند اور چست رکھنے کے لئے بیڈمنٹن کھیلتا ہوں۔ ایک اور بات میں اپنے ماضی کو بھی یاد رکھتا ہوں۔ اسی لئے مجھے جب بھی وقت ملتا ہے میں اپنے عزیزوں، پرانے شناساؤں سے ملتا ہوں۔ چونکہ فلمی دنیا میں بڑی حد تک دکھاوا ہے۔ یہاں کا ماحول بڑا کاروباری اور مصنوعی ہے تو میں اس طرح غیر فلمی ماحول میں خود کو پانے میں خوشی محسوس کرتا ہوں۔ میں فلم میں جب آیا تھا تو اس دنیا کی ایک عجیب رومانٹک تصویر میرے ذہن میں تھی جو یہاں آ کر لوگوں سے مل کر بڑی حد تک ایک دھوکہ سا مجھے لگی تھی۔ یہاں میں نے محسوس کیا کہ لوگ اسکرین پر نقلی کردار کرتے کرتے ان کی زندگی بھی نقلی اور کھوکھلی ہو گئی ہے۔ میں کبھی کبھی اس ماحول سے اکتا کر بے ساختہ یہ شعر پڑھنے لگتا ہوں۔

میرے دستِ طلب کو جرأت گستاخ دے یارب
یہاں دستِ دُعا کی عاجزی سے کچھ نہیں ہوتا

کتابوں کی باتیں

زبیر رضوی

URDU AND MUSLIM SOUTH ASIA
EDITED BY CHRISTOPHER SHACKLE
Rs. 190/-

• کرسٹوفر شیکل لندن یونیورسٹی میں جنوبی ایشائی زبانوں کے پروفیسر ہیں، یہ کتاب انھوں نے ہی مرتب کی ہے۔ اس میں چودھری محمد نعیم خالد حسین قادری اور محمد عمر میمن کے ساتھ ساتھ زیادہ ایسے غیر اردو والوں کے مضامین ہیں جو برطانیہ، امریکہ اور کناڈا میں اردو زبان وادب کے مطالعے میں مصروف ہیں کرسٹوفر شیکل نے بجا طور پر اس کتاب کو رالف رسل کے نام معنون کیا ہے، جن کی پوری زندگی اردو زبان وادب کے مطالعے میں گذری، یہ کتاب اردو ادب والوں کے مقابلے میں مغرب یا کسی اور خطے میں اردو زبان وادب سے دلچسپی رکھنے والے غیر اردو والوں کے لئے خاصی مفید ہوگی اور دلچسپ بھی۔

THREE INDIAN POET
BY BRUCE KING
Rs. 95/-



• بُرس کنگ نے ۱۹۸۷ء میں 'ماڈرن انڈین پوئٹری ان انگلش' میں آزادی کے بعد ہندوستان میں انگریزی میں لکھی گئی شاعری کا تفصیلی جائزہ لیا تھا۔ اس بار برس کنگ نے انگریزی کے صرف تین شاعروں کا مطالعہ کیا ہے۔ یہ شاعر ہیں۔ اے۔ کے۔ رامانوجن، نسیم ایزیکیل اور ڈام موریس۔ کنگ نے ان کی شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے ان شاعروں کے سوانحی پہلوؤں کو بھی ان کے شعری خام مواد کا نام دیا ہے۔ کنگ نے ڈام موریس پر انگریزی شاعروں کی رومانوی تحریک کے اثرات تو ڈھونڈ لیے مگر وہ ان شاعروں کے ڈکشن اور ان کی شاعرانہ ترجیحات پر روشنی نہیں ڈال سکے۔

BEASTLY TALES FROM
HERE AND THERE
By VIKRAM SETH



• وکرم سیٹھ نے دی گولڈن گیٹ، منظوم ناول لکھ کر اچھی خاصی شہرت کما لی تھی۔ اس کے بعد ان کا شعری مجموعہ ALL YOU SLEEP TONIGHT آیا جس کا ادبی حلقوں میں چرچا تو ہوا مگر وہ ہلکا اور ماورائی احساس کا حامل تھا۔ اس بار وکرم سیٹھ نے کچھ لوک کہانیوں کے طرز کی کہانیوں کو منظوم کر کے انھیں عصری سوچ اور مسائل سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی ہے، ان منظوم کہانیوں میں کہ جو جانوروں کے درمیان گفتگو یا ان کے احساس سے متعلق ہیں کچھ ایسی بھی ہیں کہ جو شعریت اور نغمگی سے عاری ہیں۔ مشہور کارٹونسٹ روی شنکر نے ان کہانیوں کو اپنے انداز سے بنایا ہے۔ اس کا خیال ہے۔ ہر انسان میں ایک حیوان اور ہر حیوان میں ایک انسان چھپا ہوتا ہے۔ وکرم سیٹھ نے شاید اسی خیال سے کہانیوں کو منظوم انداز میں لکھنے کی

کوشش کی ہے۔ ان کہانیوں میں THE ELEPHANT AND THE TRAGOPAN سب سے اچھی منظوم کہانی ہے۔

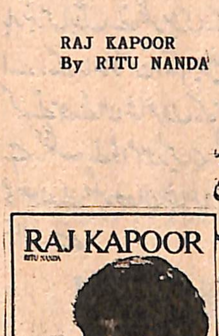
SHOW BUSINESS
By SHASHI THAROOR
Rs. 195/-



• ششی تھارور نے پچھلے سال شائع ہونے والے ناول میں مہابھارت کو موضوع بنایا تھا۔ اس ناول کا خام مواد تھارور نے بی۔ لال کے مہابھارت کے ترجمے سے لیا تھا۔ اس بار تھارور کا موضوع فلم ہے۔ ہندوستانی فلمی صنعت میں کیا کچھ ہوتا ہے۔ اس میں کتنی روشنی اور کتنا اندھیرا ہے۔ وہ اس ناول میں کس قدر کھلے انداز میں کہنے کی کوشش کی ہے۔ ششی تھارور کا ایک مسئلہ یہ ہے کہ وہ بیک وقت محبت، سیاست، قومیت، سماجی استحصال سب ہی پر ایک سانس میں تبصرہ کرنے کے عادی ہیں۔ ان کا یہ ناول کسی بھی فکر آمیز سوچ سے خالی ہے۔ اور کسی دیرپا تاثر کا حامل نہیں ہے۔ جو کچھ فلم اور سیاست کے تعلق سے اشوک اور دوسرے کرداروں کے حوالے سے قاری تک پہونچانے کی کوشش کی گئی ہے وہ سب کچھ نیا یا چونکانے والا نہیں ہے۔

RAJ KAPOOR
By RITU NANDA

• راج کپور کے بیاگرافر BUNNY REUREN نے لکھا تھا: راج کپور اپنی زندگی میں ایک داستان بن گئے ہیں۔ روس اور چین میں تو لوگ زیادہ تر ہندوستان کو راج کپور کے حوالے سے جانتے ہیں۔ ہندوستانی پریس انھیں اپنے زمانے کا سب سے بڑا شومین کہتا تھا۔ ان کی بیٹی ریتو نندہ نے تصویروں کے حوالے سے راج کپور کی زندگی کے بے شمار پرکشش، تہہ دار اور سانس لیتے ہوئے پہلوؤں کو اس کتاب کے ذریعے اجاگر کرنے یا انھیں یادگار بنانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ راج کپور کی زندگی ایک شوٹنگ اسکرپٹ کی طرح تھی جس میں ہر واقعہ ہر منظر اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ رنگ، آواز اور حرکت کی صورت میں آنکھ کے روبرو سمٹ کر آجاتا ہے۔



راج کپور خود بھی ہندوستانی فلمی صنعت میں ایک MYTH تھے اور MYTH MAKER بھی۔ راج کپور نے کہا تھا۔ نرگس میرے لئے تحریک کا سرچشمہ تھی۔ جبکہ میری بیوی میرے لئے طاقت کا سرچشمہ رہی۔ میرے لئے میری سب ہی ہیروئنیں تحریک کا سرچشمہ ہیں۔ میری بیوی میری اداکارہ نہیں بن سکتی اور نہ ہی میری اداکارہ میری بیوی۔ ریتو نندہ کی یہ کتاب آر کے۔ اسٹوڈیو کے علاوہ روس میں بھی چھپی ہے۔

THE PAINTED FACE
By CHIDANANDA DAS GUPTA
Rs. 295/-



• چدانند داس گپتا ہندوستانی سینما کے ان نقادوں میں سے ہیں جنھوں نے عوام کی تفریح کے لیے بننے والی فلم کو ناجائز کے زمرے میں نہیں رکھا۔ انھوں نے ہندوستانی فلم سازی کے ہر دور کا جو تجزیہ کیا ہے۔ وہ ہماری مقبول اور نامقبول فلموں کو سمجھنے میں یقینی طور سے معاون ہے۔ اپنی اس کتاب میں چدانند داس گپتا نے ہندوستانی تہذیب، ثقافت اور اس کے سماجی تناظر میں رکھ کر مقبول اور پسند کی جانے والی فلموں کا بڑے غیر متعصبانہ انداز میں جائزہ لیا ہے۔ ہندوستانی فلم سازی کا اولین دور، پھر آزادی کے بعد کا دور، اور پھر آج کا دور، ان تین حصوں میں ہندوستانی فلم، اس کے موضوعات، ان کی سماجی معنویت، ہدایت کار اور اس کی سائیکی اور ہندوستانی معاشرت کی عکاسی اور تصویر کشی کے سلسلے میں اس کے تاملات اور کلیشے یہ سب اس کتاب میں زیر بحث ہیں۔

چدانند داس گپتا نے اصل میں بمبئی میں بننے والی فلموں کو ہی اپنی گفتگو کا موضوع بنایا ہے۔ ویسے کلکتے اور مدراس کے مرکز بھی اس میں زیر بحث آئے۔ ہندوستانی فلم سازی کے رجحانات اور رویوں سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہ کتاب کار آمد ہے۔

درخت آدمی (افسانے)
منشا یاد
پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساونڈز
۲۵۔ لوئر مال۔ لاہور

منشا یاد کے کتابوں کی صورت میں افسانوں کی تعداد ایک سو سے اوپر ہے۔ 'درخت آدمی' ان کے افسانوں کا چھٹا مجموعہ ہے جس میں ان کے بیس افسانے شامل ہیں۔ پچھلے سال 'اوراق' لاہور نے اپنے ایک خاص نمبر میں ان کے افسانوں کے تجزیے بھی شامل کیے تھے۔ مظفر علی سید اور وزیر آغا دونوں ہی یہ مانتے ہیں کہ منشا کے یہاں موضوع کا حیران کن تنوع ہے، وزیر آغا نے اس تنوع کو اخباری رپورٹر کے یہاں پائے جانے والے تنوع سے مختلف قرار دیا ہے۔ موضوع کے تنوع کے ساتھ ساتھ دونوں نقادوں نے یہ اعتراف بھی کیا ہے کہ منشا کے بیشتر افسانوں کا موضوع گاؤں اور گاؤں کے حوالے سے زمین اور اس سے وابستہ معاملات ہیں۔ منشا خود بھی اپنے زیادہ تر افسانوں میں ایک کشادہ دیہاتی فضا کے موجود ہونے کا ذکر کرتے ہیں۔ درخت آدمی کے افسانے پڑھتے ہوئے مجموعی طور پر گاؤں کی فضا کا احساس تو یقینی طور پر ہوتا ہے لیکن افسانوں میں واقعات اور ان کے تانے بانے تجربے اور مشاہدے کے جال کو دور تک پھینکے جانے کا احساس دلاتے ہیں۔ منشا کے افسانوں کی خوبی یہ ہے کہ وہ بظاہر اکہرے ہوتے ہوئے بھی اپنے اندر کئی طرح کی معنوی تہہ داری بھی رکھتے ہیں۔ وہ افسانے کو افسانہ پہلے بناتے ہیں لیکن ایسا کرتے ہوئے ان کے ہاتھ نیچے ہی نیچے دوسری سطح بھی بنتے چلے جاتے ہیں۔ آپ چاہیں تو افسانے کو اوپر سے چھو کر گذر جائیں یا پھر بند مٹھی کو کھول کر اس میں چھپے کھنک دار سکّے کو اپنی ہتھیلی پر لے آئیں۔ افسانہ نہ ہوا شاعری اس میں رمزیت اور تہہ داری کے پھول کھلائے بغیر بعض

افسانہ نگاروں اور شاعروں کو تخلیقی ناآسودگی کا احساس ہوتا ہے منشا، کے افسانے اپنی معنوی تہہ داریوں کو متجسس قاری پر کچھ ایسے سبک انداز میں منکشف کرتے ہیں کہ آپ کو وہ تہہ داریاں بہت دیر تک حیران کئے رہتی ہیں۔ آپ دائیں بائیں دیکھتے ہیں کہ شاید افسانہ نگار اس انکشاف میں آپ کی خود بھی مدد کرے لیکن وہ تو افسانے کے آخری جملے کے بعد آپ کا ساتھ اچانک چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ باقی آپ دیکھیں کہ کھودنے پر چوہا نکلتا ہے یا پہاڑ۔ میں نے جب جب منشا کے افسانوں کو پڑھا ہے تو مجھے عموماً یہ لگا کہ بات وہ نہیں جو افسانہ جھولی میں ڈال گیا۔ بات شاید وہ ہے جسے افسانہ نگار نے ایک دو گرہیں ڈال کر ہمیں کھولنے کے دیدیا ہے۔ اس سلسلے میں ان کے دو افسانے "پھولوں سے لدی شاخیں" اور "سینگ اور سرگم" کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ بقول وزیر آغا پہلا افسانہ ماضی کا حال پر حاوی ہونا ہے یا قدیم کا جدید کو اپنے اندر جذب کر کے معاشرتی اکائی کو بحال کرنا ہے مظفر علی سید کے خیال میں یہ انسانوں کی حیوانیت یا حیاتیاتی تقاضوں کے بارے میں لکھا ہوا ایک نازک سا نفسیاتی مطالعہ بن جاتا ہے۔ افسانہ ان نتائج تک پہنچنے میں مدد تو دیتا ہے۔ لیکن افسانے میں بلّی جس سیاسی جبریت کا استعارہ بنتی ہے اس کا احساس پاکستان کے سیاسی نظام (فوجی آمریت اور مارشل لا) پر نظر رکھنے والوں کو ہونا قدرتی ہے۔ بلّی کا دو بار دربدر یا شہر بدر ہونا پھر اسکی واپسی اور چھوٹی بہو کا دودھ کی کٹوری لے کر اس کا استقبال کرنا۔ پاکستان میں ایوب خاں کی فوجی حکومت، اس سے نجات اور پھر ضیاءالحق کے روپ میں فوجی آمریت کی دوبارہ واپسی اور اس کو ایک دائمی سیاسی نظام کے طور پر قبول کرنا۔ کچھ عرصے کے لئے بھٹو حکومت کی صورت، جمہوریت کی بحالی کے واضح اشارے ہیں۔ ایک موڑ آیا تھا جب یہ لگا کہ پاکستان میں اب فوج دوبارہ اقتدار میں نہیں آئے گی اس خیال سے بلّی ایک دوسرے ہی شہر میں پھنکوا دی جاتی ہے ایک ریل کے ذریعے۔ مگر دور دراز علاقے کے لوگ اس نیم مردہ جسم میں دودھ کے کٹورے انڈیل دیتے ہیں۔ بلّی ریل کی پٹڑی کے راستے واپس اپنے پالتو گھر میں لوٹ آتی ہے۔ یہ پاکستانی سیاست میں امریکی دلچسپی کو ظاہر کرتا ہے۔ بڑی اماں (بنیاد پرست) اسے دیکھ کر چیخ پڑتی ہیں، بڑی بہو (اعتدال پسند) کے چہرے پر مسکراہٹ آجاتی ہے۔ اور چھوٹی بہو (شریف نواز طرز کا سیاسی گروپ) فوجی آمریت کی واپسی سے سمجھوتے کر لیتی ہے۔ اس زاویئے سے افسانے کی گرہیں کھولیں تو افسانہ کئی ڈائی مینشن میں پھیلتا بڑھتا محسوس ہوتا ہے۔

"سینگ اور سرگم" افسانہ بھی پاکستان کے شدید مارشل لا ضابطوں اور اس زمانے میں سنسر کی سخت ترین پابندیوں، فنون لطیفہ سے اسلام اور شریعت کے نام پر نفرت اور اس کے مظاہروں پر پابندی، پاکستانی معاشرے کو سیاسی بصیرت اور بصارت دونوں سے محروم رکھنے کی حکمراں ٹولے کی شعوری کوشش، افسانے کی بنیادی سوچ ہے۔ منشا کے نزدیک حکمراں طبقہ اس وقت تک اپنی آنکھ اور کان بند رکھتا ہے جب تک کہ باہر سے شور ہنگامے، اور کسی خوں ریز منظر سے اس کے اقتدار اور سیاسی مفاد کو خطرہ لاحق نہیں ہوتا۔ ایسی ہی صورت حال ہے جب افسانے کا کردار بادشاہ، ہونے والے اپنے بچے کے بے کان کے پیدا ہونے کے امکان اور خطرے سے پریشان ہو اٹھتا ہے۔ یہاں افسانہ نگار آمرانہ جبریت پر ایک کڑی ضرب لگاتے ہوئے بادشاہ کے بیٹے کو پیدا ہونے کا عذاب اس طرح دیتا ہے کہ اس کے کان بھی نہیں ہوتے، اور آنکھیں بھی، ظاہر ہے یہ استعارہ ہے کہ آنے والے دنوں میں آمریت اور اس کی جبریت کی عمر بے حد مختصر ہے۔

ذہن جدید

کربلا تا کربلا (مرثیے)
وحید اختر
۱۲۰ روپے
زرافشاں۔ دودھ پور، علی گڈھ

وحید اختر بے حد خلاّق ذہن رکھتے ہیں۔ لکھنے کے معاملے میں اُن کا قلم ہمہ جہت ہے۔ ان کا نظم و نثر کا سرمایہ، موضوع، اسلوب اور ہیئت کے تجربوں کے اعتبار سے وسعتوں کا حامل ہے۔ کربلا تا کربلا ان کے سات طویل مرثیوں کا مجموعہ ہے جو انھوں نے ۱۹۷۶ میں مولانا سید کلب عباس کے ایک جملے کو سن کر لکھنے شروع کئے تھے آخر کا آٹھواں مرثیہ دُر حالِ مظلوبانِ شہادت ہے۔

مجھے لگتا ہے کہ ان مراثی کو شائع کرتے ہوئے وحید اختر کو کئی طرح کے خوف اور خطرے لاحق تھے۔ اسی لئے انھوں نے پیش گفتار میں پہلے تو (یہ ان کا مزاج ہے) اپنے مرثیوں کے غیر معمولی ہونے کا احساس اور یقین دلانے کے لئے ان مجالس اور عزاداروں کے ردِعمل کو ثبوت اور دلیل بنایا ہے۔ جو ذکرِ شہادت میں بقول اُن کے سند کا درجہ رکھتے ہیں پیش گفتار کے دوسرے حصے میں وحید اختر نے اپنی مرثیہ گوئی کا تخلیقی جواز دینے کی بڑی مدلّل کوشش اور وضاحت کی ہے، انھوں نے ولی کا شعر دھرایا ہے کہ راہِ مضمون تازہ کبھی بند نہیں ہوتی۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ کبھی کوئی شعری ہیئت یا موضوعی اظہار کسی ایک عہد یا ایک شخص تک محدود ہو کے نہیں رہ جاتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ مرثیہ کی دنیا میں انیسؔ اور دبیرؔ کی آمد ایک شیر کی آمد تھی کہ ان کی آواز کی ضربوں نے دور تک اور دیر تک کسی آواز کو سماعتوں تک پہونچنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔ اور عزائی ادب میں حرفِ آخر سمجھے جانے لگے تھے۔ لیکن جوشؔ کے حسینؑ اور انقلاب نے کیسے سماعتوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ اس سلسلے میں وحید اختر کا کہنا ہے کہ "کربلا میرے وجود کا حصہ ہے۔ یہ جنگ خود میرے اندر جاری ہے۔ میرے باطن میں یزید بھی ہے۔ اور اس کے حواری بھی، حسینؑ بھی ہیں اور ان کے ساتھ شہید ہونے والے بھی۔ میرے مرثیے اسی داخلی کش مکش اور معرکے کے شعری اظہارات ہیں"۔

مرثیہ تخلیق کی سطح پر خلاق ذہن کی شرط تو لگاتا ہی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اس بات کا تقاضا بھی کرتا ہے کہ مرثیہ گو کا عقیدہ محکم ہو اس کا جذبہ صادق اور شہدا، سے اس کا تعلق جذباتی سطح پر بے حد اٹوٹ اور پر خلوص ہو۔ اگر واقعاتِ کربلا تخلیقی سطح پر مرثیہ گو کے جذبے، احساس اور عقیدے کا وجودی حصہ نہیں ہیں۔ تو پھر لکھا جانے والا مرثیہ ایک کلیشے ہی کہا جائے گا۔ انیس اور دبیر کے بعد آنے والے مرثیہ گو بجز جوش کوئی بات پیدا نہ کر سکے تو اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ ان کے لئے کتابوں میں لکھا ہوا واقعہ تھا جسے وہ انیس اور دبیر کی ہی شعری حسیت اور لفظیات کو مانگ کر عزا خانوں میں اور عزا کی مجالس میں سناتے رہے تھے۔

مرثیے کی ہم عصر معنویت اور جدید شعری طرزِ اظہار سے اُس کی مناسبت کے بارے میں وحید اختر کا یہ جواز بامعنیٰ ہے کہ اگر سقراط کا زہر پینا، رام کا بن باس اور گوتم کا نروان آج کی شاعری میں موضوع کے طور پر برتا جا سکتا ہے تو واقعہ کربلا کیوں نہیں ؟۔

وحید اختر کے مراثی مسدس کی مقبول صورت میں ہیں، یہ اپنے خد و خال میں انیس و دبیر کے مراثی سے مشابہ بھی ہیں، اور کہیں جوش کے ناک نقشے کو بھی اپناتے ہیں۔ کہ اس راہ سے گذرے بغیر مرثیے کی وادی میں قدم رکھنا کسی بھی شاعر کے لئے ممکن نہیں۔ لیکن یہ بات بھی سچ ہے کہ وحید ان مرثیوں کو اپنی زبان اپنا کرب اپنا ملال، اپنا ماتم، اپنے آنسو اور اپنی چیخ دینے میں کامیاب ہیں۔ وحید اختر کے مرثیے مجھے تو ایک نیا شعری تجربہ اور اظہار معلوم ہوتے ہیں، اور جذبے کی فراوانی اور رنج و غم کی تہہ داریوں سے لبالب بھرے ہوئے ہیں

ذہن جدید فورم

• ذہن جدید فورم نے پچھلے مہینوں میں پاکستان سے آنے والے دو ادیبوں شہزاد احمد اور انتظار حسین کو مدعو کیا دلی کے اردو ادیبوں کے علاوہ انھیں ہندی، پنجابی، اور سندھی کے ادیبوں سے ملنے کا موقع بھی فراہم کیا۔ پچھلے ماہ لندن سے آئے ساقی فاروقی ذہن جدید کے تیسرے مہمان تھے۔ اس فورم کا مقصد مختلف زبانوں کے تخلیقی ادیبوں کے درمیان رابطے INTERACTION کو فروغ دینا ہے کیونکہ ہمارا امزاج یہ ہے کہ ہم صرف اپنی ہی کتابیں اور رسالے پڑھ کر اور اپنے ہی وضع قطع کے لوگوں کے درمیان بیٹھ کے اکثر اس غلط فہمی میں مبتلا رہتے ہیں کہ سورج ڈوبنے کا بھی یہی آخری کنارا ہے اور ہمارے ہفت خواں طے کرنے کا بس یہی آخری موڑ تھا جو ہم نے سر کر لیا۔ ہم نے اس INTERACTION کو رسمی نہیں بنایا کہ بے تکلفی اور آلتی پالتی، مار گے جو باتیں ہوتی ہیں وہ تنقیدی آلائشوں اور آلودگیوں سے صاف ہوتی ہیں۔ ہمارے درمیان غیریت بھی سر نہیں اٹھاتی اور مخاطب کے لہجے کے نامانوس ہونے کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ ہم نے ایک بات اور بھی کی اور وہ یہ کہ فورم میں شریک ہونے والے کا مہمان سے پہلے تھوڑا سا تعارف بھی کرا دیا تاکہ اسے بھی معلوم ہو کہ اسے کن آشفتہ سروں کے روبرو اپنی حکایتِ جنوں کہنی ہے۔ اس کے ساتھ کوشش یہ بھی ہوتی ہے کہ مہمان بننے والے ادیب کی جملہ تخلیقات کو نمایاں طور سے DISPLAY بھی کر دیا جائے تاکہ سرخیِ خارِ مغیلاں دیکھ کر اندازہ ہو سکے کہ دیوانہ کہاں سے کہاں تک پہونچا ہے۔ ہم ان تینوں مہمانوں کے ساتھ گفتگو کا خلاصہ پیش کر رہے ہیں •

میری غزل، غزل سے وابستہ کلشے پر ضرب لگاتی ہے

شہزاد احمد ———

شہزاد احمد نے اپنی غزل کے حوالے سے باتیں کرتے ہوئے اس صنف میں چھپی زرخیزی کا اعتراف کیا ان کا خیال تھا کہ غزل اتنا لمبا سفر طے کرنے کے بعد بھی تھکی نہیں ہے۔ اس میں بڑی شاعری ہونے کے باوجود بڑی شاعری کرنے کے امکانات ختم نہیں ہوئے۔ شہزاد احمد نے اسے خلاقی یا خلاقانہ شان ماننے سے انکار کیا کہ غزل میں بحروں، ردیف، قافیے یا لفظیات کی بہتات یا تنوع شاعرانہ خوبی ہے۔ انھوں نے اس سلسلہ میں غالب کی مثال دی کہ غالب نے نہ زیادہ بحریں استعمال کیں اور نہ ہی ردیف و قافیے کے کرتب دکھائے نہ ہی اس نے لفظوں کی بھرمار کی۔ جو غزل اس نے لکھی وہ ایک ایسے شفاف پانی کی طرح ہے جس میں زندگی اپنے عکس کو پوری جزئیات کے ساتھ دیکھ سکتی ہے۔ شہزاد احمد نے اپنی غزلوں کے حوالے سے بات کہی کہ انھوں نے غزل سے وابستہ کلشے پر ضرب لگائی۔ اس لئے ان کی غزل اپنے عہد میں لکھی جانے والی عمومی غزل سے مختلف کہی گئی۔ سائنس اور جدید ٹیکنالوجی سے اپنے فطری شغف اور اس موضوع پر اپنی

کئی کتابوں کا حوالہ دیتے ہوئے شہزاد احمد نے کہا کہ آج کے ادیب کو کچھ ایسی سچائیوں کے رُوبرو آنا پڑا ہے جو متقدمین کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھیں۔ آج کے ادیب کو بڑھتے پھیلتے اور ہر آن بدلتے ہوئے انسانی حیات کے منظر نامے پر نظر رکھنی ضروری ہے۔ یہ سب کچھ خام مواد بھی بن سکتا ہے۔ نہ بھی بنے تب بھی سوچ اور فکر کی تہہ داریوں میں ہل چل مچانے کے لئے تو بہت کچھ ہے۔

فکشن کا مغربی اسلوب میری سوچ سے ہم آہنگ نہیں ہو سکا

انتظار حسین

انتظار حسین نے ہندی کہانی کار راجندر یادو کے پہلے ہی سوال کے جواب میں کہا کہ مجھے پہلی بار ہندوستان میں کئی زبانوں کے ادیبوں کا سامنا ہے اور مجھے یہ اعتماد ہے کہ دلی والے میرے ساتھ اچھا سلوک ہی کریں گے کہ یہ شہر کوفہ نہیں ہے۔ انتظار حسین کی کہانیوں میں ماضی اور حال کے متعلق سوال کا جواب دیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ان کے لئے یہ بتانا ممکن نہیں کہ ان کی کہانیوں میں ماضی اور حال کے درمیان خطِ امتیاز کون سا ہے اور کب حال شروع ہوا اور کب ماضی گزر گیا۔ مجھے کہانی لکھتے وقت یہ احساس ہی نہیں ہوتا کہ میں کب ماضی سے حال میں یا پھر حال سے ماضی میں چلا گیا ہوں۔ یہ بات دراصل میرے قاری کو پریشان کرتی ہے یا پھر اُس سے زیادہ نقّاد کو۔ میں نے "آخری آدمی" کہانی لکھی تھی تو اس کی بنا پر مجھ پر خاصے لٹھ برسے تھے کہ یہ کس زمانے میں ہمیں لے گیا ہے اور اس کا ہمارے حال سے کیا تعلق ہے۔ تو میری کہانی تو ہمیشہ ہی ماضی پرستی کے الزام کو جھیلتی رہی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ الزام لگانے والے خود ہی اس کی توجیہہ اور تجزیہ بھی کرتے رہے ہیں۔ یہاں بلراج کومل نے پوچھا کہ اگر حال اور ماضی اس قدر گڈمڈ ہو گئے ہیں تو پھر آپ کی کہانی میں ماضی اس قدر حاوی کیوں ہے۔ انتظار حسین نے کہا کہ میں اس کا جواب دے چکا ہوں کہ مجھے خود لکھتے وقت تو اس کا احساس نہیں ہوتا میں تو وقت کے سیل میں بہہ جاتا ہوں کہ وقت مجھے حال یا ماضی کی چاپ سنتے نہیں دیتا۔ دراصل میں خود کو ایک پورے عہد میں سانس لیتے ہوئے محسوس کرتا ہوں۔ یہ تو آپ ہیں جو اسے ماضی، حال میں تقسیم کر رہے ہیں۔

کرشن چندر کے قلم نے سب سے کمزور افسانے لکھے

انتظار حسین نے مجرّد اور بڑی حد تک انشائیہ نما کہانی کے کمزور دور سے متعلق سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ دراصل ۳۰ اور ۴۰ کے درمیان جو کہانی لکھی گئی تھی ہمارے لکھنے والے اس سے باہر نکلنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ چنانچہ جب یہ طرزِ نگارش ۵۰ تک آیا تو لگا کہ یہ کہانی اور اس کے لکھنے کا ڈھنگ بے جان ہو گیا ہے یا پھر جیسے ٹھہراؤ آ گیا ہے اسی کے پیشِ نظر حسن عسکری نے جمود کا خدشہ ظاہر کیا تھا اور جب اس خدشہ کو دور کرنے کے خیال سے نئی کہانی لکھنی شروع ہوئی تو آپ کو احساس ہوا کہ کہانی کا زوال آ گیا۔ اصل میں کہانی کا زوال تو اس وقت شروع ہوا تھا جب کرشن، منٹو اور بیدی کے اسلوب میں کہانی لکھنے پر اصرار کیا جانے لگا تھا۔ اس نسل نے (کرشن والی) اپنے پیش روؤں کی انشائیہ نما کمزور

کہانی سے چھٹکارا پایا اور ایک نئے اسلوب میں کہانی لکھی اس نسل کے باغی پن کو قبول کر لیا گیا لیکن جب ایک اور نسل نے اپنے عہد کے مروجہ اسلوب سے انحراف کیا تو اسے DECADENT سے تعبیر کیا گیا اور اسے باغی ہونے کے حق سے محروم کر دیا گیا۔ یہ بات ہم اور آپ جانتے ہیں کہ جب کوئی نیا رجحان آتا ہے تو اس کے ساتھ بہت سا خس و خاشاک بھی آجاتا ہے۔ علامتی اور رمزیہ افسانے میں اگر TRASH لکھا گیا ہے تو اس سے پہلے کے افسانے میں بھی TRASH کم نہیں تھا۔ میں آپ کے کہنے سے اس دور کی کہانی اور کہانی کار کو بے وقعت یا بے معنی کیسے کہہ سکتا ہوں! اس دور میں سریندر پرکاش بھی آئے اور خالدہ حسین جیسی افسانہ نگار بھی میرے خیال میں سب سے کمزور افسانے تو کرشن چندر کے قلم سے لکھے گئے ہیں۔ یہاں راجندر یادو نے قطعی لہجے میں یہ بات دہرائی کہ انتظار حسین جب یہ کہتے ہیں کہ وہ وقت کے سیل میں بہہ کر کہانی لکھتے ہیں۔ اور وہ نہیں جانتے کہ ماضی اور حال میں خطِ فاصل کہاں ہے تو وہ دراصل PRETEND کرتے ہیں کیونکہ لکھنے والا یہ بہر حال جانتا ہے کہ وہ کیا لکھ رہا ہے اور کیوں لکھ رہا ہے۔

انتظار حسین نے اپنی کہانیوں میں داستانوں اور جاتک کتھاؤں کے اسلوب کی بازگشت سے متعلق سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ اردو فکشن لکھنے والے کی بدقسمتی یہ رہی کہ اسے اپنی روایت کا عرفان نہیں ہونے دیا۔ نقادوں نے اسے گمراہ کیا اور سب سے پہلا جرم ڈپٹی نذیر احمد سے سرزد ہوا تھا۔ جب انھوں نے داستانوں کے سرمائے کو نذرِ آتش کرنے کی تحریک دی تھی۔ اس کے بعد ترقی پسند نقادوں نے اردو فکشن کے ماضی اور اس کی روایت سے انکار اس طرح کیا کہ اسے بے معنی قرار دیدیا اور یہ بھی کہا کہ دراصل فکشن کی اگر کوئی روایت ہے تو وہ مغرب میں ہے۔ اور مغرب کے فکشن کا حوالہ دے دے کر اردو فکشن لکھنے والے کو کمزور کر دیا۔ میں نے جب یہ سب کچھ سنا تھا تو مجھے لگا تھا کہ یہ سب کچھ جھوٹ ہے جو ہم سے بولا جا رہا ہے۔ چنانچہ جب میں لکھ رہا تھا تو مجھے لگا کہ فکشن کا مغربی اسلوب میری سوچ سے ہم آہنگ نہیں ہو رہا ہے اور کوئی بات بن نہیں رہی ہے اور یہ کہ مجھے اپنی بات کہنے کے لئے اپنی روایت کی گود میں جانا ہوگا اس کا لب و لہجہ لینا ہوگا۔ اس سلسلے میں میرے بچپن نے اور میرے بچپن کے واقعات نے بھی مجھے بیانیہ کے مانوس لہجے کو اپنانے کی تحریک کی تو اس طرح میں نے اپنے فکشن کی روایت سے فائدہ اٹھایا اور اس سے اکتساب کیا۔

پاکستان میں ابھی کوئی صاحبِ اسلوب نیا افسانہ نگار سامنے نہیں آیا

ہندی کہانی کار اصغر وجاہت کے ایک سوال کے جواب میں کہ پاکستان کے فکشن میں کیا کیا رجحان رہے ہیں اور اب غالب رجحان یا موضوع کیا ہے؟ انتظار حسین نے کہا کہ ایک تو ہمارا گیارہ سال کا عرصہ وہ گزرا ہے جب ہمارے لکھنے والے اس دور کی ذہنی کیفیات کو شعر یا کہانی کے ذریعے بیان کرنے کا جتن کر رہے تھے۔ اس دور میں تجریدی اور علامتی لہجہ حاوی ہے۔ موضوع ظاہر ہے جبر اور اپنی آزادی کے سلب ہو جانے کا تھا۔ اس دور میں موضوعات کا تنوع ممکن بھی نہ تھا میرا خیال ہے کہ پاکستانی ادب میں ابھی

وہ دور ختم نہیں ہوا ہے لیکن بعض نقاد ہمیں بتاتے ہیں کہ پاکستانی افسانہ اس دور سے باہر نکل آیا ہے مجھے قاری کی حیثیت سے کسی ایسے پاکستانی افسانہ نگار کا علم نہیں جس نے کسی نئے اسلوب کی طرح ڈالی ہو اور جس کی کہانی نئی ڈائی مشن کی کہانی کہی جاسکے۔

ایک اور سوال کے جواب میں انتظار حسین نے کہا کہ وہ پاکستانی اور ہندوستانی ادب کی تخصیص کو نہیں مانتے انھوں نے کہا جب لوگ مجھ سے نئے افسانے کی بات کرتے ہیں تو میں خالدہ حسین کے ساتھ سریندر پرکاش کا نام بھی لیتا ہوں اور یہ بھی کہتا ہوں کہ لکھنؤ میں بیٹھے لکھ رہے نیر مسعود کی کہانی علامتی کہانی کے اسلوب کا ایک نقطۂ عروج ہے۔ لیکن جب ہم سماجی یا سیاسی حوالوں سے دونوں ملکوں کے بیانیہ کو دیکھیں تو پھر موضوع کی تخصیص کرنی پڑتی ہے۔ تو ایک سطح پر ان ملکوں کے ادب میں امتیاز ممکن ہے لیکن ایک سطح مماثلت اور مشابہت کی بھی ہے۔

ایک اور سوال کے جواب میں انتظار حسین نے کہا کہ پریم چند والی روایت کو میں افسانے کے لئے اب زیادہ RELEVENT نہیں سمجھتا۔ اس روایت کو اپنا کر کافی کچھ لکھا جاچکا ہے اب تو میری کوشش یہ ہوگی کہ میں اپنی روایت کے ان دیکھے راستوں کی کھوج لگاؤں اُن سمتوں میں سفر کروں جدھر ہمارے قدم اٹھے نہیں ہیں۔ جو ہمارے لئے VIRGIN SOIL ہے۔ یہ تو اصول ہے کہ جب زمین پر بہت زیادہ کھیتی ہو چکی ہو تو اسے کچھ عرصے کے لئے بے جوتے چھوڑ دینا چاہیے۔ پریم چند کی روایت میں ہم نے کافی کھیتی کر لی ہے۔ یا یوں کہیے کہ وہ روایت تو ہمارے پورے تخلیقی سراپے میں حل ہو کے رہ گئی ہے اب اس کو REVIVE کرنے کی کیا ضرورت ہے۔

انتظار حسین نے اس بات سے اتفاق نہیں کیا کہ ادیب کو تبدیلیوں کا ساتھ دینا چاہیے انھوں نے کہا کہ نقاد تو یہی کہتا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جب زمانہ تیزی سے گزر رہا ہے اور تبدیلیوں کی رفتار تیز ہو تو ایسی صورت حال میں ادیب کو لکھنے کی رفتار مدھم کر دینی چاہئے۔ رک کر چاروں طرف ہونے والے واقعات کو دیکھنا اور سمجھنا چاہیے۔ جس طرح آندھی آنے پر آپ رُک جاتے ہیں ٹھہر جاتے ہیں آندھی کے ساتھ بھاگتے نہیں اسی طرح ادیب کو بھی کچھ دیر کے لئے قلم رکھ دینا چاہیے۔ میرے لئے تو ہر تبدیلی حسیت نہیں بنتی مجھے تو جاتک کتھاؤں میں جدید حسیت کی بو باس زیادہ ہی ملتی ہے۔

میں نے حالی سے لے کر ۱۹۶۵ تک جو اردو تنقید رہی ہے اس کے بارے میں یہ کہا تھا کہ وہ ایک ٹانگ پر کھڑی ہے لیکن میرا خیال ہے کہ اب اسے دونوں ٹانگیں مل گئی ہیں۔ خاص طور سے اردو فکشن کی تنقید ہندوستان میں خاصی پروان چڑھی ہے۔ اس سلسلے میں میں وارث علوی شمیم حنفی کا نام لوں گا۔ شمس الرحمن فاروقی کو فکشن کے سلسلے میں کچھ تامل ہے لیکن وہ بھی ان نقادوں کی صف میں ہیں۔

لفظوں کو برتتے ہوئے کبھی مجھے شرمندگی کا احساس نہیں ہوا

ساقی فاروقی

ساقی فاروقی کئی سالوں بعد دلی آئے تھے ۔ بقول ان کے وہ لندن کے غیر اردو ماحول میں رہتے ہوئے اتنے ادب گئے تھے کہ انھیں تازہ ہوا کی ضرورت تھی ۔ سو انھوں نے ہندوستان کا رخ کیا یہاں وہ دلی، علیگڑھ، الٰہ آباد، حیدر آباد، بنگلور، بمبئی ہوتے ہوئے کراچی چلے گئے

دلی میں ساقی نے جب خود کو اردو کے متحرک اور فعّال ادیبوں کے درمیان پایا تو شعر سنانے اور شعروں پر داد پانے کا لالچ بے اختیار ان پر حاوی ہو گیا۔ اور ساقی نے بے حد ڈوب کر اپنے مخصوص ڈرامائی انداز میں اپنی نظمیں، شیخ امداد علی کا مینڈک، ہستانہ ہجڑا، حرم سرا وغیرہ سنائیں ۔ ساقی فاروقی نے نظمیں سنانے کے بعد بے تکلف لہجے میں باتیں کیں ۔ زبیر رضوی اور بلراج کومل نے گفتگو کا آغاز کرتے ساقی کی شاعری اور تنقید پر مختصر اظہار رائے زنی کی ۔ انھوں نے کہا کہ ساقی کے یہاں لفظ کی موسیقی کا احساس اور پھر اسے قاری تک ترسیل کرنے کا عمل بڑا کامیاب ہے ۔ ساقی کے لہجے میں بے باکی بھی ہے اور ایک طرح کی حوصلہ مندی بھی ۔ ساقی کی نظمیں انسان کی مختلف فطرتوں کی طرف بڑا خوبصورت اشارہ ہیں ۔ ان کی تنقید بھی براہ راست لہجے میں بغیر کسی تکلف اور رعایت کے اپنے عہد کے شعری منظر نامے کا محاکمہ کرتی ہے ۔ فیض، راشد اور میراجی کے بارے میں ساقی کی رائے بے حد کھری اور متوازن ہے ان کی رائے نے کچھ نئے گوشے بھی اجاگر کئے ہیں ۔

ساقی نے کہا کہ میں نے ۲۵، ۳۰ برس پہلے جب ادب کی وادی پُر خار میں قدم رکھا تو سر میں سودا یہ تھا کہ الفاظ، احساس اور خیال کے کلشے سے ہٹ کر وہ کہیں گے اور لکھیں گے جو اپنے اندر سے پھوٹے ۔ جو سچ ہو ۔ کیونکہ جھوٹ تو کافی لوگ لکھ رہے تھے ۔ ایسا کرتے ہوئے میں نے نہ ناصح کا منصب سنبھالنا چاہا نہ مصلح قوم کا ۔ الفاظ سے میں نے کوئی جھگڑا نہیں کیا اور انھیں برتتے ہوئے مجھے کبھی شرمندگی کا احساس نہیں ہوا ۔ جہاں تک فیض، راشد اور میراجی کی شاعری کا معاملہ ہے تو میرے نزدیک یہ تینوں اہم شاعر تھے بلکہ یوں کہیے کہ یہ تین جب جب مل گئے ہیں تو یہ کبھی غالب بن گئے ہیں اور کبھی اقبال ۔ ان میں خامیاں بھی ہیں ہیں ۔ مثال کے طور پر فیض کے یہاں ذاتی "منشن" نہیں ہیں ۔ راشد کے یہاں زبان بوجھل ہو گئی ہے اور کبھی کبھی منجمد بھی ۔ میراجی کے یہاں ہندی اور سنسکرت کی طرف جاتے ہوئے یا للچاتے ہوئے کھردراپن آگیا ہے ۔ میراجی نے باہر کی دنیا کی تشخیص تو کی مگر اندر کی دنیا کو باہر کی دنیا سے ہم آہنگ نہیں کیا ۔ اس کے باوجود میں اپنے مقابلے میں ان شاعروں کو پہلی صف میں رکھتا ہوں اور مجھے لگتا ہے کہ آنے والے دنوں میں (ہم تو نہ جانے کس حال میں ہوں) کوئی شاعر ضرور آئے گا جو ان سب کی بوئی ہوئی فصلوں سے فائدہ اٹھائے گا ۔ میرا خیال ہے کہ اگر کچھ بن سکتا ہے تو وہ اس طرح کہ کلشے کے خلاف جنگ جاری رہے ۔ مجھے وہ یونانی کہانی یاد آرہی ہے جو ایک ایسے پیکر کے بارے میں ہے کہ جس کا ایک حصہ عورت کا ہے اور ایک حصہ مرد کا وہ دونوں اتصال کی جدوجہد کرتے ہیں مگر مل نہیں پاتے مگر دس سال میں سمجھئے کہ ایک لمحہ ایسا آتا ہے جب وہ ایک دوسرے میں جسمانی، جذباتی، اور جنسی طور پر مدغم ہو جاتے ہیں اور یہ اتصال انھیں خدا بنا دیتا ہے

ذہن جدید

تو میں یہی کہوں گا کہ ہم میں نقطۂ عروج تک جانے کی لگن ہونی چاہیے اور اس سلسلے میں تجربے کے لئے ہم اپنے پورے وجود کو آمادہ رکھیں اور ہر مشاہدے کے لئے آنکھ کو کھلا رکھیں۔ یہ تجربہ اور مشاہدہ ہی ہے جو آپ کو موضوع کے قریب لاتا ہے اور اسے آپ کی تخلیقی ذہانت کی گود میں لاکر ڈال دیتا ہے۔ ایک اور بات اور وہ ہے مطالعہ۔ میں نے کتابوں کو نقادوں کی طرح نہیں پڑھا اسے اپنے احساس اور وجدان کے حوالے سے پڑھا ہے۔ شمیم حنفی، شمس الرحمن فاروقی نے جو کچھ پڑھا اسے یاد رکھا مگر میں نے پڑھا اور بھلا دیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سارا پڑھا ہوا ہاضمے میں چلا گیا اور اب جو کچھ بھی باہر آتا ہے وہ میرا بن کے باہر آتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ میری نسل کے لوگ ابھی جد وجہد کر رہے ہیں اور ان کا احتساب کرنے کی منزل ابھی نہیں آئی۔ ہاں اختر الایمان، مجید امجد والی نسل اپنا کام کر چکی ہے اس کے کاموں کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ اختر الایمان اب زیادہ تر اپنے آپ کو دہرا رہے ہیں۔ ان کے یہاں چمک اب پہلی سی نہیں۔ نظم میں وہ جو کہہ رہے ہیں وہ ایک طرح نثری بیان ہے۔ ہماری نسل ابھی اچھا برا لکھ رہی ہے۔ لیکن ہم سے پہلے کے لوگ جو کچھ لکھنا تھا لکھ چکے۔ یہ وقت ہے کہ ان کا محاسبہ ہو۔ میں اختر الایمان، مجید امجد، ناصر کاظمی، اور منیر نیازی پر ایک سلسلۂ مضامین شروع کر رہا ہوں اسی انداز میں جس انداز میں میں نے چار شاعروں کا مطالعہ پیش کیا تھا۔ میرے نزدیک شاعری میں احساس اور خیال ثانوی ہیں۔ در اصل لفظ کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ لفظ سے آشنائی نہ ہو تو پھر احساس اور خیال کا اظہار ممکن نہ ہوگا۔ ہاں ایک بات اور وہ یہ کہ لفظ جو بھی ہو وہ آپ کا اپنا ہو تب ہی تو وہ آپ کے شعری احساس اور خیال کو شعر کی صورت دے سکے گا۔ میں احساس و خیال کے اظہار کو لفظ سے الگ کر کے سوچ نہیں سکتا۔

باقی صفحہ ۱۹۲

تعلق رکھنے والے دوستوں نے مجھے لعنت ملامت کی کہ میں نے ایک پولس رپورٹ کو بنیاد بنا کر فلم بنا ڈالی لیکن مجھے پوری طرح اس بات کا احساس تھا میں نے فلم خود احتسابی SELF CRITICISM کے زاویئے سے بنائی تھی۔

اس کے بعد کے دنوں میں میں نے دیکھا کہ بائیں بازو کی حکومت بھی کچھ اچھا نہیں کر سکی۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بہتر موقع ہے کہ ہم اپنے اندر ہونے والے تصادم کو سمجھیں۔ خود اپنے بالوں کو پکڑ کر کھینچیں۔

میری بعد کی فلم ایک دن پرتی دن، جارحیت کی حامل نہ ہو کر اپنے داخل کو کھوجنے والی تھی۔ لیکن یہ بات میں واضح کر دوں کہ جو کچھ بھی میں نے ماضی میں کیا ہے میں اس پر شرمندہ نہیں ہوں۔ میں آج جو کچھ بھی ہوں وہ میرے ماضی کا ایک منطقی تسلسل ہے۔ جب میں یہ کہتا ہوں کہ آج میں زیادہ خود اعترافی کی حالت میں ہوں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں اپنی سابقہ خارجی جارحیت پر پشیمان ہوں یا اسے رد کر رہا ہوں۔

● آپ کون سی نئی فلمیں بنا رہے ہیں؟

میں اپنی نئی فلموں کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ممکن ہے میں کوئی عشقیہ فلم بناؤں یا پھر وہ فلم ABSURD بھی ہو سکتی ہے۔ جہاں فنتاسی اور حقیقت کو پہچاننا مشکل ہو جاتا ہے۔ میں غیر رواداری نفرت اور تباہی کے اس دور میں انسانی دردمندی کی بات کرنا چاہتا ہوں اور شاید یہی میری کسی آئندہ فلم کا کلیدی موضوع بھی بن جائے۔

ترسیل

شمارہ نمبر ۶ کے تمام تر مشمولات پر رائے کا اظہار کرنے کے لیے ایک دفتر درکار ہے۔ میں صرف اس میں شامل کہانیوں کا مختصر سا تجزیہ کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔

اردو کی چار کہانیوں میں سے بانو قدسیہ کی کہانی، شناخت، ہی اول نمبر پر آتی ہے۔ مواد اور تکنک دونوں لحاظ سے کمی کمین کی زندگی کی ذلالت کا المیہ اور اس المیہ کی تہہ میں اپنی، شناخت کے لیے سرسراتی بے چینی ایک طرف اور اپنی شناخت، کی کھوج میں بے حال ہوئے باعلم پروفیسر اور زمیندار کے بگڑے ہوئے بیٹے کا المیہ دوسری طرف۔ موضوع وسیع ہے اور مفہوم وسیع تر CULTURE MADE MEN کو رد کرنے اور کلچر کو محض ایک بدرنگ اور بوسیدا ہوتے چلے جانے والے لباس کا نام دینے والی یہ کہانی ہمیں انسان کی اصلی شناخت قایم کرنے والی اعلےٰ اقدار اور ان اقدار پر عمل کے لیے پکار سے جس طرح واقف کراتی ہے وہ ہر لحاظ سے قابل توصیف ہے۔ ایک سفلہ کردار کے قلب ماہیئت کے تناظر میں لکھی گئی زبان و بیان کے لحاظ سے پختہ یہ کہانی قاری کو لگاتار متاثر کرتی جاتی ہے۔ غلام جیلانی کی واکھڑے ہوئے لوگ، زبردستی جلاوطن کئے گئے لوگوں کے خوف ہراس، بے بسی، لاچاری کو اندوہناک المیے کا روپ دینے میں کامیاب ہے۔

سریندر پرکاش کی، انعام گھر کی تسخیر، کہانی کار کی صلاحیت کی ناکامی کا المیہ ہے۔ نہ کہانی پرکھو نسا ہوا آغاز متاثر کرتا ہے نہ ایک اوچھی سی اخباری خبر جیسا اختتام، درمیان کا حصہ بھی محض کاوش ہے۔ آج افسانہ بے لحاظ زبان اور بے دریغ بیان مانگتا ہے۔ اڑن کھٹولے میں بیٹھ کر دیومالائی انداز میں زمان و مکان کو عبور کرنے کی بات بہت ہو چکی۔ اس تناظر میں یہ کہانی بس غنیمت ہے۔

انور قمر واقعی گردش زدہ ہیں۔

ہندی کہانی، بند آدمی، ایک نخیز خیز نجر بہ ہے۔ مرکزی کردار اپنی بیوی کے کردار پر شک کو اپنے گرد جس کی طرح بُن کر اُس میں محصور ہو جاتا ہے۔

ڈوگری کہانی ویدراہی نے لکھی ہے۔ فینتسی ہوتے ہوئے بھی کہانی کی جڑیں تنگی حقیقت میں پیوست ہیں۔ کیا المیہ ہے کہ اانسان کی کھینچی ہوئی ارضی لکیر، بن خود انسانوں کو نہ زندگی میں ایک دوسرے سے ملنے دیتی ہیں نہ مرنے کے بعد ان کی روحوں کو ایک دوسرے کے ساتھ اکٹھا رہنے کی اجازت دیتی ہیں۔ ارضی تفریق و تقسیم پر یہ کہانی اپنی غنائیت کے بل پر اپنا لوہا منواتی ہے۔

کنورسین۔ دلی

آپ کا خط ملا۔ اس کے فوراً بعد ذہن جدید کا ۵/ واں شمارہ بھی مل گیا۔ اس سے قبل میں یہ شمارہ دیکھ چکا تھا جو کہ لکھنؤ سے محسن خاں صاحب نے اس پرچے سے میری دلچسپی دیکھ کر بھجوایا تھا۔ افسانے اور غزل پر تنقیدی مباحث، اور ادبی مواد تو اپنی جگہ اہم ہوتا ہی ہے، اور اس کی

فراہمی آپ کی محنت اور سلیقہ سے عبارت ہے۔ لیکن فنونِ لطیفہ اور حالاتِ حاضرہ پر جو مضامین ہوتے ہیں، ہم تو ان کو پڑھکر حیران ہوتے ہیں۔ آپ کا رسالہ واحد رسالہ ہے جو صحیح معنوں میں آرٹ اور کلچر کی نمائندگی بھی کر رہا ہے۔

مضامین پسند آگئے تو میری محنت وصول ہو گئی۔ میں نے دونوں میں سے کوئی بھی مضمون کہیں اور نہیں بھیجا ہے۔ ذہن جدید میں چھپنے کو میں زیادہ ترجیح دوں گا۔

ڈاکٹر آصف فرخی

ذہن جدید مل گیا۔ منظوم حصے کو چھوڑ کر حسب معمول پرچہ بہت ہی اچھا ہے

محمد علوی۔ احمد آباد

عصمت چغتائی کی تصویر کے ساتھ گوشہ متنوع ہے۔ نظمیں اور غزلیں دل کو چھو نہیں پائیں، خواب باقی ہیں، کے حصے شائع کرنے کے ساتھ ساتھ اس پر تبصرہ بھی ہوتا تو بہتر تھا۔

صفدر امام نقوی۔ پٹنہ

عصمت پر گوشہ خوب ہے۔ زندہ قلم کاروں پر بھی توجہ دیجئے کہ نظر انداز کیے جانے والے اچھے اور سچے فنکار بھی موجود ہیں۔

اختر راہی۔ ممبرا تھانہ

ذہن جدید نے اب پنجاب کی تسخیر بھی شروع کر دی ہے۔ میں اس کے مداحوں میں ہوں کہ اس کا دامن بے حد وسیع ہے۔ مجھے یہ پڑھ کر خوشی ہوتی ہے کہ یہ واحد پرچہ ہے جس کا زرِ سالانہ دینے کے لیے ہر ادیب از خود آمادہ نظر آ رہا ہے۔ اسے بہر صورت زندہ رکھنا۔

کرشن ادیب۔ لدھیانہ

ایک سال پہلے آپ کو امریکہ آنے کی دعوت دی تھی جو پوری نا ہو سکی۔ جب میرے بڑے بھائی یہاں آئے تو میرے دوسرے بھائی عزیز قیسی نے ڈھیر سارے ادبی رسالے بھیج دیئے۔ آپ کا رسالہ دیکھ کر جی خوش ہو گیا لگتا ہے آپ نے یہ رسالہ ہم جیسے غریب الوطنوں کے لیے ہی نکالا ہے جن کی اپنی زبانیں دوسری زبانوں کے ساتھ ایسی گھل مل گئی ہیں کہ وہ بذاتِ خود ایک زبان بن گئی ہے۔ آپ نے ادب کے ہر شعبہ کے ساتھ رواداری اور انصاف برتنے کی کوشش کی ہے جو موجودہ دور کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔

احمد خاں۔ امریکہ

اس بار ذہن جدید میں وارث علوی کا مضمون، جتن داس کا انٹرویو، فلسطینی نظمیں، اکنڈیرا کا انٹرویو، پسند آئے۔ کافی دنوں بعد ندا فاضلی کی غزلیں اچھی لگیں۔ سریندر پرکاش کی کہانی اچھی ہے لیکن سکندر کے گنتی سپاہی اور اسی طرح کی دوسری چیزوں نے افسانے کو الجھا دیا۔ ان جوڑوں کے بغیر کہانی یقیناً اور دلچسپ اور متاثر کن ہوتی۔ اس بار تبصروں کا کالم تمام تر انگریزی میں شایع ہونے والی کتب پر ہے، یہ کامپلیکس سمجھ میں نہیں آیا۔ انگریزی میں اوسط درجے کی کتابیں آئے دن شایع ہوتی رہتی ہیں جب وہ ہندوستان میں چھپتی ہیں تو ظاہر ہے ان پر انگریزی میں تبصرے چھپتے ہیں آپ کو اردو کی اچھی کتابیں تو پسند نہیں آتیں۔ انگریزی سے یہ مرعوبیت کیوں؟

انور خاں۔ بمبئی

ہم قلم :

آصف فرخی : ہم عصر فکشن پر تھوڑا اور جم کر لکھیں تو اچھا ہے ۔ کراچی میں مقیم

وارث علوی : انھوں نے اپنے ایک حالیہ توسیعی خطبے میں منٹو، بیدی، عصمت اور کرشن کا تقابلی مطالعہ کیا۔ احمد آباد میں مقیم

ضمیر علی بدایونی : قمر جمیل نے اپنے رسالے "دریافت" کے لئے ان سے اچھے مضامین لکھوائے ہیں ۔ کراچی میں مقیم

شافع قدوائی : علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ صحافت سے وابستہ ہیں ۔

مسعود اشعر : لمبے اصرار کے بعد ان کی کہانی ملی ہے ۔ روزنامہ "امروز" چھوڑ چکے ہیں ۔ لاہور میں مقیم

رتن سنگھ : شام افسانہ کو مشاعرے کا نعم البدل بنانے کی کوششیں کرتے رہتے ہیں ۔ جبل پور میں مقیم

کنور سین : ان کا خیال ہے ہم صرف افسانہ چھاپیں کہ شاعری اچھی نہیں ہو رہی ۔ دلّی میں مقیم

انور خاں : اپنے ہم عصروں میں خاصے متحرّک اور فعّال کہانی کار ہیں ۔ بمبئی میں مقیم

مرزا حامد بیگ : ان کے افسانوں کا تازہ مجموعہ "گناہ کی مزدوری" ہمیں ابھی ملا ہے ۔ اسلام آباد میں مقیم

علی امام نقوی : بمبئی شہر ان کے افسانوں میں کئی روپ میں ملتا ہے ۔ بمبئی میں مقیم

حسین الحق : "بولو مت چپ رہو" ان کا تازہ ناول ہے جو گفتگو کا موضوع نہیں بن سکا ۔ بودھ گیا میں مقیم

شموئل احمد : ان کا افسانہ "جنس" کو موضوع بنانے میں خاصا بیباک ہے ۔ رام گڑھ ہزاری باغ میں مقیم

اختر یوسف : ان کے اس افسانے کو شریک کرنے میں ہمیں تھوڑا تامل تھا ۔ رانچی میں مقیم

خورشید اکرم : افسانہ لکھتے کم ہیں، پڑھتے زیادہ ہیں ۔ "آجکل" کے نائب مدیر

سہیل وحید : یہ لوگوں کا محاسبہ اور محاکمہ کرنے میں خاصے پُر جوش ہیں ۔ پٹنہ میں "نو بھارت ٹائمز" میں ہیں

دیوندر اسّر : ترسیل ان کا محبوب موضوع ہے ۔ ہماری فرمائش پوری کر ہی دیتے ہیں ۔ دلّی میں مقیم

بمل کرشن اشک : ان کی نظمیں ہمیں ابن النصیر چودھری (الہ آباد) نے اپنی نظموں کے ساتھ بھجوائی ہیں ۔

حمید الماس : ان پر عوض سعید نے خاکہ بھجوایا تھا جو ہمیں اچھا نہیں لگا ۔ بنگلور میں مقیم

مصحف اقبال توصیفی : یہ مرحوم شاذ تمکنت کے شیدائیوں میں ہیں ۔ حیدر آباد میں مقیم

ابراہیم اشک : جب مہربان ہوتے ہیں تو خوب خط لکھتے ہیں ۔ بمبئی میں مقیم

عبدالاحد ساز : اپنے پہلے ہی شعری مجموعے سے مطمئن ہو جانے کا خطرہ ہے ۔ بمبئی میں مقیم

شبیر احمد قرار : ان کا کہنا ہے کہ ہم بس اپنی مرضی اور معیار کی چیزیں ہی شائع کریں ۔ بمبئی میں مقیم

نظام ہاتف : مراد آباد میں ریلوے میں ملازم ہیں ۔ کم لکھتے ہیں

انور ندیم : ان کی باتوں میں حلاوت ہوتی ہے ۔ لکھنؤ میں مقیم

فصیح اکمل : اپنے کلام کے سلسلے میں بہت جذباتی ہیں ۔ بمبئی میں مقیم

بلقیس ظفیر الحسن : رسالوں میں ان کا کلام اور خطوط مساوی ملیں گے ۔ دلّی میں مقیم

ذاکرہ شبنم : شاید شعر کہنا شروع ہی کیا تھا کہ شادی کر لی یا کر دی گئی ۔ مبارکباد ۔ رابرٹ سن پیٹھ میں مقیم

فاروق شفق : اپنے خطوں میں ہمیشہ معروف ملتے ہیں ۔ کلکتہ میں مقیم

ہماری خدمات کا معیار بے مثال ہے

آپ کا اپنا بینک



بمبئی مرکنٹائل کوآپریٹیو بینک لمیٹڈ

شیڈولڈ بینک

- نصف صدی سے بڑی ذمہ داری کے ساتھ ملک و ملت کی خدمت انجام دے رہا ہے۔
- ہمارا بینک آپ کی ترقی کا ضامن ہے۔
- ہم بغیر کسی فرق و امتیاز کے آپ کی خدمت کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔
- بینک میں فارن ایکسچینج سے متعلق سبھی سہولیات دستیاب ہیں۔
- ہمارے کھاتہ دار ہی ہمارا سب سے بڑا سرمایہ ہیں۔

ہیڈ آفس	فارن ایکسچینج ڈپارٹمنٹ	دہلی آفس
۷۸، محمد علی روڈ، بمبئی ۴۰۰۰۰۳	۳۶ ۔ نیتاجی سبھاش مارگ ۔ دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲	۳۶۵۵ نیتاجی سبھاش مارگ دہلی، ۱۱۰۰۰۲
☎ 3425961 3432498	☎ 3266849, 3264374, 3268266 — 31- 66823 ZAIN - IN	☎ 3271395

چیئرمین: غلام غوث	مینیجنگ ڈائرکٹر: جعفری بھرانی	ڈپٹی مینیجنگ ڈائرکٹر: شمیم کاظم

ذہن جدید

سہ ماہی ذہن جدید



سعادت حسن منٹو

پیدائش ۰ ۱۱ر مئی ۱۹۱۲ء ——— وفات ۰ ۱۸ر جنوری ۱۹۵۵ء

یہ بھی ہوسکتا ہے کہ سعادت حسن مرجائے اور منٹو نہ مرے